بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

دیارِ مغرب کے مسلمان

مسائل - ذمہ داریاں - لائحہ عمل

حضرت مولانا ابوعمار زاہد الراشدی

جملہ حقوق بحق مصنف محفوظ ہیں

عنوان : دیارِ مغرب کے مسلمان: مسائل، ذمہ داریاں، لائحۂ عمل
تالیف : مولانا ابو عمار زاہد الراشدی
مرتب : محمد عمار خان ناصر
مجموعہ : ۲۰۰۸ء
ناشر :
اشاعت :

فہرست

☆ دیباچہ...5

غیر اسلامی معاشرے میں مذہب اور مذہبی اقدار کا تحفظ

☆ مغربی ممالک میں مسلمانوں کی نئی نسل کا مستقبل اور مسلم دانشوروں کی ذمہ داری..........12
☆ امریکہ کا لکڑ ہضم، پتھر ہضم معاشرہ اور مسلمانوں کی نئی پود کا مستقبل......................18
☆ امریکہ میں مقیم مسلمانوں سے چند گزارشات.......................................24
☆ مغرب میں مقیم مسلمانوں کے لیے دینی لائحہ عمل..................................30
☆ برطانوی مسلمان اور مسٹر ڈیوڈ کیمرون کے خیالات..................................34
☆ مسلم پرسنل لا اور موجودہ عالمی صورت حال...39
☆ جبری شادیاں اور برطانیہ کی مسلم کمیونٹی...47
☆ شرعی قوانین اور برطانیہ کا قانونی نظام...51

مساجد و مدارس اور دینی تعلیم کا نظام

☆ برطانیہ میں مسلم فرقہ واریت کے اثرات..56
☆ مغربی ممالک میں مسلمان بچوں کی دینی تعلیم.......................................60
☆ برطانیہ میں مساجد کا نظام: چند اصلاح طلب پہلو...................................66
☆ مغربی معاشرہ میں دینی تعلیم..71
☆ دینی مدارس کا تعلیمی نصاب اور چند ناگزیر جدید تقاضے...........................85
☆ بچیوں کی تعلیم اور نصاب تعلیم...90

علماء اور اہلِ فکر و دانش کی ذمہ داریاں

☆ عالمِ اسلام پر مغربی فکر کی یلغار اور علماء کرام کی ذمہ داری........98
☆ اسلامی نظام، انسانی حقوق اور قادیانیت........106
☆ سوشل گلوبلائزیشن کا ایجنڈا اور علماء کی ذمہ داریاں........124
☆ عصر حاضر کے چیلنج اور علماء کی ذمہ داریاں........128
☆ فکری بیداری کے مختلف دائرے اور ہماری ذمہ داری........133
☆ پاکستان میں نفاذ شریعت کی جدوجہد اور مغربی ممالک میں مقیم مسلمانوں کی ذمہ داریاں .138
☆ انسانی حقوق کا چارٹر اور مسلمانوں کے تحفظات........146
☆ مغربی معاشرے میں دعوت و مکالمہ کے امکانات........152
☆ دور جدید کے فکری تقاضے اور علماء کرام........155
☆ اصلاح معاشرہ اور مسلمانوں کی ذمہ داری........162
☆ مسلمانوں کے باہمی اختلافات ایک نومسلم کے تاثرات........166

غیر مسلم ممالک کے مسلمان باشندوں کے لیے شہری حقوق و فرائض کی نوعیت

☆ "اسلام اور شہری حقوق و فرائض" غیر مسلم معاشرے کے تناظر میں........172
☆ سانحہ گیارہ ستمبر اور مسلمانوں کے لیے لائحہ عمل........197

مسلم ممالک کے ساتھ تعلقات کی نوعیت

☆ مغربی ممالک کی پالیسیاں اور مسلمانوں کا ردعمل........206
☆ مسلم ممالک کی تعلیمی و رفاہی ضروریات........211

بسم اللہ الرحمن الرحیم

دیباچہ

نحمدہ تبارک وتعالیٰ ونصلی ونسلم علیٰ رسولہ الکریم وعلیٰ آلہ واصحابہ واتباعہ اجمعین۔

برطانیہ کا پہلا سفر میں نے ۱۹۸۵ء میں اور امریکہ کا پہلا سفر ۱۹۸۷ء میں کیا تھا۔ دونوں ممالک کے اس سفر کا ابتدائی داعیہ ’’قادیانی مسئلہ‘‘ تھا۔ ۱۹۸۴ء میں صدر جنرل محمد ضیاء الحق مرحوم نے صدارتی آرڈیننس کے ذریعے پاکستان میں اسلام کے نام پر اور مسلمانوں کی اصطلاحات کے ساتھ اپنی سرگرمیاں جاری رکھنے سے قادیانیوں کو روک دیا اور ان کے لیے اسلام کا نام اور مسلمانوں کے مذہبی شعائر واصطلاحات کے استعمال کو قانوناً جرم قرار دے دیا تو قادیانیوں نے اپنی سرگرمیوں کا مرکز لندن کو بنا لیا اور وہاں ’’اسلام آباد‘‘ کے نام سے نیا مرکز بنا کر اپنی سرگرمیوں کو اسلام کے نام پر ہی جاری رکھنے کا اعلان کر دیا۔

اس سے پہلے قادیانیوں کا سالانہ جلسہ ربوہ (چناب نگر) میں ہوتا تھا اور اس کے مقابلے میں مجلس تحفظ ختم نبوت کے زیر اہتمام مسلمانوں کی سالانہ ختم نبوت کانفرنس چنیوٹ میں ہوا کرتی تھی جس سے تمام مکاتب فکر کے سرکردہ علماء کرام خطاب کرتے تھے۔ ۱۹۸۵ء میں قادیانیوں نے سالانہ جلسہ لندن میں منعقد کرنے کا اعلان کیا تو بعض علماء کرام کو خیال ہوا کہ اس موقع پر مسلمانوں کی سالانہ ختم نبوت کانفرنس بھی لندن میں ہونی چاہیے۔ چنانچہ حضرت مولانا عبد الحفیظ مکی، حضرت مولانا منظور احمد چنیوٹی، حضرت علامہ ڈاکٹر خالد محمود اور حضرت مولانا محمد ضیاء القاسمی نے انٹرنیشنل ختم نبوت مشن کے نام سے ایک فورم قائم کر کے لندن میں ختم نبوت کانفرنس منعقد کرنے کا فیصلہ کیا اور اس کی تیاریاں شروع کر دیں۔

میں ایک دن اپنے ایک کام کے لیے لاہور شیرانوالہ گیٹ گیا تو وہاں یہ حضرات اس سلسلے میں صلاح مشورہ کر رہے تھے۔ مجھے دیکھ کر مولانا محمد ضیاء القاسمیؒ نے کہا کہ اچھا ہوا، تم بھی آ گئے ہو۔ ہم یہ مشورہ کر رہے ہیں اور چونکہ تم لکھنے پڑھنے کا کام اچھی طرح کر لیتے ہو اور وہاں تمھاری ضرورت بھی پڑے گی، اس لیے تم بھی ہمارے ساتھ چلو۔ اس زمانے میں برطانیہ کے لیے ویزے کی ضرورت نہیں ہوتی تھی، صرف پاکستانی پاسپورٹ سفر کے لیے کافی ہوتا تھا اور لندن ایئرپورٹ پر مختصر انٹرویو کے بعد ویزا لگ جایا کرتا تھا۔ یہ حضرات جس تاریخ کو کانفرنس منعقد کرنے کا مشورہ کر رہے تھے، اس کے دو تین ہفتے بعد حج کا موقع آ رہا تھا، اس لیے میں نے کہا کہ اگر واپسی پر حج کی سہولت مل جائے تو میں ساتھ چلنے کو تیار ہوں۔ انھوں نے کہا کہ ہمارا پروگرام بھی یہی ہے، اس لیے تم تیاری کرو۔ چنانچہ ہم نے پروگرام بنا لیا اور لندن کے لیے پہلا سفر میں نے حضرت مولانا منظور احمد چنیوٹی اور حضرت مولانا محمد ضیاء القاسمی کی رفاقت میں ترکش ایئر لائنز سے کیا۔ راستے میں ہم ایک روز استنبول ٹھہرے اور لندن پہنچ کر ہم نے ختم نبوت کانفرنس کے لیے مختلف شہروں کا دورہ کیا۔ جمعیۃ علماء برطانیہ نے اس سلسلے میں بھرپور تعاون کیا اور انٹرنیشنل ختم نبوت مشن کے زیر اہتمام لندن کے ویمبلے کانفرنس سنٹر میں اگست ۱۹۸۵ء کے دوران عظیم الشان ختم نبوت کانفرنس منعقد ہوئی۔ بعد میں یہ انٹرنیشنل ختم نبوت مشن، مجلس تحفظ ختم نبوت پاکستان میں ضم ہو گیا اور دونوں کے اشتراک سے عالمی مجلس تحفظ ختم نبوت تشکیل پائی، مگر معاملات زیادہ دیر تک اکٹھے نہ چل سکے تو انٹرنیشنل ختم نبوت مشن کے حضرات نے عالمی مجلس تحفظ ختم نبوت سے الگ ہو کر انٹرنیشنل ختم نبوت موومنٹ کے نام سے ایک نئی جماعت قائم کی جو اب تک مسلسل کام کر رہی ہے۔

میں ابتدا میں انٹرنیشنل ختم نبوت مشن کے ساتھ تھا اور اس کے لیے کام کرتا رہا، مگر مجلس تحفظ ختم نبوت میں اس کا انضمام میری سمجھ سے بالاتر تھا اور میرے ذہن میں نقشہ یہ تھا کہ مجلس تحفظ ختم نبوت حسب معمول پاکستان میں کام کرتی رہے، جبکہ عالمی سطح پر یہ کام انٹرنیشنل ختم نبوت مشن کے فورم سے ہو اور دونوں آپس میں تعاون کا کوئی طریق کار طے کر لیں۔ میرے خیال میں ان دونوں کا آپس میں ایک جماعت کے طور پر کام کرنے کا پروگرام قابل عمل نہیں تھا، اس لیے میں نے کنارہ کشی میں عافیت سمجھی، اسی لیے جب دوبارہ علیحدگی کے بعد انٹرنیشنل ختم نبوت موومنٹ کا قیام عمل میں لایا گیا تو حضرت

مولانا عبدالحفیظ مکی مدظلہ اور حضرت مولانا منظور احمد چنیوٹی رحمہ اللہ تعالیٰ کے بار بار اصرار کے باوجود میں نے اس کے نظم کا حصہ بننے سے معذرت کر لی اور اب میری پوزیشن یہ ہے کہ تحفظ ختم نبوت کے مشن اور کاز کے لیے دونوں کا خادم ہوں اور ہر ممکن تعاون کی کوشش کرتا ہوں، مگر نظم میں کسی کا حصہ نہیں ہوں۔

بہرحال یہ پس منظر ہے میرے برطانیہ کے پہلے سفر کا جس کے بعد کم وبیش ہر سال برطانیہ جانے، ختم نبوت کانفرنس میں شریک ہونے اور اس کے لیے کچھ نہ کچھ خدمت سرانجام دینے کا معمول بن گیا جو ایک عرصہ تک جاری رہا کہ موسم گرما کے دو تین ماہ کے لیے میں برطانیہ چلا جاتا تھا، البتہ مدرسہ نصرۃ العلوم میں اسباق کی باقاعدہ ذمہ داری قبول کرنے کے بعد سے یہ معمول تبدیل ہو گیا ہے۔ اب صرف ششماہی امتحان کی تعطیلات کے دوران دو اڑھائی ہفتے کے لیے برطانیہ جانے کا موقع مل جاتا ہے جبکہ سالانہ ختم نبوت کانفرنس میں شرکت اسی وجہ سے کئی برسوں سے نہیں ہو رہی۔

امریکہ کے پہلے سفر کا پس منظر بھی یہی تھا کہ ۱۹۸۷ء میں امریکی سینٹ کی خارجہ تعلقات کمیٹی نے پاکستان کے لیے امداد کی بحالی کی شرائط میں قادیانیوں کو غیر مسلم قرار دینے کے دستوری فیصلے اور انھیں اسلام کے نام پر سرگرمیاں جاری رکھنے سے روکنے کے لیے صدارتی آرڈیننس کو واپس لینے کی شرط بھی شامل کر دی اور قومی سطح پر قادیانی مسئلہ کے سلسلے میں عالمی دباؤ ایک نئی صورت اختیار کر گیا۔ اس پر حضرت مولانا میاں محمد اجمل قادری زید مجدہم نے ایک روز مجھ سے کہا کہ اگر ہم دونوں امریکہ کا سفر کریں اور قادیانیت کے سلسلے میں وہاں اپنے موقف کی وضاحت کے لیے محنت کریں تو یہ بہت مفید رہے گا۔ حضرت میاں صاحب کو اللہ تعالیٰ نے انگلش میں گفتگو کی اچھی صلاحیت سے نوازا ہے اور قادیانی مسئلہ کے مالہ وماعلیہ سے بحمد اللہ تعالیٰ مجھے کچھ نہ کچھ واقفیت حاصل ہے، اس لیے مجھے یہ جوڑ اچھا لگا اور میں نے آمادگی کا اظہار کر دیا۔ حضرت میاں صاحب نے ہی ویزا لگوایا اور سفر کے اخراجات برداشت کیے، لیکن جب ہم امریکہ پہنچے تو اس مشن کے لیے کوئی منظم کام نہ کر سکے اور مکی مسجد بروک لین نیویارک میں کم وبیش ایک ہفتہ تک قادیانیت کے موضوع پر میرے روزانہ دروس کے علاوہ اس عنوان پر اور کچھ نہ کیا جا سکا، لیکن ویزا چونکہ پانچ سال کا لگ چکا تھا، اس لیے موسم گرما میں برطانیہ آمد کے موقع پر میرا کچھ دنوں کے لیے امریکہ حاضر ہونے کا معمول بھی بن گیا جو اب تک کسی نہ کسی طور پر

جاری ہے۔

برطانیہ اور امریکہ کے لیے میرے اسفار کا آغاز قادیانی مسئلہ کے حوالے سے ہوا تھا اور کئی برس تک سرگرمیوں کا محور یہی مسئلہ رہا، مگر وہاں کے حالات، مسلمانوں کے مسائل ومشکلات اور مسلمانوں اور مغرب کی فکری وثقافتی کشمکش کے تناظر میں مشاہدات ومحسوسات اور تاثرات کا دائرہ دن بدن وسیع ہوتا رہا اور ملت اسلامیہ کے دیگر مسائل ومعاملات بھی تگ وتاز کے اہداف میں شامل ہوتے گئے، حتیٰ کہ گزشتہ صدی کے آخری عشرہ کے آغاز میں جب لندن میں حضرت مولانا محمد عیسیٰ منصوری زید مجدہم کی رفاقت سے ورلڈ اسلامک فورم کے قیام کا فیصلہ کیا تو جدوجہد اور سعی ومحنت کے مقاصد کا افق اور زیادہ وسعت اختیار کر گیا۔

حضرت مولانا محمد عیسیٰ منصوری کے ساتھ ملاقات اور رفاقت کا معاملہ بھی اچانک اور اتفاقاً ہوا۔ ہمارا پہلے سے کوئی باہمی تعارف نہیں تھا۔ میں ان دونوں اپٹن پارک میں سیلون روڈ کے اسلامک سنٹر میں ٹھہرا ہوا تھا۔ آل گیٹ کے علاقے میں سیرت النبی صلی اللہ علیہ وسلم پر ایک جلسہ تھا جس میں مولانا منصوری اور راقم الحروف نے خطاب کیا۔ ہم دونوں نے پہلی بار ایک دوسرے کو دیکھا اور سنا اور دونوں کا ابتدائی تاثر یہ تھا کہ ہم ایک دوسرے کے کام کے آدمی ہیں۔ جلسہ کے اختتام پر میں نے مولانا منصوری کو اپنی قیام گاہ پر آنے کی دعوت دی۔ اگلے روز وہ تشریف لائے۔ کوئی گھنٹہ بھر مختلف مسائل پر گفتگو ہوئی اور ہم نے باہمی رفاقت کا رشتہ استوار کر لیا۔ اس کے بعد ورلڈ اسلامک فورم تشکیل پایا اور ہمارے ساتھ اور بھی دوست شامل ہوتے چلے گئے۔

امریکہ اور برطانیہ کے علاوہ مجھے ایک موقع پر کینیڈا جانے کا بھی موقع ملا اور کچھ دن میں نے وہاں گزارے۔ اس کے علاوہ مغربی ممالک میں سے کسی اور ملک میں جانے کا اب تک اتفاق نہیں ہوا اور کئی بار خواہش اور ارادے کے باوجود کسی اور مغربی ملک میں حاضری کی کوئی صورت نہیں بنی، البتہ ان تین مغربی ممالک میں گزشتہ تیئس سال کے دوران سینکڑوں اجتماعات سے خطاب، بیسیوں تعلیمی اداروں کے ساتھ مشاورت اور ہزاروں افراد سے ملاقاتوں کا موقع ملا اور مختلف حوالوں سے میں اپنے تاثرات ومشاہدات کو قلم بند بھی کرتا رہا جو متعدّد جرائد واخبارات میں شائع ہوتے رہے۔ ان مضامین اور خطابات کا ایک منتخب مجموعہ عزیزم حافظ محمد عمار خان ناصر سلمہ نے زیر نظر کتاب کی صورت میں

مرتب کر دیا ہے جو قارئین کے سامنے ہے۔

یہ مضامین و خطابات کسی ایک موضوع پر مرتب و مربوط انداز میں خیالات کی ترجمانی نہیں کرتے، بلکہ مغربی ممالک میں مقیم مسلمانوں کو درپیش مختلف النوع مسائل و مشکلات اور مغرب کے حوالے سے عالم اسلام کو درپیش چیلنجز کے بارے میں مختلف مواقع اور مقامات پر کی گئی گفتگو اور تحریر کیے گئے تاثرات و احساسات کا مجموعہ ہیں، اس لیے قارئین سے درخواست ہے کہ انھیں اسی پس منظر میں دیکھا جائے اور ان کے اصل پیغام کو سمجھنے کی کوشش کی جائے۔

اللہ تعالیٰ ہماری اس سعی کو قبولیت سے نوازیں اور دین وملت کے لیے کسی نہ کسی انداز میں مثبت اور موثر خدمت کا سلسلہ آخر دم تک جاری رکھنے کی توفیق عطا فرمائیں۔ آمین یارب العالمین۔

ابو عمار زاہد الراشدی
(ڈائریکٹر الشریعہ اکادمی گوجرانوالہ)
۲۰/ جون ۲۰۰۸ء

غیر اسلامی معاشرے میں
مذہب اور مذہبی اقدار کا تحفظ

مغربی ممالک میں مسلمانوں کی نئی نسل کا مستقبل اور مسلم دانشوروں کی ذمہ داری

پاکستان کے ممتاز ماہر تعلیم اور یونیورسٹی گرانٹس کمیشن کے چیئرمین پروفیسر پری شان خٹک نے گزشتہ دنوں لندن کے جنگ فورم میں اظہار خیال کرتے ہوئے برطانیہ میں مقیم پاکستانیوں کی نئی نسل کے بارے میں کہا تھا کہ:

> ''مجھے یہاں کی نئی نسل سے مل کر بڑی مایوسی ہوئی، اس کی وجہ شاید یہ ہے کہ مجھے یہاں ان کی بگڑتی ہوئی مشرقی روایات کو دیکھنے کے کچھ تلخ تجربے ہوئے ہیں۔ نوٹنگھم میں میرے ایک عزیز نے اپنے بچے سے میرا تعارف کرایا تو اس نے بڑے اکھڑے انداز میں کہا: ''ہیلو پری شان''۔ اسی طرح ایک اور دوست کے بیٹے نے کہا: ''ہیلو پروفیسر''، ''ہووو پروفیسر''۔ ایسے اور بہت سے واقعات سے میں سوچنے پر مجبور ہو گیا کہ جو نسل اپنے سے بڑوں کو چچا، ماموں یا ہیلو انکل کہنے کے آداب بھول رہی ہے جو کہ ہماری مشرقی روایات کی بنیاد ہے تو اس نسل سے اپنے سے اور اپنے وطن سے جڑا رہنے کی توقع کیسے کر سکتے ہیں؟ یہاں میں جتنا عرصہ بھی رہتا ہوں، میرے کان ''ہیلو انکل'' سننے کو ترس جاتے ہیں''۔
> (روزنامہ جنگ لندن، ۳ ستمبر ۱۹۹۲ء)

نئی نسل کے بارے میں اس قسم کے خیالات کا اظہار اکثر ہماری مجالس میں ہوتا رہتا ہے اور ہمیں یہ شکایت رہتی ہے کہ مغربی ممالک میں مقیم ہماری نئی نسل مشرقی روایات، اسلامی اقدار اور پاکستانی تہذیب سے بے گانہ ہوتی جا رہی ہے۔ شکوہ بجا مگر سوچنے کی بات یہ ہے کہ اس میں نئی نسل کا قصور کیا ہے؟ اور اسے کوسنے میں ہم کس حد تک حق بجانب ہیں؟ اصل ضرورت اس امر کی ہے کہ اس صورت حال کا ٹھنڈے دل و دماغ کے ساتھ جائزہ لیا جائے اور اس کے اسباب کا تجزیہ کیا جائے، مستقبل کی ضروریات کی نشان دہی کی جائے اور پھر نئی نسل کو اس رخ پر لانے کے لیے جسے ہم ضروری

سمجھتے ہیں، منظم منصوبہ بندی کی جائے۔

ہمارا المیہ یہ ہے کہ محدود سوچ کو ذہن میں رکھ کر اس کے مطابق ایک رخ پر چل پڑتے ہیں اور جب اس سوچ کا دائرہ ختم ہونے پر اس سے آگے کا ماحول اجنبی نظر آنے لگتا ہے تو ذہنی الجھن کا شکار ہو جاتے ہیں اور کسی نہ کسی کو شکوہ و شکایت کا ہدف بنا کر نفسیاتی تسکین کا مصنوعی ماحول پیدا کرنے کی کوشش میں لگ جاتے ہیں۔

غور طلب امر یہ ہے کہ مشرقی ممالک، بالخصوص اسلامی ممالک سے ترک وطن کر کے مغربی ممالک میں آباد ہونے والوں کا اصل ہدف کیا ہے؟ اگر تو مقصد صرف یہ ہے کہ یہاں سے کمائی کر کے کسی نہ کسی وقت پھر واپس اپنے اپنے وطن چلے جانا ہے اور مغربی ممالک میں قیام کی نوعیت عارضی ہے تو ہماری تعلیمی پالیسیوں اور معاشرتی روایات و اقدار کو اس کے دائرہ میں رہنا چاہیے اور اگر ہمارا واپسی کا کوئی پروگرام نہیں ہے یا حالات نے ہمیں یہاں رہنے پر مجبور کر دیا ہے اور ہماری آئندہ نسلوں نے انہی ممالک میں رہنا بسنا ہے تو پھر اپنی تعلیمی و معاشرتی ضروریات کا تعین ہمیں اسی وسیع تناظر میں کرنا ہوگا، ورنہ نئی نسل کے ساتھ ہم قطعی طور پر انصاف نہیں کر سکیں گے۔

مثال کے طور پر ایک بات کا حوالہ دینا مناسب خیال کرتا ہوں۔ برطانیہ میں ان دنوں برصغیر پاک و ہند و بنگلہ دیش کے طرز کے دینی مدارس کے قیام کا رجحان بڑھ رہا ہے جو خوش آئند ہے۔ بعض دارالعلوم اور جامعات اعلیٰ سطح پر قائم ہو رہے ہیں۔ مجھے ایک بڑے جامعہ کے بانی و مہتمم صاحب نے فرمایا کہ آپ نصاب تعلیم کے بارے میں ہمیں مشورہ دیں۔ میں نے عرض کیا کہ نصاب تعلیم کے بارے میں مشورہ بعد میں دوں گا، پہلے میرے ساتھ کسی نشست میں یہاں کی دینی ضروریات کے بارے میں تبادلہ خیال کریں تاکہ اس معاشرہ کی دینی ضروریات کا ایک واضح نقشہ ہمارے سامنے آ سکے، کیونکہ نصاب تعلیم کی بنیاد ضروریات پر ہوتی ہے اور اگر ان دونوں کے درمیان تناسب و توازن قائم نہ رہے تو کسی بھی نصاب تعلیم سے گزر کر آنے والی کھیپ معاشرہ میں کسی مفید کردار کی حامل نہیں ہو سکتی، لیکن ہمارے ہاں ہو یہ رہا ہے کہ نہ صرف برطانیہ بلکہ پاکستان، بھارت اور بنگلہ دیش میں بھی دینی مدارس اسی نظام و نصاب کے تحت چل رہے ہیں جو ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں ناکامی کے بعد ہمارے اکابر نے محض دینی علوم کی حفاظت اور مشرقی معاشرت کے تسلسل کو باقی رکھنے کے لیے اختیار

کیا تھا۔

وہ دور غلامی تھا اور اس دور کی ضرورت صرف یہ تھی کہ حملہ آور انگریزوں کی تعلیمی و تہذیبی یلغار سے دینی علوم و مشرقی معاشرت کو جس حد تک ممکن ہو، بچا لیا جائے اور مسلمانوں کو مساجد میں نماز پڑھانے اور قرآن کریم کی تعلیم دینے والے ائمہ اور حفاظ میسر آتے رہیں۔ یہ ایک قسم کی دفاعی جنگ تھی جس میں دینی مدارس کا یہ نظام و نصاب کافی حد تک کامیاب رہا، لیکن آزادی کے بعد بالخصوص پاکستان اور بنگلہ دیش میں مقاصد و ضروریات کے دائرے بدل گئے تھے اور اب صرف دینی علوم کی حفاظت نہیں بلکہ ہمارے معاشرے کو دینی علوم و روایات کے رنگ میں رنگنے کی ذمہ داری ان مدارس پر آ پڑی تھی، مگر افسوس کی بات ہے کہ ابھی تک ہمارے دینی نظام کے تعلیمی ماہرین اس طرف توجہ نہیں دے سکے اور جو کچھ وہ اپنے محدود وسائل کے باوجود اس ضمن میں بہتر منصوبہ بندی اور ترجیحات کے ذریعے کر سکتے تھے، اس کا چوتھائی حصہ بھی دیکھنے میں نہیں آ رہا۔

دینی مدارس کے نظام و نصاب کی بات تو بطور مثال عرض کی گئی ہے۔ اب پھر اسی نکتہ کی طرف آجائیے کہ مغربی ممالک میں مقیم پاکستانیوں کی تعلیمی ضروریات کیا ہیں؟ اس ضمن میں ایک بات ہمیں واضح طور پر سمجھ لینی چاہیے کہ یہاں سے ہماری واپسی کا کوئی امکان باقی نہیں رہا اور نہ ہی واپسی ان مسائل کا کوئی مثبت حل ہے۔ تین سال قبل واشنگٹن ڈی سی کے ایک اجتماع میں راقم الحروف نے اپنے پاکستانی بھائیوں کو نئی نسل کی اسلام سے بے گانگی اور پھر اس سے اگلی نسل کے دین سے بالکل منحرف ہو جانے کے امکان کی طرف توجہ دلائی تو اجتماع کے بعد ایک دوست نے کہا کہ میں نے آپ کی باتیں سن کر فیصلہ کیا ہے کہ بچوں سمیت بہت جلد وطن واپس چلا جاؤں گا۔ میں نے عرض کیا کہ میں آپ کو اس کا مشورہ نہیں دوں گا، کیونکہ یہ فرار ہے اور مسلمانوں کا کام فرار اختیار کرنا نہیں ہے۔ اب آپ اسی معاشرہ میں رہیے، مسائل کا سامنا کیجیے اور حوصلہ و تدبر کے ساتھ ان کا حل تلاش کیجیے۔

پھر یہاں سے چلے جانا مسلمان خاندانوں کے بس میں بھی نہیں رہا۔ اس میں نئی نسل ان کا ساتھ نہیں دے گی اور ایسے واقعات سامنے آ چکے ہیں کہ واپس جانے والے خاندانوں کو نئی نسل کی ضد کے سامنے ہتھیار ڈال کر ''اسی تنخواہ پر'' یہاں واپس آنا پڑا ہے، اس لیے ہمیں اپنی تعلیمی اور تہذیبی و ثقافتی ضروریات طے کرتے وقت اس حقیقت کو بہرحال سامنے رکھنا ہو گا کہ ہمیں اب یہاں رہنا ہے اور

یہی ہماری آئندہ نسلوں کا وطن ہے اور یہ حقیقت بھی پیش نظر رکھنا ہوگی کہ آپ کی نئی نسل پر صرف آپ کی نہیں بلکہ یہاں کی سوسائٹی کی بھی نظر ہے اور وہ اس معاملے میں سوچ، منصوبہ بندی، ترجیحات اور منظم عمل میں آپ سے کہیں آگے ہیں۔ صرف ایک بات سے اندازہ کر لیجیے: گزشتہ دو دہائیوں سے برطانیہ میں گرجے فروخت ہو رہے ہیں اور ان کی جگہ مساجد بن رہی ہیں۔ سینکڑوں مساجد ایسی ہیں جو گرجے خرید کر ان میں قائم کی گئی ہیں۔ مجھے خیال ہوا کہ اس بارے میں یہاں کے پادریوں کا ردعمل معلوم کرنا چاہیے۔ آخر وہ اس صورت حال سے باخبر ہیں، سب کچھ دیکھ رہے ہیں تو اس معاملہ میں ان کا نقطہ نظر کیا ہے؟ یہاں کے ایک مسلمان مذہبی راہنما کے سامنے میں نے اس خیال کا اظہار کیا تو انہوں نے کہا کہ ایک بڑے پادری صاحب سے اس سلسلے میں خود ان کی بات ہوئی ہے اور پادری صاحب کا کہنا یہ ہے کہ ہمیں اس سلسلہ میں کچھ زیادہ فکر نہیں ہے، اس لیے کہ جو مساجد بن رہی ہیں، ان میں حاضری دینے اور نماز پڑھنے والے اکثر وہی بوڑھے اور پختہ عمر کے لوگ ہیں جو مختلف ممالک سے ترک وطن کر کے یہاں آئے ہیں۔ ان کی اگلی نسل میں نماز پڑھنے والوں کا تناسب بہت کم ہے اور اس سے اگلی نسل کی تیسری اور چوتھی پشت خود ان مساجد کو دوبارہ ہمارے ہاتھوں فروخت کرے گی۔ پادری صاحب کی بات سو فیصد درست نہ ہو، تب بھی اس سے ہماری نئی نسل کے بارے میں یہاں کی سوسائٹی کی سوچ کا اندازہ ضرور کیا جا سکتا ہے اور ہمیں اپنی تعلیمی و ثقافتی ضروریات کا دائرہ متعین کرنے میں اس سے کافی مدد مل سکتی ہے۔

اب مسئلہ کے ایک اور پہلو کا جائزہ لے لیا جائے تو غیر مناسب نہ ہوگا کہ جب برطانیہ اور دیگر مغربی ممالک میں مقیم مسلمانوں نے اور ان کی اگلی نسلوں نے بہر حال یہاں رہنا ہے تو یہاں کی مقامی آبادی کے ساتھ ان کے تعلقات اور معاشرتی جوڑ کی مستقبل کے اعتبار سے نوعیت کیا ہونی چاہیے اور کیا یہ ضروری ہے کہ درمیان میں حجاب اور منافرت کی ایک دیوار ہمیشہ حائل رہے؟ یہ بہت نازک سوال ہے اور اس کا یہ مطلب بھی اخذ کیا جا سکتا ہے کہ شاید میں مسلمانوں کو یہاں کی معاشرت قبول کرنے کا مشورہ دے رہا ہوں، لیکن ایسا نہیں ہے۔ میرے سامنے قرون اولیٰ کے مسلمانوں کی مثال ہے جو عرب سے نکلے اور پوری دنیا میں پھیل گئے۔ وہ جہاں جہاں بھی گئے، دو باتوں کا پوری طرح اہتمام کیا: ایک یہ کہ عمل اور کردار کے لحاظ سے ایسی صاف ستھری زندگی وہاں کی آبادی کے سامنے

پیش کی جس نے اسلام کا خاموش اور مثبت تعارف کرایا اور دوسری یہ کہ مقامی معاشرت کے ساتھ معاندانہ روش اختیار نہیں کی اور جو بات اسلام کے بنیادی عقائد و احکام سے منافی نظر نہیں آئی، اسے قبول کر لیا۔

تھوڑی دیر کے لیے ذہن پر زور دیجیے کہ اگر برصغیر پاک و ہند و بنگلہ دیش میں باہر سے جانے والے مسلمان، بالخصوص صوفیائے کرام مقامی معاشرت کے ساتھ کسی حد تک مصالحانہ طرز عمل اختیار نہ کرتے اور وہاں جاتے ہی مقامی معاشرتی اقدار کے خلاف جنگ کا بگل بجا دیتے تو کیا برصغیر کی اتنی بڑی آبادی کے مسلمان ہو جانے کا کوئی امکان باقی رہ جاتا؟ اسلام نے تو عرب کے جاہلی معاشرہ کی تمام اقدار و روایات کو رد نہیں کیا بلکہ جو بات قرآن و سنت کی بنیادی تعلیمات سے متصادم نظر نہیں آئی، اسے اسی طرح باقی رہنے دیا۔ اس لیے مغربی ممالک میں مقیم مسلمان دانشوروں کو اپنے مستقبل کا نقشہ بے حد سوچ بچار اور مکمل احتیاط کے ساتھ بنانا ہوگا۔

ہم اس وقت "مداری کے رسے" پر چل رہے ہیں۔ ہمیں ایک طرف یہ سوال درپیش ہے کہ ہماری نئی نسل باشعور مسلمان ہو اور یورپی معاشرت کی وہ غلط اقدار جن کا تعلق شراب، سور، عریانی اور جنسی بے راہ روی سے ہے، ہمارے نوجوانوں کی زندگی پر قابو نہ پالیں اور دوسری طرف یہ مسئلہ بھی کچھ کم اہمیت کا حامل نہیں کہ ہماری نئی نسل اور مقامی سوسائٹی کے درمیان اجنبیت کی کوئی ایسی دیوار حائل نہ ہونے پائے جس سے مستقبل میں ہماری حیثیت دوسرے درجے کے شہری کی ہو کر رہ جائے اور ہم یہاں کی قومی زندگی میں کوئی مقام اور کردار حاصل نہ کر سکیں۔ میرے نزدیک اس مسئلہ کا حل یہ ہے کہ یہاں رہنے والے مسلمان مساجد اور دینی مدارس کے ساتھ ساتھ اپنی آبادی کے لیے عصری تعلیم کے اسکول بھی خود قائم کریں جن میں ماحول اسلام کے مطابق ہو اور تعلیم کا معیار یہاں کے سرکاری اسکولوں سے کسی طرح کم نہ ہو۔ نیز مسلمان بچوں کو اعلیٰ تعلیم کے لیے زیادہ سے زیادہ آگے بھجوایا جائے تاکہ مستقبل میں مسلمانوں کو کسی قسم کے احساس کمتری سے دوچار نہ ہونا پڑے۔ اسی طرح مقامی سوسائٹی کے ساتھ معاشرتی میل جول کو اس نقطہ نظر سے بڑھایا جائے کہ ہم نے انہیں اسلام کی دعوت دینی ہے اور اسلام کی طرف مائل کرنا ہے، لیکن یہ اسی وقت ممکن ہوگا جب ہم ان کے سامنے ایک اچھے مسلمان کا کردار ادا کر سکیں، ان کے ذہنوں میں اسلام کے بارے میں صدیوں سے پایا

جانے والا خوف دور کر سکیں اور انہیں یہ باور کرا سکیں کہ معاشرتی طور پر جس بے سکونی اور عدم اطمینان کا وہ شکار ہیں، اس کا حل صرف اور صرف اسلام کے پاس ہے۔ یہ راستہ کٹھن ضرور ہے، لیکن ناقابل عبور نہیں۔ خدا کرے کہ مغرب میں مقیم مسلمان دانش ور اپنی صلاحیتوں کو اس رخ پر بھی صرف کریں۔

(الشریعہ، جنوری ۱۹۹۳ء)

امریکہ کا لکڑ ہضم، پتھر ہضم معاشرہ اور مسلمانوں کی نئی پود کا مستقبل

(۱۷ دسمبر ۱۹۹۰ء کو بروکلین نیویارک کی مکی مسجد میں خطاب)

بعد الحمد والصلوٰۃ!

بزرگانِ محترم و برادرانِ اسلام! مجھے امریکہ میں حاضری دیتے ہوئے چوتھا سال ہے، ہر سال کچھ دنوں کے لیے حاضری کا موقع ملتا ہے، یہاں مکی مسجد میں آپ حضرات سے ملاقات کی سعادت بھی حاصل ہوتی ہے۔ پہلی دفعہ ۱۹۸۷ء میں حاضر ہوا تو یہیں مکی مسجد میں مسلسل آٹھ دس روز قادیانیت کے بارے میں روزانہ گفتگو ہوتی رہی۔ اس وقت یہاں آنے کا مقصد بھی قادیانی گروہ کی سرگرمیوں کے بارے میں آگاہی حاصل کرنا اور امریکہ میں بسنے والے مسلمانوں کے حالات معلوم کرنا تھا۔ پھر جوں جوں مسائل و احوال سے واقفیت ہوتی گئی، اس مشن کا دائرہ وسیع ہوتا گیا اور اس بار بھی امریکہ حاضری اسی مشن کے سلسلہ میں ہے۔ میں مکی مسجد کے خطیب محترم حافظ محمد صابر صاحب کا شکر گزار ہوں کہ انہوں نے اس اجتماع میں آپ سے گفتگو کا موقع فراہم کیا۔

حضرات محترم! میں آج کی گفتگو میں آپ دوستوں سے ایک اہم مسئلہ پر بات کرنا چاہتا ہوں اور وہ ہے امریکہ میں آباد مسلمانوں کے مذہبی مستقبل کا مسئلہ اور یہ سوال کہ یہاں رہنے والے مسلمانوں کی اگلی نسل کا تعلق اسلام کے ساتھ باقی رہے گا یا نہیں۔ یہ سوال انتہائی نازک اور پریشان کن ہے اور شمالی امریکہ کے مختلف علاقوں میں گھوم پھر کر حالات کا جائزہ لینے کے بعد میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ یہاں کے مسلمانوں کو اس مسئلہ کی سنگینی کی طرف توجہ دلانا ضروری ہے، کیونکہ ماضی کے تلخ تجربات شاہد ہیں کہ اگر مسلمانوں کی اگلی نسل کے ایمان کو بچانے کی ابھی سے سنجیدہ کوشش نہ کی گئی تو ماضی میں یہاں آنے والے ہزاروں مسلمان خاندانوں کی طرح موجودہ مسلمانوں کی اولاد بھی خدانخواستہ بطور مسلمان اپنا

تشخص باقی نہیں رکھ سکے گی۔

میرے محترم دوستو! آپ لوگ بحمد اللہ مسلمان ہیں اور مختلف ممالک سے نقل مکانی کر کے روز گار کی تلاش میں اس سرزمین میں آکر آباد ہو گئے ہیں۔ روز گار کی تلاش اچھی بات ہے۔ خود اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں فرمایا ہے کہ "فانتشروا فی الارض وابتغوا من فضل الله" (الجمعه) ''زمین میں پھیل جاؤ اور اللہ کا فضل تلاش کرو''، لیکن اس کے ساتھ ایک بات بھی شامل کر لیں کہ ان لوگوں کے حشر اور انجام پر بھی ایک نظر ڈال لیں جو آپ سے پہلے یہاں آئے تھے اور آپ کے مسلمان بھائی تھے، لیکن یہاں کی معاشرت اور تہذیب میں جذب ہو کر اپنا تہذیبی اور مذہبی امتیاز کھو بیٹھے ہیں اور آج مسلمانوں کی حیثیت سے ان کی پہچان ختم ہو کر رہ گئی ہے۔ آپ کے اردگرد سینکڑوں مشاہدات بکھرے پڑے ہیں، صرف آنکھیں کھولنے اور دماغ کے دریچے وَا کرنے کی ضرورت ہے۔ ذرا آنکھیں کھول کر دیکھیں، آپ کو قدم قدم پر عبرت کے مناظر دکھائی دیں گے۔ مجھے تو یہ مناظر دکھائی دیتے ہیں اور آپ کو بھی دکھانا چاہتا ہوں۔ صرف اس سفر کے چند مشاہدات سماعت فرمالیجیے:

ابھی چند روز قبل میں واشنگٹن ڈی سی میں تھا۔ ایک دوست کے ہاں شام کا کھانا تھا۔ ادارہ دعوت و ارشاد واشنگٹن ڈی سی کے مولانا محمد رفیق بھی میرے ساتھ تھے۔ دس بارہ احباب کی محفل تھی جس میں صرف ہم دونوں باریش تھے۔ چار پانچ سال کا ایک بچہ آیا۔ پہلے اس نے ہم دونوں کو غور سے دیکھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ یہ کون سی مخلوق ہے! کچھ دیر دیکھتا رہا، پھر قریب آیا۔ یہاں کے بچوں میں جھجک تو ہے نہیں۔ وہ مولانا محمد رفیق کے ساتھ بیٹھ گیا، ان کی ڈاڑھی کو ہاتھ میں لے کر ٹٹولا، پھر اسے اچھی طرح ہلایا اور بڑی معصومیت کے ساتھ پوچھا کہ ''انکل یہ کیا ہے؟'' بات بظاہر چھوٹی سی تھی، لیکن میں احساس کی گہرائیوں میں ڈبکیاں کھانے لگا کہ ایک مسلمان گھرانے کے بچے کو ڈاڑھی جیسی سنت رسول صلی اللہ علیہ وسلم اور علامت دین کے بارے میں بھی یہ بتانے کی ضرورت ہے کہ یہ کیا چیز ہے!

اسی سفر کے دوران اگستا جارجیا میں میرے دوست افتخار رانا مجھے ایک مقامی ہسپتال میں لے گئے جہاں ایک بوڑھا البانوی مسلمان بستر علالت میں موت و حیات کی کشمکش میں تھا۔ اسے اس حال میں پندرہ بیس روز گزر گئے تھے، مگر امریکہ کے مختلف شہروں میں مقیم اس کے پانچ بیٹوں میں سے کسی ایک کے پاس بھی اتنا وقت نہیں تھا کہ وہ اس کی بیمار پرسی کے لیے ہسپتال تک آسکیں اور وہ بوڑھا

تمناؤں اور حسرتوں کا ایک طوفان دل میں دبائے زبان حال سے امریکی معاشرت کی ستم ظریفوں کا ماتم کر رہا تھا۔ پھر افتخار رانا نے مجھے ایک ''اسٹیفی'' کا قصہ بھی سنایا جوان کے ساتھ اگستا جارجیا کے ایک پلانٹ پر کام کرتا ہے۔ اسے قرآن کریم کی مختلف سورتیں یاد ہیں اور وہ بتاتا ہے کہ اس کا دادا مسلمان تھا جس نے اسے یہ سورتیں یاد کرائیں لیکن وہ خود مسلمان نہیں ہے، عیسائی ہے۔

میرے بھائیو! خدا کے لیے آنکھیں کھولو اور دیکھ لو کہ تمہارے اردگرد اس معاشرہ میں ہزاروں ''اسٹیفی'' موجود ہیں، ان کو دیکھو اور پھر فیصلہ کر لو کہ ان میں تم کتنے ''اسٹیفیوں'' کا اضافہ کرنا چاہتے ہو!

میرے محترم دوستو! آپ لوگ یہاں آنے والے پہلے مسلمان نہیں ہیں۔ آپ سے پہلے بھی دو مرحلوں میں مسلمان یہاں آ چکے ہیں۔ آپ تیسری کھیپ ہیں، اس لیے یہاں قدم جمانے سے پہلے ان لوگوں کے حالات پر ضرور نظر ڈال لیجیے جنہوں نے آپ سے پہلے اس سرزمین پر قدم رکھا اور پھر اس ''لکڑ ہضم پتھر ہضم'' معاشرہ میں گم ہو کر رہ گئے۔ تاریخ بتلاتی ہے کہ امریکہ میں مسلمان سب سے پہلے اندلس سے آئے تھے۔ جب صلیبی جنگوں کے نتیجے میں اندلس دوبارہ عیسائیوں کے قبضے میں چلا گیا تو ہزاروں مسلمان اپنی جانیں اور ایمان بچانے کے لیے ہزاروں میل کا سمندر عبور کر کے یہاں آ گئے تھے۔ یہ کم و بیش وہی دور ہے جب کولمبس نے مغربی راستے سے ہندوستان پہنچنے کے جنون میں براعظم امریکہ دریافت کیا تھا، اس لیے یہ بات ابھی تک تاریخ میں متنازعہ ہے کہ امریکہ میں کولمبس پہلے آیا تھا یا مسلمانوں نے پہلے اس سرزمین پر قدم رکھا تھا، لیکن یہ بات طے ہے کہ اس دور میں ہزاروں مسلمان یہاں آئے اور اس وقت امریکہ میں اسپینش نسل کے جو لاکھوں خاندان آباد ہیں، ان میں سے اکثر انہی مسلمانوں کی اولاد ہیں لیکن ان میں شاذ ہی اب کوئی مسلمان رہ گیا ہو گا۔

مسلمانوں کی دوسری کھیپ رواں صدی کے آغاز میں ترکی کی خلافت عثمانیہ کے خاتمہ اور مشرقی یورپ پر کمیونزم کے غلبہ کے دوران یہاں آئی اور ایک روایت کے مطابق اس مرحلہ میں مشرقی یورپ کے مختلف ممالک سے دو لاکھ کے لگ بھگ مسلمان خاندان ترک وطن کر کے امریکہ میں آباد ہوئے۔ ان کی اولاد کا بھی ایک بڑا حصہ عیسائیت کی آغوش میں جا چکا ہے اور جو باقی ہیں، ان کی بڑی اکثریت کا اسلام کے ساتھ کوئی تعلق باقی نہیں رہ گیا۔

تیسرے مرحلہ میں امریکہ آنے والے مسلمان آپ لوگ ہیں جو مختلف ممالک سے روزگار اور زندگی کی بہتر سہولتوں کی تلاش میں یہاں آئے ہیں اور ڈالر کمانے میں لگے ہوئے ہیں۔ میں آپ کو ڈالر کمانے سے منع کرنے کے لیے نہیں آیا۔ خوب ڈالر کمائیے اور میری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ کو زندگی کی اس سے بہتر سہولتوں سے نوازے اور اس سے کئی گنا زیادہ ڈالر دے، لیکن صرف یہ سوچ لیجیے کہ ڈالر اور زندگی کی بہتر سہولتوں کے عوض آپ اس معاشرہ کو کیا دے رہے ہیں، اس کی آپ لوگ کیا قیمت ادا کر رہے ہیں؟ یہ قیمت اپنی اولاد کے ایمان کی صورت میں تو آپ ادا نہیں کرنا پڑے گی؟ اگر ایسا ہے تو یہ بہت خسارے کا سودا ہے۔ اس سودے پر نظر ثانی کر لیجیے، اس کے نتائج پر غور کر لیجیے اور خدا کے لیے بہتر زندگی اور ڈالر کے عوض اپنی اگلی نسل کو کفر کی دلدل میں دھکیلنے کا سودا نہ کیجیے۔

ایک بات اور میں آپ سے دوٹوک کرنا چاہتا ہوں کہ اس کا فیصلہ آپ کو ابھی کرنا ہے، بعد میں آپ کسی فیصلہ کی پوزیشن میں نہیں ہوں گے۔ آپ امریکی معاشرت کی بھٹی میں داخل ہو چکے ہیں۔ یہ بڑی سخت بھٹی، ہے یہاں ہر چیز پگھل جاتی ہے۔ یہ معاشرت اور کلچر جسے امریکی کہا جاتا ہے، دراصل امریکی نہیں، یورپی ہے اور اس نے بے شمار کلچر ہضم کیے ہیں، حتیٰ کہ یہ معاشرت امریکہ کی مقامی معاشرت کو بھی کھا گئی ہے۔ آپ دیکھ لیجیے کہ اصل امریکی اس معاشرہ میں کہاں ہیں؟ ان کا تو اصل نام بھی کسی کو یاد نہیں رہا۔ وہ ریڈ انڈین کے نام سے پکارے جاتے ہیں۔ یہ نام انہیں یورپی آباد کاروں نے دیا ہے، انہیں مخصوص علاقوں کی طرف دھکیل دیا گیا ہے، امریکہ کی قومی زندگی میں ان کا کوئی حصہ نہیں اور وہ یہاں کے اصل امریکی ہونے کے باوجود اجنبیوں کی سی زندگی بسر کر رہے ہیں۔ یہ یورپی تہذیب کا کمال ہے اور اس کا ہاضمہ ہے کہ اس کان نمک میں جو بھی آیا، نمک ہو کر رہ گیا۔ اب آپ یہ سوچ لیں کہ اس میں ہضم ہونے سے آپ نے کیسے بچنا ہے اور اپنی اولاد اور اگلی نسل کو کیسے بچانا ہے؟ اگر آپ ابھی اس کا فیصلہ نہیں کریں گے تو یہ بات نوٹ کر لیجیے کہ آپ کی آنے والی نسلیں مسلمان نہیں رہیں گی۔ دوسری نسل لبرل ہوگی اور تیسری نسل عیسائیت کی آغوش میں چلی جائے گی اور اس کی ذمہ داری آپ پر ہوگی۔ خدا کی بارگاہ میں بھی آپ اس کے مجرم ہوں گے اور تاریخ بھی اس کا ذمہ دار آپ کو ٹھہرائے گی۔

آپ شاید یہ سوچ رہے ہوں گے کہ میں آپ کو یہاں سے واپس جانے کا مشورہ دوں گا۔ بالکل نہیں، اس لیے کہ یہ فرار ہے اور مسلمان کا کام مسائل سے فرار اختیار کرنا نہیں بلکہ مسائل کا سامنا کرنا

ہے۔ ابھی چند روز قبل ایک مجلس میں یہ گزارشات میں نے پیش کیں تو ایک صاحب کہنے لگے کہ میں تو واپس چلے جانے کے بارے میں سوچ رہا ہوں۔ میں نے کہا کہ نہیں، میں آپ کو اس کا مشورہ نہیں دوں گا اور کسی مسلمان کو مسائل سے فرار کا مشورہ کم از کم میں نہیں دے سکتا۔ مسائل کا سامنا کیجیے، ان کا تجزیہ کیجیے اور ان کا حل تلاش کیجیے۔

حضرات محترم! میری آپ سے درخواست ہے کہ اس سنگین مسئلہ کے حل کے لیے آپ دو باتوں کا اہتمام ضرور کر لیجیے، ورنہ آپ ان نتائج سے نہیں بچ سکیں گے جن کا سامنا یہاں آپ سے پہلے آنے والے مسلمانوں کو کرنا پڑا ہے۔ ایک بات یہ کہ اپنے گھروں کے ماحول کو دینی بنانے کی کوشش کیجیے، گھر میں نماز روزہ اور تلاوت کلام پاک کے معمولات کا اہتمام کیجیے، اپنے مذہبی تشخص کا تحفظ کیجیے اور دوسری یہ کہ اپنی اولاد کی دینی تعلیم کا اہتمام ضرور کیجیے، انہیں قرآن کریم اور دینی احکام و مسائل کی تعلیم دلائیے، مساجد و مدارس کا نظام قائم کیجیے اور دین کی بنیادی تعلیم کے سلسلہ کو ہر مسلمان تک پھیلا دیجیے۔ اگر آپ اپنے بچوں کو دین کی تعلیم دلائیں گے اور انہیں گھروں میں مذہبی ماحول مہیا کریں گے تو دین کے ساتھ ان کا تعلق باقی رہے گا اور وہ مسلمان کی حیثیت سے اپنا وجود برقرار رکھ سکیں گے، ورنہ وہ صرف یہاں کے کلچر میں ضم ہو کر رہ جائیں گے، بلکہ اس سوسائٹی کا مذہب بھی قبول کر لیں گے۔ انہیں اس انجام سے صرف آپ کی سنجیدہ سوچ بچا سکتی ہے اور اس کا فیصلہ آپ کو ابھی اسی مرحلہ میں کرنا ہے۔

اس ملک میں ایک اور بات بھی عرض کیا کرتا ہوں اور آپ کی توجہ اس طرف مبذول کرانا ضروری سمجھتا ہوں کہ جن ممالک سے آپ آئے ہیں، ان کے ماحول اور سوسائٹی پر آپ اس معاشرہ کو قیاس نہ کریں۔ وہاں اگر والدین اپنی اولاد کی مذہبی وابستگی اور تعلیم و تربیت کے فرض سے کوتاہی بھی کر جائیں تو کچھ متبادل ذرائع ہیں جو انہیں مذہب سے وابستہ رکھنے کا وسیلہ بن جاتے ہیں۔ محلہ کی مسجد سے ان کا تعلق جڑ سکتا ہے، اسکول اور کالج میں اچھا استاذ مل سکتا ہے، دوستوں کی اچھی سوسائٹی مل سکتی ہے، حتیٰ کہ ریڈیو اور ٹی وی کے ذریعہ بھی وقتاً فوقتاً اذان، تلاوت کلام پاک اور درس و وعظ کی آواز کان میں پڑتی رہتی ہے اور سب سے بڑھ کر معاشرہ اور سوسائٹی کا اجتماعی ماحول نئی پود کا تعلق مذہب کے ساتھ جوڑے رکھتا ہے، لیکن یہاں تو ان صورتوں میں سے کسی ایک کا بھی امکان نہیں ہے۔ اسکول،

کالج، سوسائٹی، میڈیا اور عمومی معاشرت ان سب کے رجحان سے آپ بخوبی آگاہ ہیں۔ ان میں سے کسی سے آپ کو خیر کی توقع ہے؟ اور اپنی اولاد کے مذہبی اور تہذیبی مستقبل کے بارے میں آپ ان میں سے کس پر اعتماد کر سکتے ہیں؟ یہ تو سب کے سب کفر اور بے حیائی کے داعی ہیں اور ان سب نے تو قسم کھا رکھی ہے کہ کسی مسلمان کو مسلمان باقی نہیں رہنے دینا، اس لیے یہاں نئی نسل کے مذہبی مستقبل کا انحصار صرف اور صرف والدین کی توجہ پر ہے۔ والدین اپنی اولاد کو مسلمان رکھنا چاہیں گے تو وہ مسلمان رہے گی، ورنہ نہیں رہے گی اور خوب سمجھ لیجیے کہ بالکل نہیں رہے گی۔

جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک ارشاد گرامی بیسیوں بار پڑھا اور بیسیوں بار بیان بھی کیا، لیکن سچی بات یہ ہے کہ اس کا عملی مفہوم یہاں اس معاشرہ میں آکر سمجھ میں آیا۔ جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ "کل مولود یولد علی الفطرۃ فابواہ یہودانہ او ینصرانہ او یمجسانہ" (الحدیث) "ہر پیدا ہونے والا بچہ صحیح فطرت پر پیدا ہوتا ہے۔ اس کے ماں باپ اس کو یہودی بناتے ہیں، عیسائی بناتے ہیں یا مجوسی بناتے ہیں"۔ اب یہ فیصلہ آپ کے ہاتھ میں ہے کہ اپنی اولاد کو، نئی نسل کو اور آنے والی مسلمان پود کو آپ نے مسلمان باقی رکھنا ہے یا عیسائی اور یہودی بنا دینا ہے۔ اس فیصلے کا اختیار آپ کے پاس ہے اور اس کی ذمہ داری بھی صرف آپ پر ہوگی۔

محترم بزرگو دوستو! بس اس پیغام کے لیے آپ کی خدمت میں حاضر ہوا ہوں۔ گزارشات شاید کچھ تلخ ہوں، لیکن میں اسی قسم کی باتوں کا عادی ہوں، لوریاں دینا نہیں جانتا۔ ان گزارشات پر پوری توجہ اور سنجیدگی کے ساتھ غور فرمائیں، اپنی اولاد کے مستقبل کا فکر کریں، اسے کفر کی آغوش میں جانے سے بچائیں اور وہ تمام ذرائع اختیار کریں جو یہاں مسلمانوں کی اگلی نسل کو مسلمان باقی رکھنے کے لیے ضروری ہوں اور اس کے ساتھ بارگاہ خداوندی میں دعا بھی کریں کہ اللہ تعالیٰ مجھے اور آپ سب کو اسلام اور مسلمانوں کے لیے مخلصانہ کام کرنے کی توفیق سے نوازے۔

"اللهم صل علی محمدن النبی الامی وآله واصحابه وبارک وسلم"۔

امریکہ میں مقیم مسلمانوں سے چند گزارشات

(جمعیۃ المسلمین، واشنگٹن ڈی سی، امریکہ کے زیر اہتمام
۲۳ اکتوبر ۱۹۸۹ء کو پیرش ہال میں ایک جلسہ عام سے خطاب)

بعد الحمد والصلوۃ!

میں مسجد الہدیٰ واشنگٹن ڈی سی کی انتظامیہ اور جمعیۃ المسلمین کے ذمہ دار حضرات کا شکر گزار ہوں جنہوں نے آج یہاں اس محفل جاانعقاد کر کے ہمیں اپنی دینی ذمہ داریوں کے بارے میں کچھ کہنے سننے کا موقع فراہم کیا۔ اللہ تعالیٰ انہیں جزائے خیر دیں۔

تفصیلی خطاب تو حضرت مولانا منظور احمد چنیوٹی کا ہوگا جو قادیانیت کی فتنہ خیزیوں کے بارے میں آپ سے کھل کر بات کریں گے۔ مجھے مختصر وقت میں آپ دوستوں سے یہاں امریکہ میں مقیم مسلمانوں بالخصوص پاکستانی دوستوں کی ذمہ داریوں کے حوالے سے کچھ گزارشات پیش کرنی ہیں۔ اللہ رب العزت سے دعا ہے کہ کچھ مقصد کی باتیں کہنے سننے کی توفیق دیں اور دین حق کی جو بات سمجھ میں آئے، اللہ تعالیٰ اس پر عمل کی توفیق عطا فرمائیں۔

حضرات محترم! مجھے اس سلسلہ میں اپنی معلومات کے حتمی ہونے پر اصرار نہیں، لیکن اب تک جو معلومات مجھے حاصل ہوئی ہیں، ان کے مطابق ریاست ہائے متحدہ امریکہ میں مسلمانوں کی تعداد ایک کروڑ کے لگ بھگ ہے۔ کہا جاتا ہے کہ امریکہ میں مسلمان چار فی صد ہیں۔ اگر یہ درست ہے اور امریکہ کی آبادی کم و بیش ۲۴ کروڑ کے لگ بھگ ہی بنتی ہے، اس ایک کروڑ میں پاکستانیوں کی تعداد ایک محتاط اندازے کے مطابق دس لاکھ کے لگ بھگ شمار کی جارہی ہے، پھر یہ تعداد دن بدن بڑھ رہی ہے اور میرا اندازہ ہے کہ اگلے دس سال میں یہ تعداد زیادہ نہیں تو کم از کم دو گنا ضرور ہو جائے گی۔

محترم بزرگو دوستو! اس گزارش کے ساتھ میں آپ دوستوں کو چند اہم امور کی طرف متوجہ کرنا ضروری سمجھتا ہوں: ایک یہ کہ آپ اپنے اردگرد نظر ڈالیں گے تو آپ کو بے شمار ایسے خاندان نظر آئیں

گے جو کسی زمانے میں مسلمان تھے، بالخصوص اسپینش اور میکسیکن قوم میں آپ کو ایسے خاندانوں کی ایک بڑی تعداد نظر آئے گی جن کے آباواجداد کسی زمانہ میں یہاں بحیثیت مسلمان آئے تھے، لیکن اب ان کی اولاد مسلمان نہیں رہی۔

میں اس وقت اس بحث میں نہیں پڑتا کہ امریکہ میں پہلے کولمبس آیا تھا یا اسپین کے مسلمان اس زمین پر پہلے وارد ہوئے تھے، لیکن اس تاریخی حقیقت کی طرف آپ کو متوجہ کرنا ضروری سمجھتا ہوں کہ اسپین میں عیسائیت کے دوبارہ تسلط کے وقت وہاں سے بے شمار خاندان سمندر پار کر کے امریکہ میں آبسے تھے، لیکن آج وہ خاندان مسلمان نہیں رہے۔ آپ ذرا کریدیں گے تو آپ کو ان خاندانوں میں اسلام کے آثار آج بھی نظر آسکتے ہیں، لیکن یہ لوگ مذہب کے ساتھ تعلیمی تعلق نہ ہونے کی وجہ سے نہ صرف یہاں کے معاشرے میں ضم ہوگئے بلکہ ایمان سے محروم ہوکر عیسائیت کی آغوش میں چلے گئے۔ پھر آپ ان لوگوں کو دیکھیں جو مشرقی یورپ میں کمیونزم کے تسلط کے وقت وہاں سے ایمان بچانے کے لیے نکل کھڑے ہوئے۔ ان میں سے کچھ خاندان یہاں امریکہ میں آکر آباد ہوئے۔ ان میں سے بھی بہت سے خاندان آپ کو ایسے ملیں گے جو آج مسلمان نہیں رہے اور یہاں کا کلچر اور مذہب انہیں پوری طرح ہضم کر چکا ہے۔

حضرات محترم! میں آپ حضرات سے عرض کرنا چاہتا ہوں کہ اپنے اردگرد ان مشاہدات کو دیکھتے ہوئے آج آپ نے ایک فیصلہ کرنا ہے۔ وہ یہ کہ اس خطہ میں جہاں آپ دنیا کی زندگی کے لیے بہتر وسائل کی تلاش میں آئے ہیں، آپ کی اولاد کا مستقبل کیا ہوگا؟ کیا آپ فی الواقع اپنی اولاد اور آنے والی نسل کے دینی مستقبل سے دستبردار ہو چکے ہیں؟ اور کیا آپ واقعتاً اس واضح طور پر آنے والی تبدیلی کو ذہناً قبول کر چکے ہیں؟ اگر ایسا نہیں ہے اور آپ کے چہرے مجھے بتا رہے ہیں کہ آپ ذہناً اپنی اولاد کو کفر کے حوالے کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں تو پھر یہ بات صرف خواہش کے ساتھ پوری نہیں ہوگی، اس کے لیے آپ کو کچھ کرنا ہوگا اور یہ آپ ہی کی ذمہ داری ہے کہ اپنی اولاد کو کفر کی آغوش میں جانے سے بچائیں۔

قرآن کریم نے بھی یہ ذمہ داری آپ پر عائد کی ہے کہ صرف خود جہنم کی آگ سے بچنے کی کوشش پر اکتفا نہ کریں بلکہ اپنے اہل و عیال کو بھی اس آگ سے بچائیں۔ یہ دین کا تقاضا ہے اور یہ عقل و منطق کا

تقاضا بھی ہے۔ دیکھیے ابھی سان فرانسسکو میں زلزلہ آیا ہے۔ یہ خدائی گرفت آتی رہتی ہے۔ اگر کسی جگہ زلزلہ آجائے، کسی مکان میں آگ لگ جائے تو کسی مکان کا مالک ایسا بے وقوف نہیں ہوگا کہ خود اکیلا مکان سے باہر کھلے میدان میں جا کھڑا ہو اور اطمینان کا اظہار کرے کہ میں تو آگ سے بچ گیا ہوں۔ ایسا کرنا عقل مندی نہیں، بے وقوفی شمار ہوگی۔ عقل مند آدمی وہ سمجھا جائے گا جو پہلے گھر کے دوسرے افراد کو، بیوی بچوں کو، اہل و عیال کو آگ سے بچانے کی کوشش کرے گا اور پھر خود آگ سے بچنے کا سوچے گا۔ یہی بات اللہ تعالیٰ نے فرمائی ہے کہ اے ایمان والو! اپنے آپ کو بھی جہنم کی آگ سے بچاؤ اور اپنے اہل و عیال کو بھی جہنم کی آگ سے بچانے کی کوشش کرو، اس لیے اولاد کے دین و عقیدہ کی حفاظت ہماری ذمہ داری ہے اور جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس حقیقت کا اظہار اس طرح فرمایا ہے کہ ہر پیدا ہونے والا بچہ دین فطرت پر پیدا ہوتا ہے، یہ ماں باپ ہیں جو اس کو یہودی بناتے ہیں، عیسائی بناتے ہیں یا مجوسی بناتے ہیں۔

حضرات محترم! میں دیکھ رہا ہوں کہ امریکہ میں مقیم مسلمانوں کو رفتہ رفتہ اپنی نئی نسل کو بطور مسلمان باقی رکھنے کی ضرورت کا احساس ہو رہا ہے۔ یہ جذبہ بیدار ہو رہا ہے، فکر بڑھ رہا ہے، لیکن اسے صحیح طریقے سے منظم کرنے کی ضرورت ہے۔ اس کا صحیح راستہ یہ ہے کہ آپ اپنے گھروں کا ماحول کسی نہ کسی حد تک مذہبی بنانے کی کوشش کریں، مذہبی اقدار سے وابستگی برقرار رکھیں، گھروں میں نماز اور دیگر عبادات کا اہتمام کریں اور سب سے بڑھ کر اپنی اولاد کی دینی تعلیم کا نظم قائم کریں۔ یہ بات یاد رکھیں کہ اگر آپ نے اپنی اولاد کو مسلمان باقی رکھنا ہے تو آپ کو مساجد کا نظام قائم کرنا ہوگا، آپ کو دینی مدارس کا منظم طریقہ سے آغاز کرنا ہوگا، آپ کو اپنی اولاد کی عصری اور دنیاوی تعلیم کے ساتھ ساتھ دینی تعلیم کی طرف متوجہ ہونا ہوگا، ورنہ آپ اپنی آئندہ نسل کو مذہب اور دین کے ساتھ وابستہ نہیں رکھ سکیں گے اور خدانخواستہ اس کا حشر وہی ہوگا جو اس سے قبل یہاں بسنے والے مسلمانوں کا ہو چکا ہے۔

ایک اور نکتہ بھی ذہن میں رکھیں کہ یہاں اس معاشرہ میں اپنی اولاد کو دین کے ساتھ وابستہ رکھنے کا واحد ذریعہ صرف اور صرف آپ ہیں۔ اپنے وطن میں اگر ماں باپ اولاد کی تربیت سے خدانخواستہ غافل ہوں تو متبادل ذرائع بھی ہیں جو نوجوان نسل کو دین سے دور جانے سے روک لیتے ہیں۔ محلہ میں مسجد، اچھے دوستوں کی سوسائٹی، وعظ و نصیحت کی مجلسیں ہیں۔ وہاں اگر آپ توجہ نہیں دیں گے تو بھی

کوئی نہ کوئی ذریعہ اور مل سکتا ہے، لیکن یہاں تو باقی سب راستے بند ہیں۔ یہاں کا معاشرہ، سوسائٹی، میڈیا، تعلیمی ادارے، غرضیکہ ہر ذریعہ نوجوان کو کفر کی طرف اور جنسی انارکی کی طرف لے جانے والا ہے۔ صرف ماں باپ ہی ایک ایسا واحد ذریعہ باقی رہ جاتا ہے جو اگر صحیح توجہ دے گا تو اولاد کے مسلمان رہنے کا کوئی امکان ہے، ورنہ یہاں اور کوئی متبادل ذریعہ موجود نہیں ہے، اس لیے یہاں آپ کی ذمہ داری اپنی اولاد کے بارے میں کئی گنا بڑھ جاتی ہے جو آپ کو بہر حال پوری کرنی ہے، ورنہ آپ خدا کے مجرم تو ہوں گے ہی، اپنی اولاد اور مسلمانوں کی تاریخ کے بھی مجرم شمار ہوں گے۔

محترم بزرگو اور دوستو! میں جہاں آپ کو اپنی اولاد کے دینی مستقبل کے تحفظ کے لیے مساجد اور دینی مدارس کے قیام کا مشورہ دے رہا ہوں اور دینی مراکز کے ناگزیر ہونے کا احساس دلا رہا ہوں، وہاں ایک تلخ حقیقت کی طرف آپ کو متوجہ کرنا بھی ضروری سمجھتا ہوں کہ جب آپ یہ مساجد، مدارس اور دینی مراکز قائم کریں گے اور آپ کو بہر حال قائم کرنا ہوں گے تو انہیں آباد کرنے کے لیے، انہیں چلانے کے لیے آپ کو دینی افراد کی ضرورت ہوگی۔ وہ کھیپ آپ کہاں سے لائیں گے؟ اتنی بڑی تعداد میں حفاظ، قراء اور علماء کہاں سے مہیا کریں گے؟ اس کا ایک جواب تو یہ ہے اور یہ آسان جواب ہے کہ ہم اپنی ضرورت کے لیے مذہبی افراد کی یہ کھیپ اپنے ملک سے منگوالیں گے۔ یہ راستہ آسان ہے، لیکن اس کے کچھ تلخ ثمرات بھی ہوں گے اور ان تلخ ثمرات کا تجربہ ہم اس سے قبل یورپ میں کر چکے ہیں۔

میرے بھائیو! جب ہم اپنے ملک میں دینی کام کرتے کرتے آپ کے یہاں منتقل ہوں گے تو ہمارے ساتھ بیماریوں کے وہ جراثیم بھی منتقل ہوں گے جو ہمیں لاحق ہیں۔ یہ وہ بیماریاں ہیں جنہوں نے ہمیں اپنے ملکوں میں بھی کسی کام کا نہیں رہنے دیا اور باہر جا کر بھی یہ بیماریاں ہمارے لیے اور اسلام کے لیے بدنامی اور رسوائی کا باعث بن رہی ہیں۔

یورپ میں جب مسلمان منظم ہونا شروع ہوئے تو انہوں نے اپنی ضرورت کے لیے علماء اور حفاظ اپنے وطن سے منگوا لیے اور ان جراثیم کا علاج نہ کیا جو ہماری مخصوص بیماریوں سے تعلق رکھتے ہیں۔ نتیجہ یہ نکلا کہ ہم نے یورپ کو دیوبندی، بریلوی لڑائیوں کا اکھاڑہ بنا دیا، مسجدوں کے جھگڑے ہوئے، خدا کے گھر سیل کر دیے گئے، عبادت گاہوں کو کتوں کے ذریعے خالی کرایا گیا اور ہم کفار کے سامنے ندامت اور شرمندگی کا عنوان بن کر رہ گئے۔ مجھے ڈر لگ رہا ہے کہ یہاں بھی یہی کھیل کھیلا

جائے گا، اس لیے میں آپ حضرات کو قبل از وقت خبر دار کر رہا ہوں کہ خدا کے لیے ان جراثیم کا کوئی علاج سوچ لیجیے۔ آج جب ہم ایک ملک سے دوسرے ملک جاتے ہیں تو ایئرپورٹ پر ہیلتھ سرٹیفکیٹ چیک کیا جاتا ہے کہ کہیں اس ملک کی بیماریوں کے جراثیم تو ساتھ نہیں لے آئے۔ آپ کو بھی ایسا کرنا ہوگا اور ان جراثیم کو اپنے ملک میں آنے سے روکنا ہوگا، ورنہ آپ اس معاشرہ میں مذاق بن کر رہ جائیں گے اور دین کی خدمت کی بجائے دین کی رسوائی کا ذریعہ ثابت ہوں گے۔

محترم بزرگو! میں آپ کو ایک اصول بتانا چاہتا ہوں۔ ہمارے دین کی تین بنیادیں ہیں، ان کو کسی حالت میں نظر انداز نہ کریں: (۱) قرآن کریم (۲) سنت رسول صلی اللہ علیہ وسلم (۳) صحابہ کرامؓ۔ جو شخص قرآن کو مانتا ہے، حدیث کو تسلیم کرتا ہے اور صحابہ کرام کی پیروی کو قبول کرتا ہے، وہ حنفی ہو، شافعی ہو، مالکی ہو، حنبلی ہو، ظاہری ہو، دیوبندی ہو، بریلوی ہو، اہل حدیث ہو یا کسی بھی مکتب فکر سے تعلق رکھتا ہو، اس سے کسی مسئلہ میں جھگڑا نہ کریں، کسی اختلاف میں نہ الجھیں اور اگر آپ کو کوئی الجھانے کی کوشش کرے تو اسے ٹوک دیں، جھٹک دیں اور اس کی بات کو تسلیم نہ کریں۔

تو میں گزارش یہ کر رہا تھا کہ اپنی اولاد کی دینی تعلیم اور نئی نسل کی مذہب سے وابستگی برقرار رکھنے کے لیے مساجد، مدارس اور دینی مراکز کا اہتمام آپ کی ذمہ داری ہے، لیکن ان مراکز کے لیے افراد کی تلاش میں احتیاط سے کام لیں اور اگر آپ میرا مشورہ مانیں تو ایسے افراد کو درآمد کرنے کا ہی نہ سوچیں، کیونکہ جن افراد نے آپ کے ماحول میں تربیت نہیں پائی، آپ کے ماحول میں کام نہیں کیا، وہ آپ کے ماحول کو سمجھ ہی نہیں سکتے۔ وہ اپنی ذہنی ساخت اور تربیت و ماحول کے سانچے میں آپ کو ڈھالنے کی کوشش کریں گے جن کے نتیجے میں وہ بیماریاں پھر آپ میں عود کر آئیں گی جو خود ہمارے ملکوں میں ہمارے لیے بربادی کا باعث بنی ہوئی ہیں۔ اس کی بجائے آپ یہ کیوں نہیں کرتے کہ اپنی ضروریات کے لیے حفاظ، قراء اور علماء کی کھیپ خود یہاں تیار کریں، ایک معیاری دارالعلوم کے قیام کی طرف توجہ دیں۔ واشنگٹن ریاست ہائے متحدہ امریکہ کا دارالسلطنت ہے۔ یہاں کے مسلمانوں پر زیادہ ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ ایک دارالعلوم بنائیں۔ اس میں حفاظ، قراء اور علماء تیار کریں۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ جو نوجوان اس ماحول میں رہ کر دین کی تعلیم حاصل کریں گے، وہ یہاں کے تقاضوں اور مشکلات کو زیادہ بہتر طور پر سمجھیں گے اور وہ زیادہ مؤثر طریقے سے آپ کی مساجد و مدارس کو آباد کر

سکیں گے۔ میرے سامنے پڑھے لکھے دانشور دوست بیٹھے ہیں، وہ اس نکتہ کو ضرور سمجھ رہے ہوں گے اور وہ یقیناً میری گزارش پر سنجیدگی کے ساتھ غور کریں گے۔

میرے محترم بزرگو! میں نے آپ حضرات کا خاصا وقت لے لیا ہے، لیکن یہ باتیں آپ سے دو ٹوک انداز میں کرنا میں اپنی ذمہ داری سمجھتا ہوں۔ اب پھر ان گزارشات کا خلاصہ دہراتا ہوں۔ میں نے آپ حضرات سے تین گزارشات کی ہیں:

۱. اپنے سے پہلے آنے والے مسلمانوں کی اولاد کے حشر سے سبق حاصل کریں اور اپنے اولاد اور نئی نسل کو مذہب کے ساتھ وابستہ رکھنے کے لیے اپنے گھروں کا ماحول مذہبی بنانے کی کوشش کریں۔
۲. مذہب کے ساتھ اپنی اور اپنی اولاد کی وابستگی کو صحیح رکھنے کے لیے مساجد، دینی مدارس اور دینی مراکز کے نظام کو منظم طریقے سے قائم کریں۔
۳. مذہبی ضروریات کے لیے یہاں کے ماحول اور تقاضوں سے ناواقف افراد کو درآمد کرنے کی بجائے ایک بڑا دارالعلوم قائم کر کے خود یہاں حفاظ، قراء اور علماء کی کھیپ تیار کریں تاکہ وہ یہاں کے ماحول اور تقاضوں کے مطابق آپ حضرات کی بہتر دینی راہنمائی اور خدمت کر سکیں۔

میں آخر میں مسجد الہدیٰ کی انتظامیہ، جمعیۃ المسلمین کے امیر مولانا عبد الحمید اصغر اور ان کے رفقاء کا ایک بار پھر شکریہ ادا کرتا ہوں اور آپ حضرات کا شکر گزار ہوں کہ ہفتہ کے دوران حضرات نے وقت نکال کر اس اجتماع میں تشریف لائے ہیں۔ اللہ رب العزت ہم سب کی حاضری کو قبول فرمائیں اور دین حق کے لیے مثبت اور مؤثر خدمت سرانجام دینے کی توفیق عطا فرمائیں، آمین یا الہ العالمین۔

مغرب میں مقیم مسلمانوں کے لیے دینی لائحہ عمل

امریکی ریاست ورجینیا میں وفاقی دارالحکومت واشنگٹن سے متّصل علاقہ اسپرنگ فیلڈ میں ''دارالہدیٰ'' کے نام سے ایک دینی ادارہ ہے جس میں مسجد، قرآنی تعلیم کا مکتب اور طالبات کے لیے اسکول کے شعبے کام کر رہے ہیں۔ مولانا عبد الحمید کی سربراہی میں ایک ٹیم اس کار خیر میں مصروف ہے۔ موصوف بہاول پور سے تعلق رکھتے ہیں، بنیادی طور پر انجینئر ہیں، لاہور کی انجینئرنگ یونیورسٹی میں استاد رہے ہیں، معروف نقشبندی بزرگ حضرت مولانا حافظ غلام حبیب نقشبندیؒ (آف چکوال) کے خلیفہ مجاز ہیں اور امریکہ آنے کے بعد ایک عرصہ سے دینی خدمات میں سرگرم ہیں۔

گزشتہ ہفتے دارالہدیٰ میں دار العلوم کراچی کے صدر مہتمم حضرت مولانا مفتی محمد رفیع عثمانی تشریف لائے اور یہاں کے مسلمانوں کے ایک بھرپور اجتماع سے خطاب کیا۔ ان کا خطاب مغربی ممالک میں مقیم مسلمانوں کے عمومی حالات اور مسلمانوں کی نئی پود کے دینی مستقبل کے حوالے سے بہت فکر انگیز تھا، اس لیے اس کے اہم نکات آج کے کالم میں پیش کر رہا ہوں۔

انہوں نے کہا کہ مغربی ممالک میں مقیم مسلمانوں کی سب سے پہلی اور بڑی ذمہ داری یہ ہے کہ وہ اس بات کا سنجیدگی سے جائزہ لیں کہ ان ممالک میں رہ کر وہ اسلام کے احکام پر پوری طرح عمل کر سکتے ہیں یا نہیں اور اپنی نئی پود کے دینی مستقبل اور اسلامی تہذیب و ثقافت کے ساتھ اس کے تعلق کا تحفظ کر سکتے ہیں یا نہیں، کیونکہ اگر تو وہ یہ دونوں کام کر سکتے ہیں تو ان کے لیے ان ملکوں میں رہنا شرعاً جائز ہے، اور اگر وہ خود دینی احکام پر عمل نہ کر سکتے ہوں اور اپنی نئی نسل کی اسلام اور دینی اقدار کے ساتھ وابستگی کو برقرار رکھنا ان کے لیے ممکن نہ ہو تو شریعت اسلامیہ اس صورت میں انہیں یہاں رہنے کی اجازت نہیں دیتی، اور ایسے حالات میں ایک مسلمان پر واجب ہو جاتا ہے کہ وہ ہجرت کر کے ایسے علاقے میں جا بسے جہاں وہ اپنے اور اپنی اولاد کے دینی مستقبل کو باقی رکھ سکتا ہو۔

انہوں نے کہا کہ میں نے ان ممالک میں کئی بار سفر کیا ہے اور یہاں مسلمانوں کے حالات کا تفصیل کے ساتھ جائزہ لیا ہے، طویل غور و خوض کے بعد ایک سات نکاتی خاکہ تجویز کیا ہے جس پر عمل

کر کے مغربی ممالک میں مقیم مسلمان اپنا دین و ایمان بھی بچا سکتے ہیں اور اپنی آئندہ نسلوں کے دین و ایمان کا تحفظ بھی کر سکتے ہیں، اس لیے آج کی نشست میں کوئی روایتی یا فرمائشی تقریر کرنے کی بجائے ان سات نکات کی وضاحت کرنا چاہتا ہوں۔

انہوں نے کہا کہ میری پہلی تجویز یہ ہے کہ مغربی ممالک میں رہنے والے مسلمان اپنے بچوں کو عصری تعلیم سے پوری طرح آراستہ کریں اور ان کے لیے اعلیٰ سے اعلیٰ معیار کا اہتمام کریں تاکہ مسلمانوں کی نئی نسل اپنی معاصر سوسائٹی میں کسی احساس کمتری کا شکار نہ ہو اور قومی زندگی کے معاملات میں وہ پورے اعتماد کے ساتھ شریک ہو سکے۔ اس سلسلے میں ایک بڑی الجھن یہ پیش آ سکتی ہے اور پیش آتی ہے کہ یہاں کے اسکولوں اور کالجوں کو ماحول ایسا ہے کہ اس مخلوط ماحول میں مسلمان بچے اور بچیاں خود کو محفوظ نہیں رکھ سکتے۔ اس کا حل یہ ہے کہ مسلمان اپنے اسکول قائم کریں جن کا تعلیمی معیار دوسرے اسکولوں سے کم نہ ہو، لیکن ان میں اسلامی ماحول فراہم کیا جائے اور بنیادی دینی تعلیم بھی نصاب میں شامل کی جائے۔ دینی مدارس بھی ضرور بنائے جائیں اور دار العلوم بھی قائم کیے جائیں لیکن ان سے کہیں زیادہ ضروری ہے کہ وسیع پیمانے پر مسلم اسکول قائم کیے جائیں اور مسلمانوں کی نئی نسل کے لیے اعلیٰ عصری تعلیم کا اسلامی ماحول میں اہتمام کیا جائے۔ میری معلومات کے مطابق یہودیوں نے اس طرح کے ادارے قائم کر رکھے ہیں، اس لیے مجھے امید ہے کہ ایسا کرنا اگرچہ مشکلات ضرور رکھتا ہے، لیکن ناممکن نہیں ہے۔

دوسری تجویز یہ ہے کہ مسلمان بکھر کر رہنے کی بجائے ایک دوسرے کے قریب رہائش اختیار کریں اور رفتہ رفتہ مسلم محلوں کی صورت اختیار کرنے کی کوشش کریں جس طرح برطانیہ میں بہت سے مقامات پر ایسا ہے اور اس کا فائدہ یہ ہے کہ مسلمانوں کی آبادی قریب قریب ہونے کی وجہ سے اسکولوں، مساجد اور دینی مکاتب کا قیام آسان ہو جاتا ہے اور اس کے علاوہ بچوں کو سوسائٹی اور ماحول بھی اپنا مل جاتا ہے۔ یہ کام آسان نہیں ہے اور تھوڑے عرصے میں ہو بھی نہیں سکتا، لیکن اگر اس کی فکر کی جائے اور اس کے لیے مسلمانوں کی ذہن سازی کی جائے تو بہت زیادہ مشکل بھی نہیں ہے۔

تیسری گزارش یہ ہے کہ اپنے آپ کو اللہ تعالیٰ کے نیک بندوں سے وابستہ رکھیں اور کسی بزرگ کے ساتھ اصلاح کا تعلق قائم کریں۔ مغربی معاشرے میں یہ زیادہ ضروری ہے، اس لیے کہ کسی نیک

آدمی اور صالح بزرگ کے ساتھ وابستگی کا احساس بھی انسان کو بہت سے گناہوں سے بچا لیتا ہے اور اللہ تعالیٰ کے نیک بندوں کی صحبت سے برکات کے ساتھ ساتھ تربیت اور رہنمائی بھی ملتی رہتی ہے۔

چوتھی بات یہ ہے کہ اپنے گھروں میں دینی لٹریچر رکھنے کا ضرور اہتمام کریں، قرآن کریم کی کوئی تفسیر، سیرت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرات صحابہ کرام کی زندگیوں کے بارے میں معلوماتی کتابیں اور ان کے علاوہ دینی کے بنیادی مسائل و عقائد، عبادات، اخلاق، معاملات، حقوق اور حلال و حرام کے بارے میں معلوماتی کتابوں کو گھر میں رکھیں۔ آپ کو وقت ملے تو آپ پڑھیں گے، ورنہ گھر والے ان سے استفادہ کریں گے اور کبھی نہ کبھی کوئی ان میں سے کسی کتاب کو اٹھا کر دیکھے گا تو وہ بھی فائدہ سے خالی نہیں ہوگا۔ کتاب موجود ہوگی تو کسی نہ کسی وقت پڑھنے کو جی چاہے گا۔ کبھی بچے دیکھ لیں گے، کوئی آنے جانے والا اس پر نظر ڈال لے گا، اس لیے کوشش کریں کہ آپ کے گھروں میں دینی لٹریچر کی ضروری کتابیں موجود ہوں اور ان کا وقتاً فوقتاً مطالعہ بھی کرتے رہیں۔

پانچویں بات یہ ہے کہ اسلام کی دعوت و تبلیغ کے عمل کے ساتھ خود کو وابستہ رکھیں اور اس کے لیے تھوڑا بہت وقت نکالتے رہیں۔ اس معاشرے میں اسلام کی دعوت و تبلیغ کا سب سے مؤثر طریقہ یہ ہے کہ اپنے اخلاق اور کردار کی اصلاح کریں اور دوسری قوموں کے سامنے اپنے کردار کا ایسا نمونہ پیش کریں کہ وہ اس سے متاثر ہوں۔ دنیا میں اسلام کی دعوت اس سے پہلے بھی اسی راستے سے پھیلی ہے اور آئندہ بھی اخلاق و کردار کا بہتر نمونہ پیش کر کے ہی دنیا کو اسلام کی طرف راغب کیا جا سکتا ہے۔ اسلام کی دعوت و تبلیغ کے حوالے سے تبلیغی جماعت کی محنت بھی خاصی مؤثر ہے اور دنیا بھر میں جاری ہے اور اس وقت اسلام کے حوالے سے ہونے والے کاموں میں سب سے زیادہ وسیع اور مؤثر ہے۔ اس کے ساتھ خود کو وابستہ رکھیں اور گنجائش کے مطابق اس میں وقت لگانے کے علاوہ اس کے ساتھ نصرت کا تعلق قائم رکھیں۔

چھٹی گزارش یہ ہے کہ اپنی اولاد کو انگریزی خوب سکھائیں اور اس میں جتنی مہارت وہ حاصل کر سکیں کم ہے، لیکن اپنی مادری زبان سے انہیں بے گانہ ہونے سے بچائیں۔ زبان صرف زبان نہیں ہوتی، بلکہ تہذیب و ثقافت کا ذریعہ ہوتی ہے۔ مادری زبان سے کٹ جانے کا مطلب اپنی تہذیب و کلچر اور اپنے ماضی سے کٹ جانا ہے۔ اردو، فارسی، بنگالی، عربی یا جو بھی آپ کی زبان ہے، اپنے بچوں کو اس

سے مانوس کریں، گھر میں اپنی زبان و تہذیب کے علاوہ اپنے لٹریچر کے ساتھ ان کا تعلق برقرار رکھیں۔ اگر آپ کے بچے اپنے ماضی سے کٹ گئے تو یہاں کے رنگ میں رنگے جائیں گے اور مغرب کی تہذیب اور کلچر میں ضم ہو کر رہ جائیں گے۔

ساتویں بات یہ ہے کہ حلال روزی کی فکر کریں اور حرام سے بچیں۔ حلال و حرام کا فرق برقرار رکھنا اسلامی شریعت کا حکم بھی ہے اور ہماری زندگی پر اس کے اثرات بھی مرتب ہوتے ہیں۔ اگر آپ حرام سے خدانخواستہ نہیں بچیں گے تو حرام خوراک کا اثر آپ پر تو ہو گا ہی، آپ کی اولاد اور خاندان پر بھی ہو گا۔ یہاں رہ کر حرام سے بچنا مشکل ضرور ہے لیکن ناممکن نہیں۔ سود، شراب، خنزیر اور دیگر حرام چیزوں سے مکمل پرہیز کریں اور کمائی کے لیے بھی حلال ذرائع اختیار کریں۔

مولانا مفتی محمد رفیع عثمانی نے کہا کہ انہیں امید ہے کہ اگر ان باتوں کو سنجیدگی کے ساتھ اختیار کیا جائے تو مغربی ممالک میں مقیم مسلمان نہ صرف اپنے اور اپنی نئی پود کے دین و ایمان اور اخلاق و کردار کی حفاظت کر سکتے ہیں، بلکہ یہاں کے باشندوں کے سامنے ایک بہتر اسلامی زندگی کا نمونہ بھی پیش کر سکتے ہیں جو یہاں رہتے ہوئے ہماری زیادہ اہم ذمہ داریوں میں شامل ہو جاتا ہے۔

دارالہدیٰ کی اس تقریب میں مرد اور عورتیں خاصی تعداد میں شریک تھے۔ یہاں عام طور پر یہی سمجھا جاتا ہے کہ کوئی دینی تقریب ویک اینڈ پر ہی کامیاب ہو سکتی ہے، لیکن منگل کی شام کو ہونے والی اس تقریب میں اتنی بڑی تعداد میں مسلمانوں کی شرکت سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہاں رہنے والے مسلمانوں میں دینی معلومات اور رہنمائی حاصل کرنے کی تڑپ موجود ہے اور نامساعد حالات نے اس میں کمی کی بجائے اضافہ کیا ہے۔

(روزنامہ پاکستان، ۱۰ اکتوبر ۲۰۰۳ء)

برطانوی مسلمان اور مسٹر ڈیوڈ کیمرون کے خیالات

میں نے گزشتہ ایک کالم میں برطانوی کنزرویٹر پارٹی کے لیڈر مسٹر ڈیوڈ کیمرون کے ایک انٹرویو کا ذکر کیا تھا جو انہوں نے ایک مسلمان خاندان کے ساتھ چوبیس گھنٹے گزارنے کے بعد دیا ہے اور میں نے اس کی تفصیلات ۱۲ مئی کو لندن سے شائع ہونے والے ایک اردو روزنامہ میں پڑھی تھیں۔

گزشتہ ماہ برطانیہ میں ہونے والے بلدیاتی انتخابات کے نتائج نے جہاں کنزرویٹو پارٹی کو یہ امید دلا دی ہے کہ وہ آئندہ عام انتخابات میں لیبر پارٹی پر سبقت حاصل کر سکتی ہے، وہاں حکمران لیبر پارٹی بھی نئی صف بندی پر مجبور ہوگئی ہے اور گزشتہ دس برس سے پارٹی کی قیادت کرنے والے جناب ٹونی بلیئر کو وزارت عظمیٰ سے سبک دوشی کا اعلان کرنا پڑا ہے، چنانچہ وہ اپنے اعلان کے مطابق ۲۷ جون کو پارٹی قیادت چھوڑ رہے ہیں اور ان کی جگہ مسٹر گورڈن براؤن باقی ماندہ مدت کے لیے وزیر اعظم کا منصب سنبھالنے کی تیاری کر رہے ہیں۔

اس پس منظر میں ٹوری لیڈر مسٹر ڈیوڈ کیمرون کو مستقبل کے برطانوی وزیر اعظم کی نظر سے دیکھا جا رہا ہے اور وہ بھی اس کے لیے تیاریاں کرتے دکھائی دے رہے ہیں۔ مذکورہ بالا انٹرویو کے ساتھ یہ بتایا گیا ہے کہ مسٹر ڈیوڈ کیمرون نے بالسال ہیتھ (برمنگھم) میں ایک مسلمان خاندان کے ساتھ ان کے گھر میں چوبیس گھنٹے گزارے ہیں اور اس کے حوالے سے اپنے تاثرات کا اظہار کیا ہے جن کے اہم نکات کچھ اس طرح ہیں:

- ڈیوڈ کیمرون نے کہا کہ انہیں مسلمانوں کو بہت قریب سے دیکھنے اور ان کے طرز زندگی کا پتہ چلا ہے جو کسی دوسرے سیاست دان کو نہیں۔ یہ فیملی دوسرے مسلمانوں کی طرح برطانوی معاشرے کی معاشی ترقی کے لیے اہم کردار ادا کر رہی ہے۔
- مسلمانوں کی فیملی اقدار بہت مضبوط ہی۔ اس فیملی سے ملنے کے لیے روزانہ توسیع شدہ فیملی کے جتنے لوگ ایک روز میں آئے، اتنے رشتہ دار ان (کیمرون) سے سال بھر میں نہیں ملتے۔

- اس فیملی کے ساتھ وقت گزارنے کے دوران انہیں مسلمان گروپوں سے مختلف ایشوز پر بحث کا موقع ملا۔ ان میں ایک ایشو دہشت گردی کا موجودہ خطرہ ہے۔ میڈیا میں اسلامی دہشت گردی کی اصطلاح عام استعمال کی جاتی ہے اور جب بھی میڈیا یا سیاست دان اس کے بارے میں بات کرتے ہیں، وہ بہت زیادہ نقصان پہنچاتے ہیں۔ انہوں نے بھی کئی مرتبہ یہ اصطلاح استعمال کی ہے جو مسلمانوں کو بہت ناگوار گزرتی ہے۔
- شمالی آئرلینڈ کو لے لیں۔ وہاں ''آئی آر اے دہشت گرد'' کی اصطلاح استعمال کی جاتی رہی جو انہیں دہشت گرد ظاہر کرتی تھی۔ اگر کیتھولک دہشت گرد یا پروٹسٹنٹ دہشت گرد کی اصطلاح استعمال کی جاتی تو بہت تباہی ہوتی اور اب ہم جو کر رہے ہیں، وہ اسی کے مساوی ہے۔
- جب مسلمان اس قسم کی زبان سنتے یا استعمال ہوتے دیکھتے ہیں تو وہ سمجھتے ہیں کہ ''ان کا مقصد ہم ہیں''۔ جب ڈیوڈ کیمرون سے دریافت کیا گیا کہ وہ کون سی اصطلاح استعمال کرنے کے حق میں ہیں تو انہوں نے کہا کہ القاعدہ دہشت گرد یا گمراہ مسلمان دہشت گردی کی اصطلاح مناسب رہے گی۔ انہوں نے تسلیم کیا کہ حکومت نے اسلامی دہشت گردی کی اصطلاح ختم کرنے کا اعلان کیا تھا، لیکن متبادل کوئی اصطلاح سامنے نہیں لائی گئی تاکہ میڈیا اسے استعمال کر سکے۔
- زبان کے ایشو کے ساتھ ساتھ یہ بات بھی زیرِ بحث آئی کہ میڈیا مسلمانوں کے ایشوز سے کیسے نمٹتا ہے؟ مسلمان اس بات پر بھی برہم ہیں کہ دہشت گردی کے حوالے سے جس قدر چھاپے مارے گئے، ان میں سے کئی کی اطلاع میڈیا کو قبل از وقت دی گئی۔ یہ مسئلہ انہوں نے وزیرِاعظم ٹونی بلیئر کے وقفہ سوالات میں بھی اٹھایا تھا۔ ان میں سے ایک برمنگھم میں چھاپے میں جس میں بعض افراد کو ایک مسلمان فوجی کے اغوا کی سازش میں گرفتار کیا گیا، میڈیا چھاپے سے قبل وہاں موجود تھا۔
- مسلمان کمیونٹی کے اندر ایک مسئلہ یہ تسلیم کرنے کا ہے کہ 7/7 یا 9/11 کی سازشیں کیوں اور کیسے ہوئیں اور ان کے پس منظر میں کون تھا؟ یہ دلیل بھی دی گئی کہ 9/11 سی آئی

اے کی سازش تھی۔ یہودیوں سے کہہ دیا گیا تھا کہ جڑواں ٹاور سے دور رہیں اور جب 7/7 کی بات کی جاتی ہے تو جواب ملتا ہے کہ ہمیں کیا علم ہے کہ خودکش حملہ آوروں کی ویڈیو صحیح ہے یا غلط ہے؟ اگر پانچ یا دس فی صد مسلمانوں کی بھی یہ سوچ ہے تو یہ ایک مسئلہ ہے جس سے نمٹنا پڑے گا۔

- اکثر پاکستانی نژاد مسلمانوں نے انہیں بتایا ہے کہ بیرون ملک، بالخصوص شام، مصر اور اردن سے آنے والے علماء نوجوان نسل کو انتہا پسندی کی ترغیب دے رہے ہیں، لیکن ان سے نمٹنے کے لیے زیادہ کام نہیں ہوا۔ اس سب کا اثر مسلمانوں کے معاشرے میں ادغام (اور cohesion) پر پڑ رہا ہے۔ اس سے ملک دس سال پیچھے چلا گیا ہے جبکہ بعض مسلمانوں کا کہنا ہے کہ وہ مسلسل محسوس کرتے ہیں کہ ان کو شک کی نگاہ سے دیکھا جا رہا ہے اور عام برطانوی طرزِ زندگی میں پہلے سے زیادہ خیر مقدم نہیں کیا جاتا۔ اس کی ایک بڑی وجہ یہ ہے کہ کمیونٹی کے لوگ جب ایک دوسرے سے ملتے ہیں تو وہ اس ایشو پر بات نہیں کرتے۔ یہ ضروری ہے کہ مسلمان اس ایشو پر آپس میں بحث کریں اور اس کے مختلف پہلوؤں کو سمجھیں۔
- ان کے نزدیک مسلمان بچوں کی تسلیم اور اسکولوں میں ان کی ناقص کارکردگی بھی ایک بڑا مسئلہ ہے۔ جہاں زیادہ مسلمان بچے ہیں، وہاں کے نتائج ۱۶ سال کے بچوں کے لیے پانچ فیصد جبکہ اچھے جی سی ایس ای کے نتائج پندرہ فیصد ہیں جو کسی طور قابلِ قبول نہیں۔ اسکولوں کے محنتی گورنر اس کا الزام اسکولوں میں اس کلچر کو دیتے ہیں کہ وہ کم نتائج کو تسلیم کر لیتے ہیں اور یہ کہ غریب علاقوں میں بچوں سے بہتر کارکردگی کی توقع نہیں کی جا سکتی۔ اس سوچ کو تبدیل کرنا ہوگا اور ایسے اسکولوں کو بند کرنا بہتر ہے۔
- ان کے نزدیک معاشرہ میں ادغام ''ٹو وے اسٹریٹ'' ہے۔ ہم اقلیتی طبقہ سے کہہ سکتے ہیں کہ وہ مجموعی طور پر برطانوی معاشرے میں مدغم ہونے کے لیے بہت محنت کریں، لیکن ہمیں یہ تسلیم کرنا ہوگا کہ ایسا اس وقت تک نہیں ہوگا جب تک انہیں مدغم کرنے کے لیے دل کشی نہیں ہوگی۔ لوگوں کو دھمکا کر معاشرے کا حصہ نہیں بنایا جا سکتا، لیکن معاشرہ میں

شراب نوشی، منشیات، سماج مخالف رویہ، غیر مہذبانہ طرزِ زندگی زیادہ دل کشی کا باعث نہیں بن سکتے، اسے تبدیل کرنے کی ضرورت ہے۔

برطانیہ کی ایک بڑی سیاسی پارٹی کے لیڈر اور مستقبل کے متوقع وزیراعظم کے خیالات کو اس قدر تفصیل کے ساتھ پیش کرنے کا مقصد یہ ہے کہ برطانوی قومی سیاست میں مسلمانوں کے حوالے سے اس وقت خیالات اور احساسات کا جو مدوجزر پایا جاتا ہے، وہ سامنے رہے اور مستقبل میں جن امکانات کا نقشہ دکھائی دے رہا ہے، اس پر ایک نظر ڈال لی جائے۔

جہاں تک برطانیہ میں مقیم مسلمانوں کے برطانوی معاشرہ میں مدغم ہونے کا مسئلہ ہے، یہ اس وقت کا سب سے بڑا سوال ہے جو برطانوی سیاسی راہ نماؤں اور دانش وروں کو مسلسل پریشان رکھے ہوئے ہے، اس لیے کہ دنیا کے مختلف ممالک سے برطانیہ آکر آباد ہو جانے والے مسلمانوں کے بارے میں جو توقعات اب سے ربع صدی قبل وابستہ کر لی گئی تھیں کہ یہ بالآخر مقامی سوسائٹی اور کلچر میں ضم ہو جائیں گے اور ان کا الگ تشخص قائم نہیں رہے گا، وہ توقعات پوری نہیں ہوئیں بلکہ نسبتاً زیادہ آزاد ماحول میں اعتماد کے ساتھ رہنے کی وجہ سے مسلمانوں کی اپنے مذہب اور مشرقی کلچر کے ساتھ وابستگی میں زیادہ نکھار پیدا ہوا ہے۔

مجھے برطانیہ جاتے ہوئے بائیس سال ہو گئے ہیں اور اس دوران شاید ہی کوئی ایسا سال گزرا ہے کہ میں نے سال کے دوران کم از کم ایک دفعہ برطانیہ کا سفر نہ کیا ہو۔ اب سے بیس برس قبل میں نے وہاں کے ایک مسلمان بزرگ سے دریافت کیا تھا کہ برطانیہ میں چرچ فروخت ہو کر مساجد میں تبدیل ہو رہے ہیں اور سینکڑوں چرچوں میں اب پانچ وقت نماز اور روزانہ قرآن کریم کی تعلیم ہوتی ہے تو یہاں کے مذہبی راہ نما اس حوالے سے کیا سوچتے ہیں اور مسیحی مذہبی قیادت کا اس سلسلے میں ردعمل کیا ہے؟ انہوں نے بتایا کہ ایک مسیحی عالم دین سے اس مسئلے پر ان کی بات ہوئی ہے اور ان کا کہنا ہے کہ ہمیں اس بارے میں کوئی پریشانی نہیں ہے، اس لیے کہ یہاں آنے والے مسلمانوں کی موجودہ نسل مذہب سے وابستگی رکھتی ہے، اگلی نسل لبرل ہوگی اور اس سے اگلی نسل اسی طرح مذہب سے لاتعلق ہوگی جس طرح مقامی سوسائٹی مذہب سے لاتعلق ہے، مگر ان کی یہ توقع پوری نہیں ہوئی اور جوں جوں وقت گزر رہا ہے، مسلمانوں کی مذہب سے وابستگی بڑھ رہی ہے۔ جبکہ عالمی سطح پر مسلمانوں کی مظلومیت، مشرق

وسطیٰ میں مغربی حکمرانوں کے گزشتہ پون صدی کے کردار، مشرقی یورپ میں سوویت یونین کی پسپائی کے بعد مسلمانوں کے وحشیانہ قتل عام اور عراق اور افغانستان میں مغربی ممالک کی جارحیت نے مسلمانوں میں جو ردعمل پیدا کیا ہے، اس نے نئی نسل کو پرانی نسل سے کہیں زیادہ مذہب کے ساتھ جوڑ دیا ہے۔

مسٹر ڈیوڈ کیمرون اس بات کو تسلیم کر رہے ہیں کہ وہ برطانیہ میں آنے والے مسلمانوں کے مقامی معاشرہ میں مدغم ہونے کے لیے زیادہ پرکشش ماحول پیدا نہیں کر سکے اور مقامی آبادی باہر سے آنے والوں کو اپنے ساتھ ثقافتی طور پر ایڈجسٹ کرنے کے لیے خود کچھ نہیں کر رہی۔ اس کے اسباب سے بھی مسٹر ڈیوڈ کیمرون اچھی طرح واقف دکھائی دیتے ہیں کہ فیملی اقدار، شراب، منشیات اور غیر مہذبانہ طرز زندگی کے حوالے سے پایا جانے والا تفاوت مسلمانوں کے اس معاشرے میں مدغم ہونے میں رکاوٹ ہے۔ اس سے یہ بات پوری طرح واضح ہو گئی ہے کہ مسلمان دنیا کے جس خطے میں بھی جائے اور عملی طور پر دین سے کتنا ہی دور کیوں نہ ہو، وہ اپنی مذہبی اور ثقافتی اقدار سے دست برداری اختیار نہیں کر سکتا۔ اس امر کا مشاہدہ صرف برطانیہ میں نہیں، بلکہ امریکہ، کینیڈا اور یورپ کے دیگر ممالک میں بھی بخوبی کیا جا سکتا ہے۔

اس پس منظر میں مسٹر ڈیوڈ کیمرون اور دیگر مغربی دانش وروں سے یہ گزارش کرنے کو جی چاہ رہا ہے کہ انہیں اس تجربہ سے سبق حاصل کرنا چاہیے اور مسلمانوں کو مغربی کلچر میں بہر حال مدغم کرنے کی بے جا رٹ چھوڑ کر معروضی حقائق کا اعتراف کرتے ہوئے مسلمانوں کے جداگانہ تہذیبی تشخص اور ثقافتی امتیاز کو تسلیم کر لینا چاہیے۔ اس کے سوا اس مسئلہ کا اور کوئی حل نہیں ہے کہ ویسٹرن کلچر کو دنیا کا واحد گلوبل کلچر بنانے اور ہر صورت میں دنیا سے اسے آئیڈیل کلچر تسلیم کرانے کی مہم پر نظر ثانی کی جائے اور اسلامی کلچر کے وجود اور اس کے زندہ رہنے کے حق کو تسلیم کیا جائے۔ زندہ تو وہ ہے ہی اور اس نے اپنی زندگی کا ثبوت خود مغربی معاشرہ میں فراہم کر دیا ہے تو پوری دنیا میں اسے شکست دینے کا خواب آخر کیسے پورا ہو سکتا ہے؟

(روزنامہ پاکستان، ۱۲ جون ۲۰۰۷ء)

مسلم پرسنل لا اور موجودہ عالمی صورت حال

۲۰ اگست ۱۹۹۹ء کو مرکزی جامع مسجد گلاسگو (برطانیہ) میں جمعیۃ اتحاد المسلمین کے زیر اہتمام ایک نشست میں ''مسلم پرسنل لا'' کے حوالے سے کچھ گزارشات پیش کرنے کا موقع ملا۔ ان کا خلاصہ قارئین کی خدمت میں پیش کیا جا رہا ہے۔

کچھ عرصہ سے یورپ میں مختلف حلقوں کی طرف سے یہ آواز بلند ہو رہی ہے کہ مغربی ممالک میں مقیم مسلمانوں کو پرسنل لا میں اپنا جداگانہ تشخص تسلیم کرانے کے لیے آواز بلند کرنی چاہیے۔ سرکردہ علماء کرام کی یورپی کونسل نے دو ماہ قبل جرمنی میں معروف اسکالر ڈاکٹر محمد یوسف قرضاوی کی زیر صدارت اجلاس منعقد کر کے اس تجویز کی طرف دینی اداروں کو توجہ دلائی ہے اور برطانوی دارالامراء کے مسلمان رکن لارڈ نذیر احمد نے بھی ایک حالیہ تقریر میں اس کا تذکرہ کیا ہے۔ اس لیے اس بارے میں کچھ معروضات پیش کرنا چاہ رہا ہوں، لیکن قبل اس کے کہ غیر مسلم اکثریت کے ملکوں میں مسلم اقلیتوں کے لیے مسلم پرسنل لا کی اہمیت پر کچھ عرض کروں، خود مسلم ممالک میں جہاں مسلمان اکثریت میں ہیں اور جہاں مسلمانوں کی اپنی حکومتیں قائم ہیں، مسلم پرسنل لا کی صورت حال کے بارے میں گزارش کرنا ضروری سمجھتا ہوں، کیونکہ ہمارے شخصی قوانین اور فیملی لاز خود مسلم ممالک میں خطرے میں ہیں اور مسلم حکومتوں پر بین الاقوامی طور پر دباؤ مسلسل بڑھ رہا ہے کہ وہ اپنے ممالک میں عمومی قوانین اور خاص طور پر پرسنل لا یعنی نکاح وطلاق اور وراثت سے متعلقہ قوانین کو بین الاقوامی معیار کے مطابق بنانے کے لیے قرآن وسنت کے بیان کردہ ضابطوں میں تبدیلی کریں اور انہیں عالمی معیار کے مطابق بنائیں۔

اس سلسلے میں بین الاقوامی معیار سے مراد اقوام متحدہ کا بنیادی حقوق کا چارٹر اور اس کی تشریح میں اقوام متحدہ کے مختلف اداروں اور کانفرنسوں کی قراردادیں ہیں جن کی بہت سی باتیں نکاح وطلاق اور وراثت کے بارے میں قرآن وسنت کے صریح احکام سے متصادم ہیں اور اسی لیے بین الاقوامی اداروں اور لابیوں کی طرف سے مسلم ممالک سے یہ کہا جا رہا ہے کہ جب وہ اقوام متحدہ کے رکن ہیں اور اقوام

متحدہ کے چارٹر پر دستخط کر چکے ہیں تو انہیں اس کے مطابق اپنے قوانین میں ترمیم کرنی چاہیے اور اقوام متحدہ کے چارٹر اور اس کے اداروں کے فیصلوں کا احترام کرنا چاہیے۔

اقوام متحدہ کے چارٹر کی بنیاد پر مروجہ بین الاقوامی قوانین اور قرآن و سنت کے شرعی احکام میں کیا فرق اور تضاد ہے؟ اس کو واضح کرنے کے لیے دو تین باتوں کا بطور مثال ذکر کرنا ضروری ہے۔ مثلاً بین الاقوامی قوانین کے مطابق کوئی بھی مرد اور عورت رنگ، نسل اور مذہب کے کسی امتیاز کے بغیر آپس میں آزادانہ مرضی سے شادی کر سکتے ہیں، مگر اسلام میں مسلمان عورت کا نکاح کسی غیر مسلم مرد سے نہیں ہو سکتا اور مسلمان مرد بھی اہل کتاب کے علاوہ کسی اور غیر اسلامی مذہب سے تعلق رکھنے والی خاتون سے شادی نہیں کر سکتا۔ یہ ایک بنیادی فرق ہے جس کا اظہار آپ کے سامنے اس وقت ہوتا ہے جب یہاں کسی مغربی ملک میں کوئی مسلمان لڑکی کسی غیر مسلم نوجوان کے ساتھ عدالت کے ذریعے شادی کر لیتی ہے اور آپ عدالت سے رجوع کرتے ہیں کہ اسلام اس شادی کی اجازت نہیں دیتا تو یہاں کی عدالت آپ کا اعتراض سننے کے لیے تیار نہیں ہوتی اور مروجہ بین الاقوامی معیار کے مطابق نہ صرف اس شادی کو جائز قرار دے دیتی ہے بلکہ یہاں کا سسٹم اس شادی کو مکمل تحفظ بھی فراہم کرتا ہے۔

اسی طرح نکاح کا رشتہ ختم کرنے میں مروجہ بین الاقوامی قانون خاوند اور بیوی کا یکساں حق تسلیم کرتا ہے کہ دونوں میں جو بھی چاہے، اس رشتے کو ختم کر سکتا ہے، جبکہ اسلام نے نکاح کا رشتہ غیر مشروط طور پر ختم کرنے کا حق خاوند کو دیا ہے جسے قرآن کریم نے "بیدہ عقدة النکاح" کے ساتھ بیان کیا ہے اور عورت کو یہ حق براہ راست اور غیر مشروط طور پر نہیں دیا گیا، بلکہ خلع کے عنوان سے عورت کا یہ حق عدالتی پراسیس کے ذریعے تسلیم کیا گیا ہے۔ اس کی وجوہ کچھ بھی ہوں، مگر یہ حقیقت ہے کہ اسلام عورت کو نکاح کا رشتہ ختم کرنے کا حق غیر مشروط طور پر نہیں دیتا اور یہ بات مروجہ بین الاقوامی قانون سے متصادم ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہاں برطانیہ میں کوئی مسلمان خاتون اپنے خاوند کو عدالت کے ذریعے طلاق دے دے اور عدالت اس کی طلاق کو تسلیم کر لے تو کوئی عدالت خاوند کا یہ اعتراض سننے کے لیے تیار نہیں ہوگی کہ چونکہ شرعی قوانین کی رو سے طلاق دینے کا حق صرف اس کا ہے، اس لیے یہ طلاق واقع نہیں ہوتی۔ چنانچہ قانونی طور پر وہ طلاق واقع ہو جائے گی اور یہاں کا سسٹم

اس طلاق کا تحفظ بھی کرے گا۔

اس کے علاوہ وراثت کے معاملے میں بھی قرآن کریم نے حصوں کی جو تقسیم کی ہے، وہ واضح طور پر غیر مساویانہ ہے۔ خاوند کے فوت ہو جانے کی صورت میں بیوی کو ایک صورت میں آٹھواں اور دوسری صورت میں چوتھا حصہ ملتا ہے اور بیٹی کا حصہ ہر صورت میں بیٹے سے نصف ہوتا ہے، جبکہ بین الاقوامی قانون اس سلسلے میں برابری کا متقاضی ہے اور قرآن کریم کے بیان کردہ غیر مساویانہ حصوں کو غیر منصفانہ قرار دیتا ہے، لہٰذا جب وراثت کے قوانین کو بین الاقوامی معیار کے مطابق بنانے کی بات کی جاتی ہے تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ قرآن کریم کے بیان کردہ حصوں پر نظر ثانی کر کے ان میں ترمیم کی جائے۔

یہ تین مثالیں میں نے اس لیے دی ہیں تاکہ یہ بات واضح ہو جائے کہ نکاح، طلاق اور وراثت کے باب میں قرآن و سنت کے بیان کردہ قوانین آج کے مروجہ بین الاقوامی قوانین سے متصادم ہیں اور اقوام متحدہ کے مختلف اداروں سمیت بین الاقوامی حلقوں کی طرف سے مسلم ممالک پر یہ دباؤ مسلسل بڑھ رہا ہے کہ وہ اپنے قوانین میں ردوبدل کر کے انہیں بین الاقوامی معیار کے مطابق بنائیں۔ اس پر مسلم ممالک اور حکومتوں کا ردعمل تین طرح کا ہے:

ایک ردعمل ترکی کا ہے کہ اس نے پون صدی قبل ہی قرآن و سنت کے احکام سے علانیہ دست برداری اختیار کر کے مغربی قوانین کو قبول کر لیا تھا اور وہ اپنے اس فیصلے پر سختی کے ساتھ قائم ہے، بلکہ اگر ترکی میں اس حوالے سے قرآن و سنت کے احکام کی طرف واپسی کا معمولی سے رجحان بھی نظر آنے لگتا ہے تو ریاستی قوانین اور ادارے اسے روکنے کے لیے پوری طرح سرگرم ہو جاتے ہیں۔

دوسرا ردعمل امارت اسلامی افغانستان میں طالبان کی اسلامی حکومت کا ہے کہ وہ قرآن و سنت کے احکام کے ساتھ بے لچک وابستگی قائم رکھتے ہوئے اقوام متحدہ کے چارٹر اور اس کی بنیاد پر تشکیل پانے والے مروجہ بین الاقوامی قوانین کو قبول کرنے سے صاف انکار کر رہے ہیں اور ان کا یہ واضح انکار بھی اس بات کی ایک بڑی وجہ ہے کہ افغانستان کے ایک بڑے حصے پر کنٹرول اور دارالحکومت کا قبضہ حاصل کرنے اور اپنے زیر تسلط علاقے میں مکمل امن قائم کر لینے کے باوجود ان کی حکومتوں کو اقوام متحدہ میں تسلیم نہیں کیا جا رہا اور انہیں اقوام متحدہ میں افغانستان کی نشست سے محروم رکھا جا رہا ہے۔

ترکی اور افغانستان کے فیصلے تو دوٹوک اور غیر مبہم ہیں جو سب کے سامنے ہے، لیکن ایک تیسرا رد عمل بھی ہے جو پاکستان سمیت بیشتر مسلم ممالک کا ہے کہ قرآن و سنت پر عمل درآمد کا ٹائٹل بھی ہاتھ میں رہے اور مغرب کو بھی مطمئن رکھا جائے۔ اس کے لیے ایک الگ راستہ اختیار کیا گیا کہ قرآن و سنت کے احکام و قوانین کی ایسی تعبیر و تشریح کی جائے جس سے قوانین کو مغرب کے معیار کے قریب تر لایا جائے۔ ہمارے ہاں اس سلسلے میں پہلی کوشش صدر محمد ایوب خان مرحوم کے دور میں ہوئی تھی جس کی متعدّد دفعات کو ملک کے تمام مکاتب فکر کے علماء کرام نے متفقہ طور پر قرآن و سنت سے متصادم قرار دیا، لیکن اس کے باوجود وہ نافذ ہوئے اور ابھی تک ریاستی قوت کے بل بوتے پر مسلسل نافذ العمل ہیں۔ ان قوانین میں سے صرف ایک مثال دوں گا کہ نکاح کے فارم میں خاوند کی طرف سے عورت کو طلاق کا حق تفویض کر دینے کا خانہ رکھ کر ہم نے مغرب کو مطمئن کرنے کی کوشش کی کہ ہم نے پاکستان میں عورت کو بھی طلاق کا حق دے دیا ہے۔ اسی سے باقی قوانین کے رخ کا بھی اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

اب اقوام متحدہ کی قاہرہ اور بیجنگ میں ہونے والی خواتین کانفرنسوں کے بعد ان کی قراردادوں اور فیصلوں کی روشنی میں اگلے مرحلوں کی طرف پیش رفت ہو رہی ہے۔ اس سلسلے میں سپریم کورٹ آف پاکستان کے ایک حاضر سروس جسٹس کی سربراہی میں قائم ہونے والے ''خواتین حقوق کمیشن'' نے کچھ عرصہ قبل جو سفارشات پیش کی ہیں، وہ قانون سازی کے لیے وزارت قانون کی میز پر ہیں اور ان میں واضح طور پر سفارش کی گئی ہے کہ عورت کو بھی مرد کی طرح طلاق کا مکمل حق دیا جائے اور وراثت کے حصوں کی غیر مساویانہ تقسیم ختم کی جائے۔ اس کے ساتھ ہی عدالتوں میں بھی اس نوعیت کے فیصلے ہونے لگے ہیں۔ مثلاً لاہور ہائیکورٹ نے ایک فیصلے میں خلع کو عورت کا مساوی حق طلاق قرار دیا ہے اور سندھ ہائی کورٹ نے ایک فیصلے میں وراثت میں بیٹی کے نصف حصے کو انصاف کے منافی قرار دے دیا ہے اور اس طرح ہم نے قرآن و سنت کا ٹائٹل برقرار رکھتے ہوئے بین الاقوامی معیار کے قریب آنے کے لیے شرعی احکام کی نئی اور من مانی تعبیر و تشریح کا راستہ اختیار کر لیا ہے۔

اس سلسلے میں ایک بات کی وضاحت ضروری سمجھتا ہوں کہ بین الاقوامی قوانین کے معیار کو پورا کرنے اور مغربی اداروں کو مطمئن کرنے کے لیے قرآن و سنت کے احکام و قوانین کی نئی تعبیر و تشریح کا یہ عمل مسلم ممالک کی حکومتوں اور حکومتی اداروں کا ہے، مگر عام مسلمانوں اور ملت اسلامیہ کی رائے

عامہ نے اس عمل کو قبول نہیں کیا کیونکہ ہر مسلمان ملک میں دینی حلقے اور عام مسلمان قرآن و سنت کے احکام و قوانین کی اسی تعبیر و تشریح پر سختی سے عمل پیرا ہیں جو چودہ سو سال سے اجتماعی طور پر چلی آ رہی ہے اور وہ اس میں کسی قسم کا ردوبدل قبول کرنے کے لیے تیار نہیں ہے۔ دینی ادارے ہر جگہ مزاحمت کر رہے ہیں، چنانچہ ابھی بنگلہ دیش سے آئے ہوئے ہمارے پرانے بزرگ مولانا محی الدین خان نے مجھے لندن میں بتایا کہ بنگلہ دیش کے ہائی کورٹ نے کومیلا کے ایک مقدمہ میں طلاق یافتہ خاتون کو سابقہ خاوند کی طرف سے زندگی بھر نان و نفقہ دیے جانے کا حکم صادر کر دیا تو سرکردہ علماء کرام نے شریعت کونسل قائم کر کے اسے سپریم کورٹ میں چیلنج کیا اور عدالت عظمیٰ نے علماء کرام کا موقف سننے کے بعد ہائی کورٹ کے فیصلے کو قرآن و سنت کے منافی قرار دے دیا۔ الغرض یہ ایک الگ کشمکش ہے جو مسلمان حکومتوں اور دینی حلقوں کے درمیان جاری ہے اور عام مسلمان ہر ملک میں قرآن و سنت کے حوالے سے علماء کرام اور دینی حلقوں کے ساتھ ہیں۔

یہ قدرے تفصیل میں نے اس لیے عرض کی ہے تاکہ آپ حضرات کے سامنے وہ صورت حال واضح ہو جو اس وقت مسلم ممالک میں نکاح و طلاق اور وراثت کے اسلامی قوانین کے حوالے سے مسلمانوں کو درپیش ہے اور اسی بنیاد پر میں نے عرض کیا ہے کہ مسلم پرسنل لاز خود مسلم ممالک میں خطرے میں ہیں اور انہیں مغربی ممالک کے قوانین سے ہم آہنگ کرنے کے لیے ایک مسلسل عمل جاری ہے اور صرف پرسنل لاز اور خاندانی قوانین کی بات نہیں، بلکہ قرآن و سنت کے دیگر احکام و قوانین بھی مغربی دباؤ کی زد میں ہیں۔ مثلاً اقوام متحدہ کے چارٹر کی ایک دفعہ میں کہا گیا ہے کہ کسی مجرم کو دی جانے والی سزا اہانت، ذہنی اذیت اور جسمانی تشدد سے خالی ہونی چاہیے، یعنی سزا ایسی ہو کہ اس میں مجرم کی توہین نہ ہوتی ہو، وہ ذہنی اذیت کا شکار نہ ہو اور اسے جسمانی تشدد کا نشانہ بھی نہ بننا پڑے۔ اس بنیاد پر ہاتھ کاٹنے، سنگسار کرنے، کوڑے مارنے اور کھلے بندوں عام لوگوں کے سامنے سزا دینے کے سب قواعد و ضوابط اس بین الاقوامی معیار کے منافی قرار پاتے ہیں۔ جرائم کی شرعی سزاؤں کی بین الاقوامی اداروں کی طرف سے جو مخالفت ہوتی ہے، اس کی وجہ یہی ہے اور جرائم کی شرعی سزاؤں کو بعض سیاسی لیڈروں کی طرف سے وحشیانہ اور ظالمانہ قرار دیے جانے کا پس منظر بھی یہی ہے۔ اب مغرب والوں کا یہ موقف تو سمجھ میں آتا ہے کہ بہت سے اسلامی احکام و قوانین آج کے بین الاقوامی

معیار کے منافی ہیں، اس لیے اگر مسلم ممالک کو بین الاقوامی برادری کے ساتھ رہنا ہے تو انہیں اس کے احکام وضوابط بھی قبول کرنا ہوں گے۔ اسی طرح بین الاقوامی اداروں کی یہ بات بھی سمجھ میں آتی ہے کہ جن مسلم ممالک نے اقوام متحدہ کی رکنیت قبول کر کے اس کے چارٹر پر دستخط کیے ہوئے ہیں، انہیں اس بین الاقوامی معاہدہ کی پابندی کرنی چاہیے۔ البتہ ان مسلم حکومتوں کا طرز عمل سمجھ سے بالاتر ہے جو بین الاقوامی معیار اور قرآن وسنت کے قوانین کو ساتھ ساتھ لے کر چلنے کی کوشش کر رہی ہیں اور اس کوشش میں شرعی احکام کا حلیہ بگاڑ دینا چاہتی ہیں۔

اس سلسلے میں ہمیں ملیشیا کے وزیر اعظم مہاتیر محمد کی وہ بات بہت پسند آئی ہے جو انہوں نے اقوام متحدہ کی پچاس سالہ تقریبات کے موقع پر مسلم حکومتوں کے سامنے رکھی تھی۔ ان کا کہنا تھا کہ مسلمانوں کے بارے میں اقوام متحدہ کے دوہرے طرز عمل پر احتجاج کے طور پر مسلم ممالک کو اقوام متحدہ کی پچاس سالہ تقریبات کا بائیکاٹ کرنا چاہیے اور اقوام متحدہ کے چارٹر پر نظر ثانی کر کے اسے از سر نو مرتب کرنے کا مطالبہ کرنا چاہیے، کیونکہ یہ چارٹر پچاس سال قبل ترتیب دیا گیا تھا جب اکثر ممالک غلامی کی حالت میں تھے اور آج صورت حال بدل گئی ہے، اس لیے عالم اسلام کے موقف اور پوزیشن کو سامنے رکھتے ہوئے اس چارٹر پر نظر ثانی کی ضرورت ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ اگرچہ اس وقت مہاتیر محمد کی یہ بات مسلم حکومتوں نے قبول نہیں کی، لیکن یہی موقف حقیقت پسندانہ ہے اور مسلم ممالک کو بالآخر اسی موقف پر آنا ہوگا۔

یہ تو ہے صورت حال مسلم پرسنل لا کے حوالے سے خود مسلم ممالک کی۔ اب آئیے ان ممالک کی طرف جہاں مسلمان اکثریت میں نہیں ہیں۔ اس سلسلے میں بھارت کے مسلمان مبارک باد کے مستحق ہیں کہ وہ تمام تر مشکلات اور رکاوٹوں کے باوجود اپنے خاندانی قوانین کا تحفظ کیے ہوئے ہیں اور حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کی سربراہی میں تمام مکاتب فکر کا مشترکہ "آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ" پوری قوت کے ساتھ مسلمانوں کے پرسنل لا کے تحفظ کی جنگ لڑ رہا ہے۔ بھارت میں "کامن سول کوڈ" کے نفاذ کے نام سے مسلمانوں کے جداگانہ شخصی قوانین کو ختم کرنے کی مہم ایک عرصہ سے چل رہی ہے اور مسلمانوں پر دباؤ ڈالا جا رہا ہے کہ وہ قومی یک جہتی کی خاطر نکاح وطلاق اور وراثت میں اپنے جداگانہ مذہبی قوانین سے دست بردار ہو کر "کامن سول کوڈ" کو قبول کر لیں اور یہاں بھی کامن

سول کوڈ سے مراد وہی بین الاقوامی قوانین اور معیار ہے جس کا تذکرہ میں نے پہلے اقوام متحدہ کے چارٹر کے حوالے سے کر دیا ہے، مگر انڈین مسلمان اس معاملے میں بالکل بے لچک ہیں اور پرسنل میں اپنے مذہبی احکام و قوانین کے تحفظ کا پوری طرح عزم کیے ہوئے ہیں جس پر وہ بلاشبہ تبریک، تحسین اور حوصلہ افزائی کے مستحق ہیں۔

جہاں تک مغربی ممالک کا تعلق ہے، میں نے چند ایسے مسائل کا ابتدا میں ذکر کر دیا ہے جن کا سامنا آپ حضرات کو یہاں درپیش ہے، مثلاً مسلمان لڑکی کے غیر مسلم لڑکے سے شادی، مسلمان بیوی کا عدالتی سسٹم کے ذریعے خاوند کو طلاق دینا اور وراثت کے حصوں کی غیر مساویانہ تقسیم۔ اس قسم کے مسائل آپ حضرات کو مسلسل پیش آتے ہیں اور آپ جب مذہب اور اپنی روایات کے حوالے سے بات کرتے ہیں تو آپ کی بات قطعی طور پر نہیں سنی جاتی۔ لڑکیاں گھروں سے بھاگ جاتی ہیں، لڑکے باغی ہو جاتے ہیں، انہیں اس سلسلے میں ریاستی سسٹم کی طرف سے مکمل تحفظ اور پشت پناہی مہیا ہوتی ہے اور اس کے نتیجے میں سینکڑوں مسلم خاندان تتر بتر ہو کر رہ جاتے ہیں، جبکہ عالمی صورت حال یہ ہے کہ پرسنل لا اور کلچر میں ہر قوم کے جداگانہ تشخص کے حق کو تسلیم کیا گیا ہے۔ امریکہ میں یہودیوں کو پرسنل لاز بلکہ بزنس لاز میں بھی اپنے مذہبی قوانین پر عمل کرنے اور ان کے لیے الگ عدالتیں قائم کرنے کا حق حاصل ہے۔ یہاں برطانیہ میں بھی یہودیوں کو جداگانہ پرسنل لا کا تحفظ حاصل ہے، اس لیے مسلمانوں کو بھی پرسنل لا میں اپنے جداگانہ تشخص کو تسلیم کرانے کے لیے جدوجہد کرنی چاہیے۔ میں نہیں سمجھتا کہ یہاں کی حکومت کو اس سے کوئی انکار ہوگا، کیونکہ اسی برطانیہ نے جب برصغیر پاکستان، بھارت، بنگلہ دیش اور برما پر مشتمل متحدہ ہندوستان میں مغلوں سے اقتدار حاصل کیا تھا تو مغلوں کے دور سے چلا آنے والا عدالتی نظام ختم کر دیا گیا تھا، اس وقت متحدہ ہندوستان کی عدالتوں میں فتاویٰ عالمگیری نافذ تھا اور اس کے مطابق مقدمات کے فیصلے ہوتے تھے جسے انگریزوں نے اقتدار حاصل کرنے کے بعد ختم کر کے انگریزی قوانین نافذ کر دیے تھے جو اب تک چلے آ رہے ہیں، لیکن انہوں نے پرسنل لا یعنی نکاح و طلاق اور وراثت کے باب میں مسلمانوں کا یہ حق اس وقت بھی بحال رکھا تھا کہ وہ ان معاملات میں اپنے مذہبی قوانین پر عمل کر سکتے ہیں اور ”محمڈن لا“ کے نام سے پرسنل لا اور خاندانی قوانین میں مسلمانوں کے جداگانہ تشخص کو تسلیم کیا گیا تھا۔ اس لیے اس دور میں جبکہ ہم

برطانوی استعمار کے غلام تھے اور برطانیہ کی نوآبادی تھے، مگر ہمارے اس حق سے انکار نہیں کیا گیا تو آج برطانیہ میں رہنے والے مسلمان غلام نہیں بلکہ برابر کے شہری ہیں تو ان کے لیے اس حق کو تسلیم نہ کرنے کی کوئی وجہ سمجھ میں نہیں آتی۔

اس کے ساتھ میں یہ بھی عرض کرنا چاہوں گا کہ مسلم ممالک میں غیر مسلموں کو پرسنل میں جداگانہ تشخص فراہم کیا گیا ہے۔ خود پاکستان کے دستور میں ان کا یہ حق تسلیم کیا گیا ہے اور سب سے پہلے علماء کرام نے ۲۲ متفقہ دستوری نکات میں اس اصول کو تسلیم کرنے کا اعلان کیا تھا کہ پرسنل لا میں تمام اقلیتوں کو اپنے مذہبی احکام پر عمل کرنے کی آزادی ہوگی، اس لیے جب پاکستان میں عیسائی اقلیت اور دیگر اقلیتوں کو یہ حق دینے سے انکار نہیں کیا گیا تو برطانیہ اور دیگر مغربی ممالک میں مسلمانوں کا یہ حق تسلیم کرنے میں بھی کوئی حجاب نہیں ہونا چاہیے۔

ان گزارشات کے ساتھ میں مغربی ممالک میں مقیم مسلمانوں سے یہ عرض کروں گا کہ وہ اپنے خاندانی نظام کے تحفظ کی طرف توجہ دیں اور پرسنل لا میں اپنا جداگانہ تشخص تسلیم کرانے کے لیے منظم جدوجہد کا آغاز کریں، کیونکہ اس کے بغیر وہ خاندانی نظام کے حوالے سے درپیش ان مسائل اور مشکلات سے نجات حاصل نہیں کر سکیں گے جنھوں نے مغرب میں رہنے والے ہر حساس اور دیندار مسلمان خاندان کو پریشان کر رکھا ہے، اور جدوجہد سے میرا مقصد لڑائی جھگڑا اور بے تکا شور و غوغا نہیں ہے، بلکہ مراد یہ ہے کہ معقولیت اور منطق کے ساتھ اپنا موقف متعلقہ اداروں اور شخصیات کے سامنے پیش کیا جائے، اس کے لیے لابنگ کی جائے، بریفنگ کی جائے اور رائے عامہ کو مؤثر طریقے سے ہموار کر کے مغرب کی حکومتوں کو اس کے لیے آمادہ کیا جائے کہ وہ مسلمانوں کے ایک جائز اور مسلمہ حق کو تسلیم کرتے ہوئے اپنے اپنے ملکوں میں اسے دستوری تحفظ فراہم کریں۔

(روزنامہ اوصاف، ۳۱ اگست ۱۹۹۹ء)

جبری شادیاں اور برطانیہ کی مسلم کمیونٹی

ان دنوں برطانیہ میں جبری شادیوں پر بحث کا بازار گرم ہے اور مختلف عدالتوں میں مقدمات کے ساتھ ساتھ اخبارات و جرائد و محافل و مجالس میں بھی گفتگو کا سلسلہ جاری ہے۔ مغرب میں لڑکا اور لڑکی اپنا شریک حیات چننے میں آزاد ہیں اور اس میں ماں باپ کا کوئی اہم رول نہیں ہوتا، جبکہ ہمارے ہاں رشتے کا چناؤ اور شادی کا اہتمام عام طور پر ماں باپ کرتے ہیں، اس لیے ان روایات کا ٹکراؤ مغرب میں رہنے والے مسلمان خاندانوں کے لیے لاینحل مسئلے کی صورت اختیار کرتا جارہا ہے۔

یہاں پیدا ہونے والے اور پرورش پانے والے لڑکے اور لڑکیاں اپنا شریک حیات خود چننے کا اختیار حاصل کرنا چاہتے ہیں اور اس میں بسا اوقات مذہب کی قید بھی باقی نہیں رہتی، اس لیے اسلامی اور مشرقی روایات کے حامل خاندانوں کے لیے اس صورت حال کو قبول کرنا مشکل ہو جاتا ہے اور وہ اس کا حل زبردستی کی صورت میں کرنا چاہتے ہیں جس میں حکومتی ادارے مداخلت کرتے ہیں اور ماں باپ کا ساتھ دینے کے بجائے لڑکی اور لڑکے کو تحفظ فراہم کرتے ہیں جس سے ماں باپ اکثر و بیشتر بے بسی کی تصویر بن کر رہ جاتے ہیں۔

جہاں تک رشتے کے چناؤ اور شادی کے اہتمام کا تعلق ہے، اسلام اس میں بالغ لڑکے اور لڑکی کی رائے کا حق تسلیم کرتا ہے اور ماں باپ کو جبر کی اجازت نہیں دیتا، لیکن اس سلسلے میں چند اصولوں کو ذہن میں رکھنا ضروری ہے۔ پہلی بات یہ ہے کہ اسلام مرد اور عورت میں خفیہ تعلقات کی سرے سے نفی کرتا ہے اور قرآن کریم نے "ولا متخذات اخدان" کہہ کر لڑکے اور لڑکی کے درمیان خفیہ مراسم کو سرے سے حرام کاری قرار دیا ہے۔ ہاں اس سے ہٹ کر لڑکا یا لڑکی نکاح کے لیے کسی پسند کا اظہار کرتے ہیں تو دونوں کے مسلمان ہونے کی صورت میں اسلام نے اس کا بھی احترام کیا ہے، چنانچہ ابن ماجہ میں صحیح سند کے ساتھ حضرت جابر بن عبداللہؓ سے روایت ہے کہ ایک شخص جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آیا اور عرض کیا کہ اس کی کفالت میں ایک یتیم لڑکی ہے جس کے لیے شادی کے دو پیغام آئے ہیں۔ ایک خواہش مند مالدار ہے اور دوسرا تنگ دست غریب ہے۔ اس نے کہا کہ

ہم اس کا نکاح مالدار شخص سے کرنا چاہتے ہیں جبکہ وہ لڑکی غریب شخص کو پسند کرتی ہے۔ اس پر جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ "لم یر للمتحابین مثل النکاح" (محبت کرنے والوں کے لیے نکاح جیسی کوئی چیز نہیں ہے)۔

گویا نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس ارشاد گرامی کے ساتھ لڑکی کی پسند کے احترام کی ہدایت فرمائی ہے، لیکن اس کے ساتھ ہی نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے "کفو" کے حوالہ سے لڑکی کے لیے ماں باپ اور خاندان کی عزت و وقار کا لحاظ رکھنے کو بھی ضروری قرار دیا ہے اور اس طرح ماں باپ کے وقار و عزت اور لڑکی اور لڑکے کی آزادی اور پسند کے درمیان ایک توازن قائم کر دیا۔ چنانچہ علامہ سید محمد انور شاہ کشمیری کی صراحت کے مطابق اس سلسلہ میں امام ابوحنیفہؒ کا موقف یہ ہے کہ بالغہ و عاقلہ لڑکی پر اس کے باپ کو کسی رشتہ اور نکاح کے لیے جبر کرنے کا حق حاصل نہیں ہے، لیکن لڑکی کو بھی یہ حق نہیں ہے کہ وہ کسی ایسی جگہ شادی کرے جو اس کے ماں باپ اور خاندان کے لیے معاشرتی طور پر باعث عار ہو اور وہ اس میں اس سوسائٹی کی معروف اقدار و روایات کے حوالے سے خفت محسوس کریں۔

یہ تو ایک مسئلہ کی اصولی حیثیت ہے، مگر یہاں صورت حال اس سے مختلف ہے اور ایسی شادیوں کو بھی جبری قرار دیا جانے لگا ہے جو ماں باپ نے لڑکیوں کو اعتماد میں لے کر کیں، ان لڑکیوں نے اس وقت اس کو قبول کر لیا لیکن بعد میں کسی وجہ سے اختلاف پیدا ہو گیا تو لڑکی نے یہ موقف اختیار کر لیا کہ اس کی شادی اس کی مرضی کے خلاف ہوئی تھی، اس لیے اسے جبری شادی قرار دے کر منسوخ کیا جائے، حالانکہ اس سلسلہ میں اسلام کا واضح اصول ہے کہ اگر لڑکی کو ماں باپ کے طے کیے ہوئے رشتہ پر اعتراض ہے تو بالغ ہونے کی صورت میں اسے اس وقت اس رشتہ کو مسترد کرنے کا اختیار حاصل ہے، لیکن اگر اس نے یہ حق استعمال نہیں کیا اور اس سے دستبردار ہو کر شادی کو عملاً قبول کر لیا تو اب وہ نکاح شرعاً منعقد ہو گیا ہے اور اس کے بعد اسے دوبارہ یہ اختیار واپس نہیں ملے گا۔

اس سلسلہ میں حال ہی میں لندن کے ایک اخبار نے گلاسکو کے ایک پرانے کیس کے بارے میں رپورٹ شائع کی ہے جس کے مطابق نسرین اکمل نامی لڑکی کا نکاح اس کے ماں باپ نے پاکستان جا کر کیا۔ اس کے بعد اس کا خاوند برطانیہ آیا اور وہ دونوں میاں بیوی کی حیثیت سے رہے حتیٰ کہ ان کے تین

بچے ہوئے اور تین بچوں کی ولادت کے بعد میاں بیوی میں اختلاف پیدا ہو گیا جس پر نسرین اکمل نے عدالت میں دعویٰ دائر کر دیا کہ چونکہ اس کی شادی اس کی رائے کے خلاف ہوئی تھی، اس لیے اسے ''جبری شادی'' قرار دے کر منسوخ کیا جائے۔ چنانچہ برطانوی عدالت نے اس کے موقف کو تسلیم کرتے ہوئے شادی کو سرے سے منسوخ قرار دے دیا جس سے اس کے تین بچوں کی ولدیت بھی قانونی طور پر ختم ہو گئی۔ رپورٹ میں اس خاتون کا بیان شامل ہے جس میں اس نے اس بات کا شکوہ کیا ہے کہ اس واقعہ کو سات سال کا عرصہ گزر جانے کے باوجود مسلم کمیونٹی میں اسے نفرت کی نگاہ سے دیکھا جا رہا ہے، اس کے بچوں کو ''حرامی'' کہا جاتا ہے اور وہ خوف وہراس کی فضا میں زندگی بسر کر رہی ہے، اس لیے وہ کسی ایسے علاقہ میں منتقل ہونا چاہتی ہے جہاں مسلمانوں کی تعداد نہ ہونے کے برابر ہو۔

یہ صرف ایک کیس کا مسئلہ نہیں، اس قسم کے سینکڑوں واقعات اس سوسائٹی میں بکھرے پڑے ہیں اور مسلمان خاندانوں کی مشکلات میں اضافہ کا سبب بن رہے ہیں۔ ہمارے نزدیک اس مسئلہ کے حل کے لیے دو باتوں کا اہتمام ضروری ہے: ایک اس بات کا کہ مسلمان خاندان اپنے بچوں کی دینی تعلیم و تربیت اور انہیں اسلامی معاشرت کے ساتھ ذہنی طور پر منسلک رکھنے کے لیے ابتدا سے توجہ دیں، ان کی ذہن سازی اور تربیت کا اہتمام کریں اور انہیں اسلامی کلچر اور روایات سے روشناس کرائیں۔ دوسری بات یہ ہے کہ یہاں کی مسلم کمیونٹی اپنے کلچر کے تحفظ کے لیے اجتماعی جدوجہد کرے، خاندانی نظام اور پرسنل لاز میں جداگانہ قوانین اور سسٹم کے حصول کے لیے مسلمان منظم ہو کر آواز اٹھائیں۔ اپنے کلچر اور شخصی قوانین کا تحفظ ہر مذہب کے پیروکاروں کا حق ہے۔ اگر اسلامی جمہوریہ پاکستان میں مسیحی کمیونٹی کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ اپنے شخصی قوانین اور خاندانی نظام کے تحفظ کے لیے آواز اٹھائے اور دستور پاکستان میں اس کا یہ حق باقاعدہ طور پر تسلیم کیا گیا ہے تو برطانیہ میں رہنے والے مسلمانوں کا بھی یہ حق ہے کہ انہیں خاندانی زندگی میں اپنے مذہب کے شخصی قوانین پر عمل کرنے کے لیے عدالتی تحفظ فراہم کیا جائے اور اس کے لیے جداگانہ عدالتی سسٹم مہیا کیا جائے تاکہ وہ نکاح طلاق اور وراثت کے خاندانی معاملات میں اسلامی تعلیمات کے مطابق عمل کر سکیں۔ اس کے لیے مسلم سربراہ کانفرنس کے جدہ سیکرٹریٹ اور دنیا بھر کی مسلم حکومتوں کی وزارت ہائے مذہبی امور کی بھی

ذمہ داری بنتی ہے کہ وہ برطانوی حکومت کو اس کے لیے باضابطہ طور پر تجاویز بھجوائیں اور یہاں رہنے والے مسلمانوں کے کلچر اور خاندانی نظام کے تحفظ کے لیے اپنا اثر و رسوخ استعمال کریں۔

(الشریعہ، ستمبر ۱۹۹۹ء)

شرعی قوانین اور برطانیہ کا قانونی نظام

برطانیہ میں پروٹسٹنٹ فرقہ کے سربراہ آرچ بشپ آف کنٹربری ڈاکٹر روون ولیمز کا یہ بیان عالمی سطح پر موضوع بحث بنا ہوا ہے کہ برطانیہ میں رہنے والے مسلمانوں خاندانی معاملات اور مالیاتی مسائل میں اپنے شرعی قوانین پر عمل کا حق ملنا چاہیے اور اس مقصد کے لیے اسلامی شرعی قوانین کو ملک کے قانونی نظام کا حصہ بنایا جانا چاہیے۔ اس سلسلے میں جو تفصیلات مختلف اخبارات کے ذریعے سامنے آئی ہیں، ان کے مطابق ڈاکٹر روون کا کہنا ہے کہ:

- نکاح وطلاق اور وراثت وغیرہ جیسے خاندانی معاملات میں اسلام کے شرعی احکام پر عمل کرنا مسلمانوں کا حق ہے اور انہیں قانونی طور پر یہ حق ملنا چاہیے۔
- مغربی راہ نماؤں کا یہ کہنا درست نہیں کہ اسلامی قوانین انسانی حقوق کے منافی ہیں، البتہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ اسلامی قوانین مغربی راہ نماؤں کے تصورات کے خلاف ہیں، لیکن دنیا کے ہر قانون کے لیے ان کے تصورات سے مطابقت رکھنا ضروری نہیں ہے۔
- اگر ہمیں اسلام کے بعض قوانین مثلاً ہاتھ کاٹنے، سنگسار کرنے اور کوڑے مارنے وغیرہ پر اعتراض ہے تو بعض اسلامی احکام ایسے بھی ہیں جو بہت اچھے ہیں۔ ہمیں ان کا بھی تذکرہ کرنا چاہیے جیسے اسلام کے خاندانی احکام و قوانین، اور انہیں برطانوی قوانین میں شامل کرنے میں بھی کوئی حرج نہیں ہے۔
- برطانیہ میں یہودیوں کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ اپنے خاندانی اور مالیاتی مسائل و تنازعات کا فیصلہ اپنے مذہبی احکام کے مطابق کر سکتے ہیں تو مسلمانوں کو بھی یہ حق حاصل ہونا چاہیے اور قانون کو سب کے لیے یکساں ہونا چاہیے۔

ڈاکٹر روون ولیمز آرچ بشپ آف کنٹربری کی حیثیت سے دنیا بھر کے پروٹسٹنٹ مسیحیوں کے سب سے بڑے مذہبی راہ نما سمجھے جاتے ہیں، اس لیے ان کے اس بیان نے مغرب کے فکری اور ثقافتی حلقوں میں ہلچل پیدا کر دی ہے اور مختلف فوروں پر اس سلسلے میں بحث و تمحیص جاری ہے۔ وزیر

اعظم گورڈن براؤن کے ایک ترجمان نے اس پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا ہے کہ برطانیہ میں صرف برطانوی اقدار کے مطابق قوانین نافذ ہوں گے، اسلامی شریعت نافذ نہیں کی جا سکتی، جبکہ برطانیہ کے سابق وزیر داخلہ ڈیوڈ بلنکٹ نے کہا ہے کہ ہمارے ملک میں شرعی قوانین کا نفاذ نہ صرف جمہوری اور فکری طور پر غلط ہے، بلکہ یہ معاشرتی ہم آہنگی کے لیے بھی تباہ کن ثابت ہوگا۔ ایک خبر کے مطابق ملکہ برطانیہ ایلزبتھ دوم بھی اس صورت حال پر خاصی پریشان ہیں، کیونکہ وہ چرچ آف انگلینڈ کی آئینی سربراہ ہیں اور وہ سمجھتی ہیں کہ ڈاکٹر روون ولیمز کے اس بیان سے چرچ کی اتھارٹی بھی متاثر ہو سکتی ہے۔ ادھر ڈاکٹر ولیمز نے بعض حلقوں کی طرف سے بیان واپس لینے اور مستعفی ہونے کے مطالبے کو مسترد کر دیا ہے اور ایک بار پھر کہا ہے کہ وہ اپنے موقف پر قائم ہیں۔

عالم اسلام میں عام طور پر اس بیان کے بارے میں خیر مقدمی جذبات کا اظہار کیا جا رہا ہے۔ جامعہ ازہر کے سربراہ الشیخ عبد الفتح عالم نے مسیحی راہ نما کے بیان کا خیر مقدم کرتے ہوئے کہا ہے کہ آرچ بشپ نے یہ بیان دے کر مختلف مذاہب اور تہذیبوں کے درمیان ڈائیلاگ اور مذہبی آزادی کو فروغ دینے کی بات کی ہے اور اس سے مسلم ممالک میں ایک اچھا تاثر پیدا ہوگا۔ گزشتہ ہفتہ کے روز لندن میں ورلڈ اسلامک فورم نے بھی اس سلسلے میں ایک سیمینار منعقد کیا جو ابراہیم کمیونٹی کالج وائٹ چیپل میں فورم کے چیئرمین مولانا محمد عیسیٰ منصوری کی زیر صدارت منعقد ہوا اور اس میں مولانا مفتی برکت اللہ، مفتی عبد المنتقم سلہٹی، ڈاکٹر کامران رعد اور دیگر دانش وروں نے خطاب کیا۔

مولانا محمد عیسیٰ منصوری نے اپنے خطاب میں کہا کہ برطانیہ میں کم و بیش پچیس لاکھ مسلمان آباد ہیں اور یورپ میں مجموعی طور پر یہ تعداد کروڑوں میں ہے، جبکہ بلغاریہ میں مسلمانوں کی آبادی کا تناسب تیس فی صد سے زائد بیان کیا جاتا ہے اور یہ مسلمان اپنے مذہب اور ثقافت کے ساتھ واضح کمٹمنٹ رکھتے ہیں، اس لیے انہیں اب زیادہ دیر تک نظر انداز نہیں کیا جا سکتا اور مغربی حکومتوں کو جلد یا بدیر مسلمانوں کے حقوق کی طرف توجہ دینا ہوگی۔ انہوں نے کہا کہ نکاح و طلاق اور خاندانی معاملات میں اپنے مذہب پر عمل کرنا مسلمانوں کا ایک جائز حق ہے جس کے لیے وہ ایک عرصے سے آواز بلند کر رہے ہیں اور اب آرچ بشپ آف کنٹربری نے بھی اس حق کی حمایت کر دی ہے، اس لیے انصاف کا تقاضا ہے کہ برطانوی حکومت اس سلسلے میں مزید لیت و لعل سے کام لینے کے بجائے مسلمانوں کو ان کا

یہ جائز حق دے۔

راقم الحروف نے بھی گزشتہ دنوں متعدّد اجتماعات میں اس مسئلے پر اظہار خیال کیا ہے جس کے چند اہم نکات یہ ہیں:

ڈاکٹر روون ولیمز کی طرف سے برطانوی مسلمانوں کے لیے نکاح و طلاق اور مالیات کے حوالے سے ان کے شرعی قوانین کو برطانوی قوانین میں شامل کرنے کے مطالبہ پر مغرب کے سیکولر حلقوں کی بے چینی اور اضطراب کی اصل وجہ یہ ہے کہ اسلامی شریعت کے جن احکام و قوانین کے نفاذ کو خود مسلم ممالک میں روکنے کی مسلسل کوشش کی جا رہی ہے اور مغربی حکومتیں اس سلسلے میں فریق کا کردار ادا کر رہی ہیں، ان شرعی قوانین کے نفاذ کا برطانیہ میں مطالبہ شروع ہو گیا ہے اور اس کی حمایت ایک عالمی سطح کے مسیحی مذہبی راہ نما نے بھی کر دی ہے۔ اس سے جہاں مغربی ممالک میں مسلمانوں کے پرسنل لاز کے فروغ کی طرف پیش رفت ہوگی، وہاں مسلمان ممالک میں بھی نفاذ شریعت کی جدوجہد کو تقویت ملے گی اور شرعی قوانین کے نفاذ کی راہ میں مصنوعی طور پر پیدا کی جانے والی رکاوٹیں کمزور ہوں گی، حالانکہ ڈاکٹر روون ولیمز نے کوئی نئی بات نہیں کی، بلکہ برطانوی مسلمانوں کے لیے اسی حق کا مطالبہ کیا ہے جو اسلامی جمہوریہ پاکستان میں مسیحیوں اور دیگر اقلیتوں کو آج سے ساٹھ سال قبل دے دیا گیا تھا۔

پاکستان میں مسیحیوں سمیت تمام اقلیتوں کو اپنے نکاح و طلاق اور وراثت وغیرہ کے تنازعات و مسائل اپنے مذہب کے احکام کے مطابق طے کرنے کا دستوری طور پر حق حاصل ہے اور وہ اس حق کو عملی طور پر استعمال کر رہی ہیں، جبکہ پاکستان کے تمام مکاتب فکر کے ۳۱ سرکردہ علماء کرام نے اپنے متفقہ ۲۲ دستوری نکات میں اس اصول کو نصف صدی قبل باضابطہ طور پر شامل کر لیا تھا کہ تمام اقلیتوں کو پرسنل لاز میں اپنے مذہبی احکام پر عمل کا حق حاصل ہوگا۔ مغربی دانش وروں کو یہ زمینی حقیقت پیش نظر رکھنی چاہیے کہ پاکستان اپنی غیر مسلم اقلیتوں کے لیے اس حق کا نصف صدی قبل اہتمام کر چکا ہے جو برطانیہ کے مسلمان ابھی تک اپنے لیے مانگ رہے ہیں اور اب آرچ بشپ آف کنٹربری نے بھی اس کی تائید کر دی ہے، اس لیے یہ کوئی نئی بات نہیں ہے بلکہ ایک جائز اور طے شدہ حق کی یاد دہانی ہے جس پر نہ صرف برطانیہ بلکہ پورے یورپ کی دیگر حکومتوں کو بھی فوری اور سنجیدہ توجہ دینی چاہیے۔

پھر مسلمانوں کے لیے پرسنل لاز اور مالیاتی امور میں اپنی شریعت کے مطابق فیصلے کرنا کا یہ دستوری اور قانونی حق امریکی دستور میں بھی موجود ہے۔ یہ حق اصلاً یہودیوں کو دیا گیا ہے جس کے تحت امریکہ کے یہودی اپنے خاندانی اور مالیاتی تنازعات کے فیصلے اپنی مذہبی عدالتوں سے کراتے ہیں اور ان کے فیصلوں کو امریکی سپریم کورٹ کی طرف سے تحفظ حاصل ہوتا ہے، جبکہ شکاگو، اٹلانٹا، نیویارک اور دیگر کئی شہروں میں مسلمانوں نے بھی اس دستوری حق کو استعمال کرتے ہوئے اپنی شرعی عدالتیں قائم کر رکھی ہیں۔ وہ شرعی پنچایت کے طور پر مقدمات کے فیصلے کرتی ہیں اور امریکہ کا عدالتی نظام ان فیصلوں کو تسلیم کرتا ہے۔

اس پس منظر میں جہاں ہم آرچ بشپ آف کنٹر بری ڈاکٹر روون ولیمز کے اس بیان کا خیر مقدم کرتے ہوئے ان کا شکریہ ادا کرتے ہیں، وہاں اس بیان پر ناک بھوں چڑھانے والے بعض مسلمان دانش وروں سے بھی یہ عرض کرنا چاہتے ہیں کہ وہ مغرب پرستی کے خول سے باہر جھانکتے ہوئے زمینی حقائق پر بھی ایک نظر ڈال لیں اور مسلمانوں کے ایک جائز حق کے مطالبہ پر خواہ مخواہ جھینپنے کی بجائے اس کی حمایت کریں۔

(روزنامہ پاکستان، ۷ مارچ ۲۰۰۸ء)

مساجد و مدارس اور دینی تعلیم کا نظام

برطانیہ میں مسلم فرقہ واریت کے اثرات

اس وقت میں برطانیہ کے شہر شیفیلڈ میں مفتی محمد یونس کشمیری کی رہائش گاہ میں بیٹھا ہوں۔ لندن سے شائع ہونے والا اردو روزنامہ ''ملت'' (۲۶ اگست) میرے سامنے ہے۔ اس کے صفحہ اول پر ایک خبر کی تین کالمی سرخی یہ ہے:

''نیلسن میں برائر فیلڈ کی مسجد میں ہنگامہ کرنے پر ۱۶ افراد کو جرمانے کی سزا۔''

خبر کے مطابق مذکورہ مسجد میں کچھ عرصہ قبل امامت کے مسئلہ پر دو فریقوں میں تنازعہ ہوا جو باہمی تصادم کی شکل اختیار کر گیا۔ مسجد کچھ عرصہ کے لیے بند کر دی گئی۔ پنج وقتہ نمازیں بھی مسلمان اس عرصے میں ادا نہ کر سکے۔ تنازعہ عدالت میں گیا۔ مجسٹریٹ نے چھ افراد کو دو دو سو پونڈ جرمانہ اور ڈیڑھ ڈیڑھ سو پونڈ خرچہ کورٹ کی سزا سنانے کے علاوہ دو دو سال کے لیے پابند امن کر دیا ہے۔ خبر کے مطابق مجسٹریٹ نے سزا سناتے وقت ملزموں کو مخاطب کر کے کہا کہ:

''تم لوگوں نے جو کچھ کیا، وہ باعث شرم تھا۔ ہو سکتا ہے آپ اپنے مذہبی مسائل اس طرح حل کرتے ہوں، مگر ہمارا طریقہ ایسا نہیں ہے۔ تم لوگ آپس میں ایک دوسرے کو اپاہج کر لو، ہمیں کوئی پروا نہیں، لیکن یہاں کھلے بندوں ایسا دنگا فساد برداشت نہیں کیا جائے گا۔ ہم توقع رکھتے ہیں کہ تم لوگ ہمارے قانون کی پابندی بھی کرو گے۔ میں تم کو جیل بھیج سکتا تھا، لیکن تم پر نرمی برتتا ہوں۔ بے شک مجھ پر ایسی نرمی برتنے کا الزام لگایا جائے گا۔''

برطانیہ میں مساجد پر قبضہ کے لیے ہلڑ بازی کا سلسلہ کافی پرانا ہو چکا ہے اور یہاں کے باشعور مسلمان اس پر خاصے پریشان ہیں۔ متعدّد مساجد مسلمانوں کے مختلف فرقوں کے درمیان تصادم کے بعد برطانوی پولیس نے کتوں کے ذریعے خالی کرائی ہیں اور بہت سی مساجد سیل کر دی گئیں جن کے مقدمات کا فیصلہ یہاں کی عدالتوں نے کیا۔ مساجد پر مخالفانہ قبضے کی روایت اصل میں برصغیر پاک و ہند سے چلی آ رہی ہے۔ پاکستان، بھارت اور بنگلہ دیش سے جو مسلمان برطانیہ اور یورپ کے دیگر

ممالک میں آکر آباد ہوئے ہیں، ان کی تعداد خاصی ہے اور یہ بات انتہائی خوش کن ہے کہ ان میں مذہبی رجحانات نمایاں ہیں۔ سینکڑوں مساجد نئی بنی ہیں جن میں ایک بڑی تعداد ایسی مساجد کی ہے جو عیسائیوں کے گرجے خرید کر بنائی گئی ہیں اور عیسائی اکثریت کے ممالک میں جہاں خود عیسائی آبادی کے گرجے ان کی مذہب بیزاری کی وجہ سے ویران پڑے ہیں اور مقامی آبادی کی عملی زندگیوں کے ساتھ ان کا کوئی تعلق باقی نہیں رہا، وہاں کی مساجد کی آبادی اور مسلمانوں کی مذہبی دلچسپی ایک اچھا اور مثبت تاثر اجاگر کرتی ہے اور یوں محسوس ہوتا ہے کہ یہاں کی مذہب بیزار آبادی جب اپنی خود ساختہ آزادی کے عروج تک پہنچنے کے بعد فطری ردعمل سے بیدار ہوگی تو اسے واپسی کے لیے ایک زندہ اور متحرک کی صورت میں اسلام ہی کا سامنا درپیش ہوگا، اور کچھ بعید نہیں کہ اگر اس وقت مسلمان اپنے آپ کو صحیح اسلامی معاشرہ کی صورت میں پیش کر سکے تو یہ بات یہاں کی آبادی کے اجتماعی قبول اسلام کا ذریعہ بن جائے، لیکن ان خوش گوار احساسات اور تاثرات کے ساتھ مسلمانوں کے باہمی فرقہ وارانہ تنازعات کی شدت اور مساجد پر مخالفانہ قبضے کے افسوس ناک واقعات کا منظر سامنے آتا ہے تو مستقبل کی خوش گوار امیدوں کو منظر دھندلانے لگتا ہے۔

راقم الحروف کو برطانیہ میں آتے ہوئے چار سال ہوگئے ہیں۔ ہر سال عالمی ختم نبوت کانفرنس کے موقع پر حاضری کا موقع ملتا ہے اور یہاں لندن کے علاوہ مختلف دیگر شہروں میں جانے کا اتفاق ہوتا ہے۔ یہاں کی عمومی صورت حال میں میری سوچی سمجھی رائے یہ ہے کہ برطانوی معاشرہ اسلام کی تبلیغ و دعوت کا ایک وسیع اور ہموار میدان ہے۔ اس معاشرے میں خاندانی زندگی کی تباہی، نفسانفسی کا عالم اور امن و سکون کے لیے مصنوعی سہاروں کی تلاش ایک پرامن اجتماعی زندگی کے لیے ان لوگوں کی تڑپ اور بڑھتی ہوئی پیاس کی غمازی کرتی ہے، ایک ایسی پیاس جسے صرف اسلام کا فطری اجتماعی نظام ہی بجھا سکتا ہے، لیکن اسلام کی دعوت و تبلیغ کی راہ میں یہاں سب سے بڑی رکاوٹ مسلمانوں کے فرقہ وارانہ اختلافات، بالخصوص دیوبندی بریلوی کشیدگی ہے جس کے دل خراش اور سنگ دلانہ مظاہروں نے یہاں کی مقامی آبادی کے سامنے اسلام اور مسلم معاشرہ کا ایک ایسا نقشہ پیش کیا ہے جسے کشش، پسندیدگی یا قبولیت کا باعث کسی طرح بھی قرار نہیں دیا جا سکتا۔ اس کشیدگی کا اہتمام کرنے والے عناصر خواہ کوئی ہوں، انہوں نے اس کے ذریعے اپنے فرقہ وارانہ جذبات کی وقتی تسکین کا سامان شاید فراہم

کر لیا ہو مگر اسلام کی قطعاً کوئی خدمت نہیں کی بلکہ اسلام کی دعوت و تبلیغ کی راہ میں رکاوٹ کھڑی کر دی ہے۔

وطن عزیز پاکستان میں نفاذ اسلام کی جدوجہد کے بارے میں بھی میری دوٹوک رائے یہی ہے کہ اس جدوجہد کی کامیابی میں سب سے بڑی رکاوٹ فرقہ وارانہ تنازعات بالخصوص دیوبندی بریلوی کشمکش ہے۔ اگر پاکستان کی اکثریتی آبادی اہل السنۃ والجماعۃ سے تعلق رکھنے والے تمام مکاتب فکر یا کم از کم دیوبندی اور بریلوی مسلک کے علماء اپنی فرقہ وارانہ ترجیحات کی قربانی دیتے ہوئے نفاذ اسلام کی جدوجہد کے لیے مشترکہ حکمت عملی اختیار کر لیں تو باقی تمام رکاوٹوں کو عبور کر لینا ان کے لیے کوئی مشکل بات نہیں ہوگی،، لیکن اس مقصد کے لیے تمام مکاتب فکر کے سرکردہ علماء کرام کو اپنے اپنے مکتب فکر کے افراد کے ساتھ لیڈر شپ کی بجائے قیادت کا رویہ اختیار کرنا ہوگا۔

ہمارے ہاں لیڈر شپ کا مفہوم یہ ہے کہ اپنے حلقہ، طبقہ یا گروہ کے اجتماعی رجحان کو محسوس کر کے لیڈر خود کو ان کے ساتھ ہم آہنگ کر لیتا ہے اور اسی رو میں خود بھی بہہ جاتا ہے، مگر قیادت کا معنی یہ نہیں ہے، بلکہ قائد اپنے زیر قیادت افراد کے رجحانات کو سامنے رکھتے ہوئے ان میں سے سب سے بہتر رجحان کا تعین خود کرتا ہے اور پھر سب کو اپنے ساتھ لے کر آگے بڑھ جاتا ہے۔ عربی زبان میں قائد اور سائق کے دو لفظ استعمال ہوتے ہیں۔ ریگستان میں اونٹوں کی لمبی قطار کے ساتھ دو شخص ہوتے ہیں۔ ایک قطار کے آگے ہوتا ہے جس کے ہاتھ میں اس ساری قطار کی مہار ہوتی ہے۔ اسے قائد کہتے ہیں اور وہ اپنی مرضی کے راستے پر قطار کو لیے چلتا رہتا ہے۔ دوسرا شخص قطار کے پیچھے پیچھے ہوتا ہے جسے سائق کہا جاتا ہے اور اس کا کام قطار کے پیچھے چلنا اور گری پڑی چیزوں کو سنبھالنا ہوتا ہے۔ ہمارے ہاں سائق کے عمل کو لیڈر شپ سمجھ لیا گیا ہے جو سیاسی حلقوں کے ساتھ ساتھ مذہبی مکاتب فکر میں بھی رواج پذیر ہو گیا ہے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ بڑے بڑے باشعور مذہبی راہنما بھی معاملات کی سنگینی اور اجتماعی تقاضوں کا احساس رکھنے کے باوجود محض اپنے پیروکاروں کے رجحانات کا سامنا نہ کر سکنے کی وجہ سے وہ راستہ اختیار نہیں کر پاتے جس کے لیے خود ان کا اپنا ضمیر انہیں مجبور کر رہا ہوتا ہے۔

بات بہت دور نکل گئی ہے، مگر برائر فیلڈ کی مسجد کے تنازعے میں برطانوی مجسٹریٹ کے ریمارکس نے قلب و ذہن کو جس تلخی سے دوچار کیا ہے، اس کی شدت دل کا یہ ابال نکالنے کے باوجود کم نہیں

ہوئی۔ میں تلخی کے اس احساس کو کم کرنے اور دل کو وقتی بہلاوا دینے کے لیے برطانوی مجسٹریٹ کو مختلف عیسائی فرقوں کے درمیان کشیدگی، بالخصوص کیتھولک اور پروٹسٹنٹ فرقوں کے خوں ریز تصادم کی تاریخ یاد دلا سکتا ہوں اور طعنے کے انداز میں یہ بھی کہہ سکتا ہوں کہ مذہبی تنازعات کو خوں ریزی کے ذریعے حل کرنے کا سبق ہم نے آپ ہی لوگوں سے سیکھا ہے، لیکن یہ کوئی مثبت اور فطری ردعمل نہیں ہوگا اور نہ ہی اسے صحت مندانہ ذہنیت کی علامت سمجھا جائے گا۔ اس لیے میں تمام مکاتب فکر کے سرکردہ علماء کرام سے دست بستہ گزارش کروں گا کہ وہ صورت حال کی سنگینی کا احساس کریں اور برائر فیلڈ کی مسجد کے تنازعے میں برطانوی مجسٹریٹ کے ریمارکس کو نوشتہ دیوار سمجھتے ہوئے حالات کی اصلاح کے لیے کوئی ایسا باوقار اور متوازن طرزِ عمل اختیار کریں جو مسلم ممالک میں نفاذِ اسلام اور مغربی ممالک میں تبلیغ اسلام کے لیے مفید اور معاون ثابت ہو سکے۔

(ہفت روزہ ترجمان اسلام، ۱۸ اکتوبر ۱۹۸۸ء)

مغربی ممالک میں مسلمان بچوں کی دینی تعلیم

مغربی ممالک میں مسلمان بچوں کی دینی تعلیم و تربیت اور دینی مکاتب کی کارکردگی کا جائزہ لینے کے لیے ورلڈ اسلامک فورم کے زیر اہتمام دینی مکاتب کے چند سینئر اساتذہ اور دیگر متعلقہ حضرات کے درمیان ایک مذاکرہ کا اہتمام کیا گیا۔

یہ مذاکرہ ۱۳ اکتوبر ۱۹۹۳ء کو مرکز الدعوۃ والارشاد بلیسٹ گرووایسٹ ہم لندن میں منعقد ہوا جس کی صدارت مولانا محمد اسماعیل بوٹانے کی اور اس میں مولانا مسعود عالم قاضی، مولانا عبد الرشید رحمانی، مولانا فیاض عادل فاروقی، حاجی افتخار احمد، حاجی ولی آدم پٹیل، حافظ حفظ الرحمن تاراپوری اور حاجی غلام قادر کے علاوہ راقم الحروف اور ورلڈ اسلامک فورم کے سیکرٹری جنرل مولانا محمد عیسیٰ منصوری نے بھی شرکت کی۔

اس موقع پر یہ طے کیا گیا کہ مذاکرہ میں زیر بحث آنے والی اہم اور مفید تجاویز پر مشتمل ایک رپورٹ مرتب کر کے اخبارات و جرائد اور دینی مکاتب کے منتظمین و اساتذہ تک پہنچائی جائے تاکہ زیادہ سے زیادہ حضرات اس سے استفادہ کر سکیں۔

ضروریاتِ دین کا دائرہ

مذاکرہ میں اس امر کا جائزہ لیا گیا کہ مغربی معاشرہ میں ان ضروریات کا دائرہ کیا ہے جن کی تعلیم حاصل کرنا ہر مسلمان مرد و عورت پر فرض عین ہے اور جن کے بغیر کوئی شخص اس معاشرہ میں ایک صحیح مسلمان کے طور پر زندگی بسر نہیں کر سکتا۔ بحث و تمحیص کے بعد والدین، اساتذہ اور خطباء و ائمہ سے یہ گزارش کرنے کا فیصلہ کیا گیا کہ وہ اپنے اپنے دائرۂ کار میں مندرجہ ذیل امور کے حوالہ سے بچوں اور نوجوانوں کی تعلیم و تربیت کی طرف خاص توجہ دیں:

- یورپی معاشرت کی بنیاد مادہ پرستی اور دہریت پر ہے، اس لیے ضروری ہے کہ بچوں کو ابتدا ہی سے اللہ تعالیٰ کے وجود، اس کی قدرت، توحید باری تعالیٰ، کائنات کے نظام کے بارے میں

قرآنی عقائد: رسالت، ختم نبوت، قیامت اور قرآن و سنت کی اہمیت کے سلسلہ میں ضروری باتیں ذہن نشین کرائی جائیں۔ اس ضمن میں سب سے پہلی ذمہ داری ماں باپ کی ہے اور پھر دینی مکاتب کے اساتذہ کی کہ وہ بچوں کی ذہنی نشوونما کے ساتھ ساتھ ان کی اعتقادی تعلیم کے تسلسل کو برقرار رکھنے کی شعوری اور مربوط کوشش کریں۔

- اعتقادات و ایمانیات کے بعد عبادات یعنی نماز، روزہ، حج اور زکوٰۃ کے ضروری مسائل کی تعلیم ضروری ہے، لیکن ان مسائل کی تعلیم کافی نہیں بلکہ اس کے ساتھ ان عبادات کی اہمیت و افادیت کو ذہین نشین کرانا اور ان بچوں کی ذہنی سطح اور نفسیات کو سامنے رکھتے ہوئے انہیں ان عبادات کا شعوری طور پر قائل کرنا ضروری ہے تاکہ وہ بوجھ سمجھ کر نہیں بلکہ اپنی ذمہ داری سمجھتے ہوئے عبادت کی طرف مائل ہوں۔ اخلاقیات و معاملات میں بچوں کو اسلامی احکام کی تعلیم دینے کے ساتھ ساتھ یورپی معاشرت کی مادہ پرستانہ اخلاقیات کے نقصانات سے آگاہ کرنا اور ان کے ذہنوں میں اسلامی اخلاق اور یورپی اخلاق کے فرق کو واضح کر کے اسلامی اخلاق کی افادیت اور برتری کو شعوری طور پر واضح کرنا ضروری ہے۔ روزمرہ کے معمولات اور استعمال میں آنے والی اشیا کے حوالہ سے حلال و حرام کا فرق ذہن نشین کرانا ضروری ہے۔
- حجاب و حیا کے شرعی مسائل سے واقفیت کرانے کے ساتھ مرد و عورت کے اختلاط کے نقصانات اور اس سے پیدا ہونے والی معاشرتی خرابیوں سے بھی بچوں کو آگاہ کیا جائے۔
- اس معاشرہ میں رہنے والے نوجوانوں کو عیسائیت، یہودیت، ہندوازم اور سکھ مذہب کے بنیادی عقائد اور مسلمانوں کے ساتھ اعتقادی اور معاشرتی فرق و اختلاف سے بھی آگاہ ہونا چاہیے۔
- اسلام کے حوالہ سے ابھرنے والے اعتقادی فتنوں مثلاً تجدد پسندی، قادیانیت اور انکار حدیث کے دینی نقصانات سے بچوں کا واقف ہونا ضروری ہے۔

شرکائے مذاکرہ کی رائے یہ ہے کہ اگر والدین اور اساتذہ میں ان امور کی اہمیت کا احساس بیدار ہو جائے اور وہ بچوں کی تعلیم و تربیت کے حوالہ سے اپنے معمولات میں اس کے مطابق ترتیب پیدا کر

لیں تو یہ مقاصد بآسانی موجودہ وسائل اور نظام سے بھی کسی حد تک پورے ہو سکتے ہیں اور اس کے لیے مناسب ہوگا کہ وقتاً فوقتاً اساتذہ اور والدین کے اجتماعات کر کے ان سے ان امور پر تبادلہ خیال کیا جائے۔

دینی مکاتب کی کارکردگی

مذاکرہ میں مغربی ممالک میں مساجد میں قائم دینی مکاتب کی کارکردگی کا جائزہ لیا گیا جو ہفتہ کے دوران شام کو دو گھنٹے یا ویک اینڈ پر ہفتہ اور اتوار کی کلاسوں کی صورت میں جاری ہیں اور یہ محسوس کیا گیا کہ ان مکاتب کا وجود بسا غنیمت ہے جو مسلمان بچوں کو قرآن کریم اور دین سے وابستہ رکھنے کا عالم اسباب میں اس وقت واحد ذریعہ ہیں اور اس سلسلہ میں منتظمین اور اساتذہ کی محنت بلاشبہ لائق ستائش ہے، لیکن اس ضمن میں مندرجہ ذیل امور کو پیش نظر رکھنا بھی انتہائی ضروری ہے:

- مسلم کمیونٹی کی مجموعی آبادی میں سے مساجد و مکاتب میں آنے والے بچوں کا تناسب دیکھا جائے اور مسجد و مکتب میں نہ آنے والے بچوں کو مکتب میں لانے یا ان کے متبادل ذرائع سے تعلیم پہنچانے کا مناسب اور قابل عمل ذریعہ اختیار کیا جائے۔
- مکاتب میں صرف قرآن کریم ناظرہ کی تعلیم دی جاتی ہے۔ بعض میں حفظ قرآن کا اہتمام بھی ہے اور اس کے ساتھ عبادات کے حوالہ سے مسائل و احکام کی تعلیم ہوتی ہے۔ یہ انتہائی ضروری ہونے کے باوجود ناکافی ہے اور اس کے ساتھ ضروریات دین کے مذکورہ پیکج کو ایڈجسٹ کرنا انتہائی ضروری ہے کیونکہ اس کے بغیر ایک مسلمان نوجوان کی دینی تعلیم مکمل نہیں ہو سکتی۔
- ان مکاتب میں قرآن کریم ناظرہ مکمل کر لینے کے بعد عام طور پر ایک مسلمان بچہ دینی تعلیم سے فارغ سمجھا جاتا ہے اور ایسا عام طور پر بارہ تیرہ سال کی عمر میں ہوتا ہے۔ اس کے بعد اس بچے کا مسجد و مکتب یا دینی تعلیم کے کسی سسٹم کے ساتھ کوئی تعلق باقی نہیں رہ جاتا جو شرکائے مذاکرہ کی رائے میں سب سے زیادہ خطرناک بات ہے کیونکہ ایک نوجوان کی شخصیت و کردار کی تشکیل اور عادات و اخلاق کے رسوخ کی یہی عمر ہوتی ہے، اس لیے مناسب ہوگا کہ تعلیمی نصاب کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا جائے: پہلے حصہ میں پانچ سال

سے بارہ سال تک کی عمر کے بچوں کو قرآن کریم اور ضروریات دین کا مذکورہ بالا نصاب پڑھایا جائے اور دوسرے حصہ میں بارہ سے سولہ سال کی عمر کے بچوں کو اردو پڑھنا سکھایا جائے اور گریمر کی ضروری تعلیم کے ساتھ قرآن کریم کا ترجمہ، احادیث کا ایک منتخب کورس اور فقہ کی کوئی ایک کتاب پڑھادی جائے۔

- شرکائے مذاکرہ کی رائے یہ ہے کہ بچوں کو تعلیم اسی زبان میں دی جائے جسے وہ زیادہ بہتر طور پر سمجھتے ہیں۔ اس معاشرہ میں وہ زبان انگلش ہے اور انگلش نہ جاننے والے اساتذہ اس سلسلہ میں تھوڑی سی مشقت گوارا کر کے انگلش زبان کے نائٹ کورسز کے ذریعہ اپنی اس کمی کو پورا کرنے کی کوشش کریں تاکہ وہ تعلیمی ذمہ داری کو زیادہ بہتر طور پر ادا کر سکیں۔
- چونکہ دینی لٹریچر زیادہ تر عربی اور اردو میں ہے، اس لیے غیر عرب بچوں کو اردو بطور زبان سکھانا ضروری ہے تاکہ وہ دینی لٹریچر کے ساتھ وابستہ رہیں اور اس سے استفادہ کر سکیں۔

......

تجرباتی مکتب

مذاکرہ کے دوران بتایا گیا کہ ورلڈ اسلامک فورم نے اس مذاکرہ کی روشنی میں مرتب ہونے والی رپورٹ کی زیادہ سے زیادہ اشاعت کا فیصلہ کیا ہے تاکہ مسلم کمیونٹی کو وسیع طور پر ان ضروریات کی طرف توجہ دلائی جا سکے۔ نیز یہ بھی طے کیا گیا ہے کہ اس رپورٹ کی بنیاد پر ایک تجرباتی مکتب فورم کے زیر اہتمام لندن میں قائم کیا جائے گا جو امید ہے کہ اگست ۱۹۹۴ء کے دوران کام شروع کر دے گا، ان شاء اللہ تعالیٰ اور اس کے تفصیلی پروگرام کا اعلان ۷ اگست ۱۹۹۴ء کو اسلامک سنٹر ریجنٹ پارک لندن میں منعقد ہونے والے ورلڈ اسلامک فورم کے دوسرے سالانہ بین الاقوامی سیمینار میں کر دیا جائے گا۔

دینی مکاتب کی انتظامی کمیٹیاں

مذاکرہ میں دینی مکاتب کا نظام چلانے والی کمیٹیوں کی کارکردگی کا بھی جائزہ لیا گیا اور اس امر پر اطمینان کا اظہار کیا گیا کہ مسلم کمیونٹی کے اصحاب خیر اپنا وقت اور مال صرف کر کے دینی تعلیم کے نظام کو

چلانے کی ہر ممکن کوشش کر رہے ہیں جو لائق تحسین ہے، تاہم تین امور کی طرف ان کمیٹیوں کو بھی بطور خاص توجہ دلانے کا فیصلہ کیا گیا:

- انتظامی کمیٹیوں کے ارکان کی غالب اکثریت تمام تر خلوص، ایثار اور محنت کے باوجود چونکہ تعلیم کی فنی مہارت اور تجربہ سے بہرہ ور نہیں ہوتی، اس لیے ضروری ہے کہ دینی مکاتب کی انتظامی کمیٹیاں تعلیمی نصاب و نظام کو بہتر طور پر چلانے کے لیے جید علماء اور ماہرین تعلیم (قدیم و جدید) پر مشتمل نگران کمیٹیاں تشکیل دیں اور تمام تر تعلیمی امور ان نگران کمیٹیوں کے ذریعہ کنٹرول کیے جائیں۔
- ان مکاتب میں تعلیم دینے والے اساتذہ کی تنخواہوں کی مروجہ سطح تسلی بخش نہیں ہے، اس پر نظر ثانی کی ضرورت ہے تاکہ اساتذہ معاشی تفکرات سے آزاد ہو کر دل جمعی کے ساتھ کام کر سکیں۔
- بہت سے مکاتب میں طلبہ کی تعداد اساتذہ کی استعداد کار سے بہت زیادہ ہوتی ہے جس کی وجہ سے کام صحیح طور پر نہیں چل سکتا، اس لیے ضروری ہے کہ طلبہ کی تعداد استاد کی استعداد کار اور کلاس کے وقت، تینوں امور کے درمیان توازن قائم کیا جائے۔

نصاب اور طرز تعلیم

مذاکرہ میں دینی مکاتب میں مروج نصاب ہائے تعلیم اور طرز تعلیم کا جائزہ بھی لیا گیا اور ان دونوں پر نظر ثانی کی ضرورت محسوس کی گئی۔ بحث و مباحثہ کے دوران یہ بات سامنے آئی کہ نصاب کے طور پر پڑھائے جانے والے بیشتر رسالے بچوں کی مانوس زبان میں نہیں ہیں۔ جو رسالے انگلش میں ہیں، ان کی زبان کا معیار بچوں کی عمر اور ذہنی سطح سے مطابقت نہیں رکھتا اور اردو میں پڑھائے جانے والے کتابچے بھی اپنے مضامین و مواد کی قدر و اہمیت کے باوجود زبان کے لحاظ سے بچوں کی ذہنی سطح سے بلند ہیں، اس لیے ضرورت اس امر کی ہے کہ دینی تعلیم کے نصاب اور طرز تعلیم دونوں کا از سر نو جائزہ لیا جائے اور ایسی زبان اور طریق کار اختیار کیا جائے جس سے بچے زیادہ مانوس ہوں اور ان کے لیے اس میں شوق اور کشش کے اسباب بھی موجود ہوں۔ شرکائے مذاکرہ کی رائے میں اگرچہ اس سلسلے میں کوئی مؤثر پیش رفت فوری طور پر ممکن نہیں ہے اور یہ مقاصد ایک تدریجی عمل کے ذریعے ہی

حاصل ہو سکتے ہیں، تاہم اس سلسلہ میں وقتاً فوقتاً اساتذہ کے لیے ریفریشر کورسز اور بریفنگ کا اہتمام کر کے موجودہ صورت حال کو کافی حد تک بہتر بنایا جا سکتا ہے۔

......

(الشریعہ، دسمبر ۱۹۹۳ء)

برطانیہ میں مساجد کا نظام: چند اصلاح طلب پہلو

ان دنوں لندن سے شائع ہونے والے ایک اردو روزنامہ میں مساجد کی انتظامیہ کمیٹیوں اور ائمہ مساجد کے درمیان بحث و مباحثہ کا سلسلہ جاری ہے۔ مساجد کی انتظامیہ کمیٹیوں کی ایک مشترکہ کونسل کی طرف سے بیان شائع ہوا کہ پاکستان، بھارت اور بنگلہ دیش سے سپانسر پر جن ائمہ اور خطباء کو بلایا جاتا ہے، وہ صرف اتنا وقت مساجد میں گزارتے ہیں جتنا مستقل ویزے کے حصول کے لیے ضروری ہوتا ہے۔ اور جونہی مستقل ویزے کی مہر ان کے پاسپورٹ پر لگ جاتی ہے، وہ مساجد و مکاتب کو خیرباد کہہ دیتے ہیں اور اپنے لیے دیگر مصروفیات تلاش کر لیتے ہیں جس کی وجہ سے مساجد و مکاتب میں خطباء، ائمہ اور مدرسین کی ضرورت کا مسئلہ مستقل طور پر درپیش رہتا ہے۔ اس کے جواب میں ائمہ مساجد کی بعض تنظیموں کی طرف سے بیان آیا کہ سپانسر پر ائمہ اور خطباء کو بلانے والی مساجد کمیٹیاں ان ائمہ کے ساتھ چار پانچ سال تک جو سلوک روا رکھتی ہیں، وہ غلاموں سے بھی بدتر ہوتا ہے اور نہ صرف یہ کہ معاوضہ انتہائی قلیل ہوتا ہے، بلکہ پابندیاں اور طرزِ عمل بھی اس قدر اہانت آمیز ہوتا ہے کہ مجبوری کی مدت گزر جانے کے بعد کوئی شریف آدمی ان کمیٹیوں کے ساتھ رہنا گوارا نہیں کرتا۔

برطانیہ میں مساجد و مکاتب کی صورت حال یہ ہے کہ مختلف ممالک سے یہاں آکر بسنے والے مسلمانوں نے یہاں اپنی اپنی ضروریات کے مطابق مساجد قائم کر رکھی ہیں جن کی مجموعی تعداد پورے برطانیہ میں اب ایک ہزار کے لگ بھگ بیان کی جاتی ہے۔ ان میں بہت سی مساجد ایسی ہیں جو باقاعدہ طور پر منظوری لے کر مساجد کی شکل میں تعمیر کی گئی ہیں۔ بعض مساجد کرایہ یا ملکیت کے فلیٹس میں قائم ہیں اور سینکڑوں مساجد ایسی بھی ہیں جو غیر آباد گرجے خرید کر ان میں بنائی گئی ہیں۔ ان مساجد میں پانچ وقت کی نماز باجماعت، جمعہ اور عیدین کے اہتمام کے ساتھ ساتھ شام کو پانچ سے سات بجے تک یا ہفتہ اتوار کو چھٹی کے روز قرآن پاک کی تعلیم کے مکاتب قائم ہیں جہاں ہزاروں بچے قرآن کریم اور دینی معلومات کی ابتدائی تعلیم حاصل کرتے ہیں۔ اب کچھ عرصہ سے دینی تعلیم کے بڑے بڑے دارالعلوم اور جامعات مختلف علاقوں میں الگ طور پر بھی قائم ہو رہے ہیں جن میں درس نظامی کے

ساتھ ساتھ مقامی اسکولوں کی تعلیم بھی دی جاتی ہے اور ان کے ہاسٹلوں میں سینکڑوں طلبہ مقیم ہوتے ہیں۔ اسی طرز پر بچیوں کی دینی تعلیم کے لیے بھی ادارے قائم ہونا شروع ہو گئے ہیں اور اس طرح دینی تعلیم کا دائرہ دن بدن پھیلتا جا رہا ہے۔

پاکستان، بھارت اور بنگلہ دیش سے آنے والے مسلمانوں کی مساجد اور مکاتب اپنے ملکوں کی طرح یہاں بھی مسالک کی تفریق کا دائرہ قائم رکھے ہوئے ہیں۔ دیوبندی، بریلوی، اہل حدیث، جماعت اسلامی اور شیعہ کی تفریق کے علاوہ یہاں علاقائی تفریق کا رنگ بھی نمایاں ہے اور گجراتی، بنگالی، میرپوری اور پنجابی طرز کی گروہ بندیاں ان مساجد و مکاتب کے نظام میں کارفرما دکھائی دیتی ہیں۔

ان مساجد کے لیے ائمہ و خطباء اور قرآن کریم کی تعلیم کے اساتذہ ظاہر بات ہے کہ اپنے ممالک سے ہی درآمد کیے جاتے ہیں اور چونکہ مسلکی اور علاقائی گروہ بندی کی رعایتوں کے علاوہ مساجد قائم کرنے والی کمیٹیوں کے ذمہ دار افراد کی ذاتی پسند و ناپسند اور اپنے رشتہ داروں اور تعلق داروں کو ترجیح دینے کا مسئلہ بھی درپیش رہتا ہے، اس لیے یہاں کے ماحول کی ضروریات کے مطابق ائمہ اور اساتذہ کی اہلیت کا تعین اور اس کی روشنی میں افراد کا انتخاب ابھی تک ترجیحات میں شامل نہیں ہو سکا۔ دوسری طرف پاکستان، بھارت اور بنگلہ دیش کے دینی اداروں نے اس امر کی ضرورت کبھی محسوس نہیں کی کہ مغربی ممالک کی مساجد و مدارس کے لیے وہاں کی ضروریات کا جائزہ لے کر ان کے مطابق ائمہ اور اساتذہ کی تعلیم و تربیت اور تیاری کا اہتمام کریں تاکہ وہ وہاں جا کر اسلام کی خدمت اور مسلمانوں کی صحیح دینی راہنمائی کی ذمہ داری بہتر طور پر ادا کر سکیں، اس لیے برطانیہ میں آنے والے ائمہ و خطباء اور دینی اساتذہ کی غالب اکثریت ایسے افراد پر مشتمل ہے جو اپنی جگہ ضروری دینی تعلیم اور صلاحیت سے یقیناً بہرہ ور ہوں گے، لیکن زبان، نفسیات ذہنی سطح اور معاشرتی فرق کے لحاظ سے یہاں کی ضروریات سے قطعی طور پر ہم آہنگ نہیں ہیں اور ان میں سے اکثر حضرات کی یہاں آمد کا مقصد بھی دین کی خدمت نہیں بلکہ اپنی معاشی حالت کو بہتر بنانا ہوتا ہے۔ چنانچہ انہیں اس کے لیے جو مواقع میسر آتے ہیں، ان سے استفادہ میں انہیں کوئی حجاب محسوس نہیں ہوتا اور اس کے منطقی اثرات وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ زیادہ نمایاں ہوتے جا رہے ہیں۔

آج سے دو سال قبل ورلڈ اسلامک فورم نے اسلام آباد کی بین الاقوامی یونیورسٹی کے شعبہ دعوہ

اکیڈمی کے تعاون سے یورپ کے مسلمان طلبہ کے لیے اردو اور انگلش میں دینی تعلیم کا ایک کورس ''اسلامک ہوم اسٹڈی کورس'' کے نام سے شروع کیا تھا جس میں اب بحمد اللہ تعالیٰ ایک ہزار سے زائد طلبہ اور طالبات شریک ہیں۔ گزشتہ سال لندن کی ایک مجلس میں راقم الحروف نے علماء کو اس کورس کی اہمیت و ضرورت کی طرف توجہ دلائی تو ایک بڑے عالم دین نے مجھ سے مخاطب ہو کر کہا کہ ''حضرت! یہاں دین کی کیا بات کرتے ہیں؟ یہاں تو بس پونڈ اکٹھے کریں اور اپنے ملک میں جا کر دین کی خدمت کریں۔'' اس سے یہاں کی اس نفسیاتی کیفیت کا اندازہ کیا جا سکتا ہے جو دین کے نام پر اس ملک میں آنے والے لوگوں کی ایک بڑی تعداد کے ذہنوں کی عکاسی کرتی ہے۔ یقیناً سب لوگ ایسے نہیں ہیں اور ایسے افراد کی بڑی تعداد مساجد و مدارس میں کام کر رہی ہے جو دین کی خدمت کے مشنری جذبہ سے بہرہ ور ہیں، لیکن مجموعی ماحول پر اور خاص طور پر پاکستان سے تعلق رکھنے والے مکاتب اور مساجد میں وہ صورت حال نمایاں نظر آتی ہے جس کا ہم پہلے ذکر کر چکے ہیں۔

مساجد کمیٹیوں کی حالت اس سے بھی زیادہ افسوس ناک ہے۔ ان کمیٹیوں میں ایسے افراد کی تعداد کم نہیں ہے جو مسجد یا دین کی خدمت کے لیے ان کمیٹیوں میں شامل نہیں ہیں بلکہ چودھراہٹ کا کوئی اور میدان اس سوسائٹی میں اپنے لیے موجود نہ پا کر وہ اس جذبہ کی تسکین کے لیے مساجد کمیٹیوں کا رخ کرتے ہیں اور پھر ان کی چودھراہٹ اور حکمرانی کا سارا زور امام اور خطیب کو اپنی مرضی کے مطابق چلانے پر صرف ہو جاتا ہے۔ ان کمیٹیوں میں دو دو تین تین دھڑے بن جاتے ہیں اور ہر دھڑے کی خواہش اور کوشش ہوتی ہے کہ امام اور خطیب صرف اس کی مرضی کے مطابق چلے، چنانچہ ہوشیار قسم کے خطیب و امام تو کسی طاقتور دھڑے کے ساتھ فریق بن کر دوسرے دھڑے کا دھڑن تختہ کرا دیتے ہیں اور خود بھی اقتدار میں شریک ہو جاتے ہیں، جبکہ سادہ قسم کے امام مساجد کمیٹیوں کے ان دھڑوں میں غریب کی جورو بنے رہتے ہیں اور اس وقت کے انتظار میں سر جھکائے رکھتے ہیں کہ کب ان کے پاسپورٹ پر مستقل ویزے کی مہر لگے اور وہ ان کمیٹیوں کے چنگل سے نجات حاصل کریں۔

ائمہ اور خطباء کی تنخواہوں کی صورت حال یہ ہے کہ شام کو پانچ سے سات بجے تک قرآن کریم کی تعلیم دینے والے اساتذہ عام طور پر تیس سے چالیس پونڈ ہفتہ پاتے ہیں اور پانچ وقت کی نماز اور جمعہ کے ساتھ ساتھ شام کی کلاس کی پابندی اور مسجد کی نگرانی و حفاظت کی ذمہ داری نبھانے والے ائمہ و

خطباء ستر سے سو پونڈ تک فی ہفتہ تنخواہ کے مستحق سمجھے جاتے ہیں۔ بعض حضرات اس سے زیادہ معاوضہ بھی پاتے ہیں، لیکن عام طور پر لندن اور دیگر بڑے شہروں کا معیار یہی ہے اور یہ یہاں کے عام معیار سے کم و بیش نصف کے لگ بھگ ہے، بالخصوص وہ ائمہ جو مساجد کے حجروں میں قیام پذیر اور اپنی خوراک کے خود ذمہ دار ہیں، ان کے لیے صورت حال زیادہ پریشان کن ہوتی ہے اور انہیں ٹیوشن اور دیگر ذرائع اختیار کر کے اپنا حساب کتاب برقرار رکھنا پڑتا ہے۔ اس قلیل معاوضہ کے ساتھ ائمہ و خطباء کو مساجد کمیٹیوں اور ان کے چودھری قسم کے ارکان کے سامنے جس طرح ہر وقت جواب دہ رہنا پڑتا ہے، وہ علماء کرام کے لیے زیادہ تکلیف دہ امر ہے۔ اسی وجہ سے مستقل ویزے تک کی مجبوری کی مدت کو یہاں ائمہ مساجد کی اصلاح میں ''عدت'' کہا جاتا ہے اور یہ ائمہ جب آپس میں ملتے ہیں تو ایک دوسرے سے اس کی عدت کی بقایا مدت اور اس کے بعد کے پروگرام کے بارے میں پوچھتے رہتے ہیں۔

گزشتہ سال کی بات ہے، لندن کے ایک علاقہ کی بڑی مسجد میں اس کی انتظامیہ کمیٹی کی ہفتہ وار میٹنگ میں راقم الحروف بھی بیٹھا تھا۔ اس مسجد میں فنڈز کی فراوانی کی وجہ سے تین خطیب بیک وقت کام کر رہے تھے اور کمیٹی والے اگلے ہفتہ کے دوران ان ائمہ کے درمیان نمازوں کی تقسیم کا شیڈول طے کر رہے تھے کہ مثلاً منگل کے روز فجر کی نماز کون پڑھائے گا، ظہر کون پڑھائے گا اور عصر کس کے ذمہ ہوگی؟ تقسیم کا انداز یہ تھا کہ تینوں میں سے کسی امام کو کسی دن بھی ایسی گنجائش نہ مل سکے کہ وہ کسی کام کے لیے کہیں جانا چاہے تو جا سکے۔ مجھے یہ صورت حال دیکھ کر تکلیف ہوئی۔ میں نے کمیٹی والوں کے طرز عمل سے اختلاف کیا اور ان سے کہا کہ وہ ائمہ کے ساتھ یہ معاملہ نہ کریں، بلکہ انہیں صرف اس بات کا پابند کریں کہ ہر نماز میں ان میں سے کوئی نہ کوئی ضرور موجود ہو اور اس کے بعد باقی تقسیم ان پر چھوڑ دیں کہ وہ آپس میں ضرورت اور سہولت کے مطابق تقسیم کار کر لیں، لیکن کمیٹی والوں کو میں اس بات پر قائل نہ کر سکا۔ اس سے مساجد کمیٹیوں اور ائمہ مساجد کے درمیان تعلقات کار کی نوعیت کا بخوبی اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

ان کمیٹیوں میں بیشتر افراد دیندار ہوتے ہیں اور اچھے خیالات و جذبات کے حامل ہوتے ہیں، لیکن ایسے افراد کی کمی نہیں ہے جو محض چودھراہٹ کے خیال سے کمیٹیوں پر حاوی ہو جاتے ہیں اور

اس مقصد کے لیے خاصی رقوم بھی مساجد کی تعمیر میں صرف کر دیتے ہیں۔ ابھی گزشتہ ہفتے کی بات ہے کہ علماء کرام کی ایک سوسائٹی میں، جو ''اسلامک فقہ اکیڈمی برطانیہ'' کے نام سے کام کر رہی ہے، یہ بات زیر بحث تھی کہ مساجد کمیٹیوں میں ایسے افراد کی رکنیت کی شرعی حیثیت کا جائزہ لینے کی ضرورت ہے جو صوم وصلوٰۃ کے پابند نہیں اور شراب وغیرہ کی فروخت جیسے حرام کاروبار میں مصروف ہیں۔ مساجد کمیٹیوں میں اس قسم کے افراد کی موجودگی زیادہ خرابی کا باعث بنتی ہے۔

اس پس منظر میں دیکھا جائے تو مساجد کمیٹیوں اور ائمہ مساجد دونوں کی مذکورہ شکایات اپنی اپنی جگہ درست ہیں اور ان کے اسباب کا تفصیل کے ساتھ جائزہ لے کر ان کے ازالہ کے لیے ٹھوس لائحہ عمل اختیار کرنے کی ضرورت ہے۔ ہمارے نزدیک اس کام کی اصل ذمہ داری تو اسلامی کانفرنس کے جدہ سیکریٹریٹ کی ہے کہ وہ غیر مسلم ممالک میں مساجد و مکاتب کے نظام کا جائزہ لینے اور ان کی مشکلات و مسائل کے حل کے لیے ایک مستقل شعبہ قائم کرے اور اس مقصد کے لیے ایک مؤثر نظامِ کار وضع کیا جائے۔ تاہم پاکستان کی حد تک ہماری تجویز یہ ہے کہ:

- پاکستانی سفارت خانوں میں موجود تعلیمی شعبوں کا دائرۂ کار دینی تعلیم تک بڑھایا جائے اور سفارت خانوں میں مذہبی امور کے شعبے بھی قائم کیے جائیں اور وزارت تعلیم اور وزارت مذہبی امور کے شعبے اسلامی نظریاتی کونسل کی سفارشات کی روشنی میں مساجد، مکاتب اور دینی تعلیم کے نظام میں پاکستان کمیونٹی کی راہ نمائی کریں۔
- پاکستان میں مختلف مکاتب فکر کے دینی مدارس کا مشترکہ بورڈ اپنا وفد بھیج کر مغرب کی مذہبی اور تعلیمی ضروریات اور مسائل کا جائزہ لے اور غیر سرکاری سطح پر سفارشات مرتب کر کے ان ممالک میں مقیم پاکستانیوں کی رہنمائی کی جائے۔

(روزنامہ پاکستان، ۱۵ اکتوبر ۱۹۹۶ء)

مغربی معاشرہ میں دینی تعلیم

مولانا محمد کمال خان ہمارے محترم بزرگ ہیں۔ سوات کے رہنے والے ہیں۔ ایک عرصہ تک ڈیوزبری (برطانیہ) کے تبلیغی مرکز کے دینی مدرسہ میں خدمات سرانجام دیتے رہے ہیں اور اب نوٹنگھم کے قریب نیوارک سے متّصل ایک بلڈنگ خرید کر الجامعۃ الاسلامیہ کے نام سے ایک بڑا دینی ادارہ قائم کرنے کے لیے تگ و دو میں مصروف ہیں۔ بلڈنگ رائل ایئر فورس کے آفیسرز کے ہاسٹل کے طور پر استعمال ہوتی رہی ہے۔ اس میں ڈیڑھ سو کے قریب کمرے ہیں اور مجموعی رقبہ دس ایکڑ سے زائد ہے۔ اس کی قیمت کی قرضہ حسنہ سے ادائیگی کے لیے اصحاب خیر سے رابطے کر رہے ہیں۔ خیال ہے کہ آنے والے رمضان المبارک کے بعد تعلیمی و تدریسی سلسلہ کا وہاں باقاعدہ آغاز ہو جائے گا، ان شاء اللہ العزیز۔

مولانا موصوف نے گزشتہ دنوں دو تین ملاقاتوں میں راقم الحروف سے ارشاد فرمایا کہ جامعہ کے تعلیمی نظام و نصاب کے بارے میں انہیں مشورہ دوں۔ یہ ان کا حسن ظن ہے، ورنہ بیس سالہ تدریسی زندگی گزارنے کے باوجود خود کو اس کا اہل نہیں سمجھتا کہ تعلیمی نظام و نصاب جیسے اہم اور نازک مسائل پر رائے زنی کر سکوں۔ تاہم ان کے حکم کی تعمیل میں اس موضوع پر قلم اٹھا رہا ہوں۔

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ تعلیمی نظام و نصاب کے ایک نئے خاکہ پر گفتگو سے پہلے دینی مدارس کے موجودہ نظام و ماحول پر مختصر سا تبصرہ ہو جائے تاکہ اس کا تاریخی پس منظر سامنے رہے۔ برصغیر پاک و ہند و بنگلہ دیش نیز برما و افغانستان میں دینی مدارس کا موجودہ نظام اس تسلسل کا ایک حصہ ہے جس کا آغاز ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں برصغیر کے مسلمانوں کی شکست کے بعد ہوا تھا۔ انگریز حکمرانوں نے جنگ آزادی کو کچلنے کے بعد پورے برصغیر پر تعلیمی و تہذیبی یلغار کر دی تھی، مسلمانوں کے تعلیمی ادارے تباہ برباد کر دیے تھے اور زبان، قانون اور نظام تعلیم کو یکسر تبدیل کر کے پرانے تعلیمی نظام کی عملی افادیت کو یکسر ختم کر کے رکھ دیا تھا۔ اس وقت چند مردانِ باخدا نے امداد باہمی اور عوامی تعاون کی بنیاد پر دینی مدارس کے قیام کی طرف قدم بڑھایا۔ ابتدا میں دیوبند، سہارنپور اور مراد آباد میں دینی

مدرسے قائم ہوئے اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے پورے برصغیر میں ان مدارس کا جال بچھ گیا۔ ان مدارس میں فارسی اور عربی زبان کے ساتھ قرآن و حدیث، فقہ، اصول فقہ، ادب، منطق، فلسفہ اور دیگر متعلقہ علوم کو نصاب میں سمو دیا گیا اور ملا نظام الدین کے مرتب کردہ درس نظامی کے دائرہ میں رہتے ہوئے دینی ضروریات اور ترجیحات کا ایک ہدف متعیّن کر دیا گیا۔ اب تک ہمارے دینی مدارس اسی دائرے میں کام کر رہے ہیں اور معاشرہ ان کی جدوجہد کے ثمرات سے بہرہ ور ہو رہا ہے۔

تاریخ کے طالب علم اور نفاذ شریعت کی جدوجہد کے نظریاتی کارکن کی حیثیت سے یہ بات عرصہ سے ذہن میں گردش کر رہی تھی کہ آزادئ وطن کے بعد دینی تعلیم کے اس پرانے نصاب و نظام کو قائم رکھنے کی ضرورت باقی نہیں رہی کیونکہ یہ نظام دور غلامی کے تقاضوں کو سامنے رکھ کر ترتیب دیا گیا تھا اور آزادی کے بعد وہ تقاضے بدل گئے ہیں، اس لیے پورے تعلیمی نظام و نصاب میں اجتہادی تبدیلیوں بلکہ انقلاب کی ضرورت ہے، حتیٰ کہ گزشتہ سال حکومت پاکستان کے قائم کردہ تعلیمی کمیشن کے ایک سوالنامہ کے جواب میں راقم الحروف نے یہ لکھ بھی دیا کہ علی گڑھ کا نظام تعلیم اور دیوبند کا نظام تعلیم دونوں دور غلامی کی یادگار ہیں اور دونوں کی بنیاد خوف اور تحفظات پر ہے۔ ایک طبقہ کے سامنے یہ خوف تھا کہ اگر مسلمان نوجوانوں نے جدید تعلیم اور انگریزی زبان سے بے اعتنائی برتی تو قومی زندگی کی دوڑ میں ہندو آگے بڑھ جائے گا اور قومی نظام زندگی کی باگ پر مسلمان کی گرفت قائم نہیں رہے گی، اس لیے اس طبقہ نے علی گڑھ کے نظام کی بنیاد رکھی۔ دوسری طرف ایک طبقے کو یہ خوف تھا کہ اگر دینی علوم کی تعلیم و تدریس کا مناسب انتظام نہ ہو سکا تو قرآن و سنت اور ان سے متعلقہ علوم رفتہ رفتہ مسلمانوں کی زندگی سے نکل جائیں گے، نیز مسلمانوں کو مساجد میں نماز اور قرآن کریم پڑھانے والے ائمہ اور حفاظ میسر نہیں آئیں گے تو دین کے ساتھ ان کا تعلق قائم نہیں رہے گا اور رفتہ رفتہ یہ خطہ بھی اسپین بن جائے گا، اس لیے اس طبقہ نے دینی مدارس کے قیام کا سلسلہ شروع کر دیا۔

دونوں خوف اپنی اپنی جگہ بجا تھے اور ان کی بنیاد پر قائم ہونے والے دونوں تعلیمی نظاموں نے معاشرہ کی خدمت کی اور اپنے اپنے مقاصد کے حصول کے لیے تاریخی کردار ادا کیا، لیکن آزادی اور قیام پاکستان کے بعد ان دونوں کو ختم ہو جانا چاہیے تھا کیونکہ اب ضرورت بالکل نئے نظام تعلیم کی ہے جس کا خاکہ میرے نزدیک یہ ہے کہ کہ میٹرک تک تعلیم ہر شہری کے لیے لازمی قرار دی جائے جس میں

مندرجہ ذیل امور شامل ہوں:

(۱) علاقائی زبان	(۲) اردو بحیثیت قومی زبان
(۳) عربی بطور دینی زبان	(۴) انگلش بطور بین الاقوامی زبان
(۵) لکھنا پڑھنا	(۶) روز مرہ ضروریات کا حساب
(۷) جغرافیہ	(۸) تاریخ
(۹) جنرل سائنس	(۱۰) ضروریات دین۔

یہاں تک تعلیم ہر شہری کے لیے ضروری ہو۔ اس کے لیے ایک ہی طرز کے تعلیمی ادارے ہوں جن میں کسی قسم کی طبقاتی ترجیحات نہ ہوں۔ میٹرک کے بعد تعلیم کو انجینئرنگ، میڈیکل، علم دین، تاریخ، اور دیگر ضروری شعبوں میں تقسیم کر دیا جائے اور ہر شعبہ کی ضروریات کے مطابق قومی تعلیمی پالیسی کی منصوبہ بندی کی جائے۔

یہ خلاصہ ہے ان گزارشات کا جو سوالنامہ کے جواب میں قومی تعلیمی کمیشن کو میں نے بھجوائیں۔ اس کے ساتھ یہ احساس بھی رہا کہ ''چھوٹا منہ بڑی بات والی'' بات ہو گئی ہے، مگر گزشتہ دنوں مولانا مفتی محمد رفیع عثمانی سے یہ معلوم کر کے بے حد مسرت ہوئی کہ ان کے والد محترم مفتی اعظم پاکستان حضرت مولانا مفتی محمد شفیع رحمہ اللہ تعالیٰ نے قیام پاکستان کے بعد کم و بیش اسی نوعیت کے خیالات کا اظہار تعلیمات اسلامیہ بورڈ میں فرمایا تھا اور ان کا نقطہ نظر بھی لگ بھگ یہی تھا۔

تفصیلات میں جائے بغیر صرف ایک مثال سے بات واضح کرنے کی کوشش کروں گا۔ دینی مدارس نے دور غلامی میں بنیادی طور پر تین چار اہم خدمات سرانجام دی ہیں: ایک یہ قرآن و حدیث اور ان سے متعلقہ علوم و فنون کی حفاظت کی ہے۔ دوسری یہ کہ مسلمانوں کو مساجد اور مدارس آباد رکھنے کے لیے ائمہ، حفاظ اور مدرسین مہیا کرتے رہے ہیں۔ تیسری یہ کہ مسلمہ دینی عقائد و احکام کے خلاف اٹھنے والے ہر نظریاتی فتنہ کا تعاقب کیا ہے اور چوتھی یہ کہ تحریک آزادی کو تربیت یافتہ قائدین اور کارکنوں کی کھیپ فراہم کی ہے۔

اب اس حوالہ سے قیام پاکستان کے بعد ملک میں شریعت اسلامیہ کی بالادستی اور نفاذ کی تحریک کی فکری و علمی قیادت بھی دینی مدارس کی ذمہ داری تھی اور دو کام انہوں نے بہر حال کرنا تھے۔ ایک یہ کہ

اپنے طلبہ کو نفاذ اسلام کے حوالے سے پیش آمدہ فکری و عملی مسائل سے مانوس کراتے اور حدیث وفقہ کی تدریس میں جدید تہذیبی، نظریاتی اور معاشرتی مسائل کو زیر بحث لایا جاتا تاکہ علماء میں ان مسائل پر قرآن وسنت کی روشنی میں بحث وتمحیص اور استنباط واستخراج کا ذوق بیدار ہوتا، اور دوسرا یہ کہ طلبہ و علماء کو ذہنی طور پر تیار کیا جاتا تاکہ وہ معاشرہ میں شریعت کی بالادستی کی جدوجہد کی قیادت کریں، لیکن یہ دونوں کام ہمارے مدارس میں نہیں ہوئے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ قومی سیاست تو اپنی جگہ، خود نفاذ شریعت کی جدوجہد بھی فکری انارکی کا شکار ہے اور اس پر سنجیدہ دینی حلقوں کی گرفت نہیں ہے۔

ہمارے ہاں حدیث کی کتابوں میں رفع یدین اور آمین بالجہر جیسے فروعی مباحث پر ہفتوں صرف ہو جاتے ہیں۔ مجھے ان ضروریات سے انکار نہیں اور اپنی ضرورت کے دائرہ میں ہر علمی بحث کی اہمیت مسلم ہے، لیکن میں اس وقت اپنے جذبات کو قابو میں نہیں رکھ سکتا جب دیکھتا ہوں کہ قانون سازی کی حدود، آبادی کے کنٹرول، سود، نظریہ ارتقاء، جدلی معاشیات، اباحیت مطلقہ، اسلامی حکومت کی سیاسی بنیاد اور انسانی حقوق کے حوالہ سے جو مسائل قدم قدم پر دامن پکڑے ہمارا منہ چڑا رہے ہیں، ان پر کوئی بحث ومباحثہ نہیں ہوتا، حالانکہ حدیث وفقہ کی کتابوں میں ان کے بارے میں بھی وافر مقدار میں مواد موجود ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ہزار میں سے نوسوننانوے علماء کو جب عملی طور پر ان میں سے کسی مسئلہ کا سامنا درپیش ہوتا ہے تو وہ منطق واستدلال سے تہی دامن ہوتے ہیں، مجبور ہو کر فتویٰ اور طعن وتشنیع کی زبان کا سہارا لیتے ہیں اور کرکٹ کی اصطلاح میں ایل بی ڈبلیو ہو کر رہ جاتے ہیں۔

اب ایک طائرانہ نظر برطانیہ میں دینی تعلیم کے مروجہ سسٹم پر ڈال لی جائے تو مناسب ہوگا۔ یہاں پاکستان، بھارت اور بنگلہ دیش سے آنے والے مسلمانوں میں بچوں کو دینی تعلیم سے آراستہ کرنے کے لیے جو نظام چل رہا ہے، اس کے تحت ایک تو مساجد یا اسلامک سنٹروں میں قائم وہ مکتب ہیں جہاں روزانہ شام پانچ سے سات بجے تک یا ویک اینڈ پر ہفتہ اور اتوار کے روز قرآن کریم کی تعلیم دی جاتی ہے، قرآن پاک ناظرہ پڑھایا جاتا ہے، نماز اور دیگر دینی مسائل بچوں کو ذہن نشین کرائے جاتے ہیں اور ایک طرح سے بنیادی دینی تعلیم سے بچوں اور بچیوں کو ایک حد تک آراستہ کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ یہ ایک اچھی کوشش ہے اور یہاں پروان چڑھتے والی مسلمان پود میں اگر دین کے ساتھ کوئی تعلق ہے تو اسی کی برکت سے ہے۔

اس کے علاوہ وہ مدارس جامعات اور دارالعلوم بھی اب تیزی کے ساتھ برطانیہ کے مختلف شہروں میں قائم ہو رہے ہیں جن کا مقصد علم دین کی مکمل تعلیم دے کر علماء تیار کرنا ہے تاکہ وہ معاشرہ میں دینی قیادت کے فرائض سنبھال سکیں اور دونوں کے بارے میں میری ایک واضح رائے ہے اور اسے عرض کرنے سے قبل اس تجویز کو سامنے لانا ضروری سمجھتا ہوں کہ جس طرح پاکستان میں وفاق المدارس کے ناموں سے دینی مدارس کے مختلف بورڈ ہیں جن کے تحت مدارس کا سلسلہ رفتہ رفتہ نظم آشنا ہوتا جا رہا ہے اور ان وفاقوں کی اسناد کو حکومتی سطح پر بھی تسلیم کیا جاتا ہے، اسی طرز پر برطانیہ میں بھی دینی مدارس کا ایک وفاق قائم ہونا ضروری ہے اور بہتر ہوگا کہ مختلف مکاتب فکر کے الگ الگ وفاق نہ ہوں، بلکہ اہل سنت کے مسلمہ مکاتب فکر کا ایک مشترکہ بورڈ ہو۔

یہاں یہ بات بھی المیہ کی حد تک موجود ہے کہ مختلف مکاتب فکر کے درمیان بعد، مناقشت اور مسابقت کی فضا نے باہم مل بیٹھنے کے راستے مسدود کر رکھے ہیں، حالانکہ پاکستان میں فرقہ وارانہ تعصبات کے باوجود ہم نفاذ شریعت اور ختم نبوت جیسے مشترکہ مقاصد کے لیے بوقت ضرورت مل بیٹھتے ہیں اور اس کے ثمرات بھی حاصل کرتے ہیں، لیکن جہاں اس مل بیٹھنے کی ضرورت زیادہ ہے، وہاں اس کے امکانات کم نظر آ رہے ہیں جو انتہائی افسوس ناک امر ہے اور دیوبندی، بریلوی و اہل حدیث مکاتب فکر کے برطانوی قائدین کو اس پہلو کا ضرور جائزہ لینا چاہیے۔ بہرحال بہتر تو یہی ہے کہ اہل سنت کے تمام مکاتب فکر کے مدارس کا مشترکہ بورڈ قائم ہو، ورنہ اگر سردست ایسا کرنا قابل عمل نہ ہو تو ایک مکتب فکر کے مدارس کو بہرحال جلد از جلد اس قسم کا کوئی نظام ضرور قائم کر لینا چاہیے۔ یہ وفاق یا بورڈ دو امور کی نگرانی اور اہتمام کرے: ایک یہ کہ برطانوی معاشرہ بلکہ یورپی معاشرہ کی دینی ضروریات کا وسیع تناظر میں جائزہ لے کر اس کی بنیاد پر تعلیمی نصاب و نظام ترتیب دیا جائے اور دوسرا یہ کہ مدارس کی درجہ بندی کر کے ان کے تعلیمی معیار، امتحانات اور تربیتی ماحول کی کڑی نگرانی کی جائے۔

اب میں اس طرف آ رہا ہوں کہ برطانوی معاشرہ کی دینی ضروریات میرے نزدیک کیا ہیں اور ان کی بنیاد پر دینی تعلیم کے نظام کا نیا ڈھانچہ کیا ہونا چاہیے؟ مجھے ۱۹۸۵ء سے کم و بیش ہر سال برطانیہ میں آنے کا موقع مل رہا ہے اور حالات کا جائزہ لیتے رہنے کی عادت بھی ہے۔ میں نے مسلسل کوشش کی ہے کہ کھلی آنکھوں سے یہاں کی دینی ضروریات کا جائزہ لوں اور اس کے نتائج اب آپ حضرات کے

سامنے رکھ رہا ہوں، لیکن اس وضاحت کے ساتھ کہ ایک شخص کی رائے اور تجزیہ بہر حال ایک ہی شخص کا ہوتا ہے جو اجتماعی مشاورت کا بدل کسی صورت نہیں ہو سکتا، اس لیے میری خواہش ہے کہ اس سلسلہ میں ایک اجتماعی مشاورت کا اہتمام ہو اور اس میں مجھے بھی شرکت کی سعادت بخشی جائے تاکہ زیادہ بہتر طور پر حالات وضروریات کا تجزیہ کر کے نتائج کو سامنے لایا جا سکے۔ تاہم گفتگو کی بنیاد کے طور پر چند ابتدائی گزارشات اس ضمن میں پیش کر رہا ہوں۔

اس معاشرہ کی دینی ضرورت کو بنیادی طور پر تین حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے:

۱. یہاں رہنے والے ہر مسلمان شخص کی دینی ضروریات
۲. مسلم کمیونٹی کی اجتماعی ضروریات
۳. برطانوی بلکہ پورے یورپی معاشرہ کی مجموعی دینی ضروریات

شخصی ضروریات سے مراد یہ ہے کہ ایک مسلمان کو بحیثیت مسلمان اس معاشرہ میں رہنے کے لیے جس قسم کی دینی تعلیم اور معلومات کی ضرورت ہے، وہ اسے مہیا ہونی چاہیے اور ظاہر بات ہے کہ دینی مدارس و مکاتب کے سوا اس ضرورت کے پورا کرنے کی کوئی صورت ممکن نہیں ہے۔ شخصی دینی ضروریات کو ہم ضروریات دین کے اجمالی تعارف کی صورت میں یوں سمیٹ سکتے ہیں کہ ہر مسلمان کو قرآن پاک صحیح تلفظ کے ساتھ کم از کم ناظرہ ضرور پڑھنا چاہیے۔ اسے اتنی سورتیں یاد ہونی چاہئیں کہ وہ پانچ وقت کی نماز مسنون طریقہ سے ادا کر سکے۔ بہتر تو یہ ہے کہ تھوڑی بہت عربی گریمر کے ساتھ مسلم نوجوانوں کے لیے قرآن کریم کے ترجمہ کی کلاسوں کا اہتمام کیا جائے، ورنہ کم از کم ایک دو پارے ترجمہ کے ساتھ ضرور ہوں۔ اسے اسلام کے بنیادی عقائد کا علم ہو اور یہاں رہنے والی دوسری قوموں کے ساتھ عقائد کا فرق بھی معلوم ہو۔ نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ اور دیگر اسلامی عبادات کے بارے میں اتنی معلومات اسے ضرور حاصل ہوں کہ وہ انہیں صحیح طریقہ سے ادا کر سکے۔ حلال حرام اور جائز ناجائز کے مسائل اس کے علم میں ہوں اور اسلامی شخصیات بالخصوص حضرات انبیائے کرام علیہم السلام اور حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے بارے میں اسے ضروری معلومات حاصل ہوں۔

اب شخصی دینی ضروریات کے اس وسیع تناظر میں ہم ان مکاتب کی کارکردگی کا جائزہ لیں جو مساجد اور اسلامک سنٹروں میں اس وقت چل رہی ہے تو نتائج کا گراف تیزی کے ساتھ نیچے کی طرف جاتا

دکھائی دے گا۔ اول تو یہ دیکھیں کہ ان مکاتب و مدارس میں آنے والے بچوں کو ملنے والی تعلیم اور حاصل ہونے والی معلومات کا ان کی مجموعی دینی ضروریات کے لحاظ سے کیا تناسب ہے؟ رزلٹ کارڈ آپ کے سامنے حقائق کی ایک نئی دنیا کو بے نقاب کر دے گا۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ میں ان مدارس و مکاتب کی افادیت سے انکار کر رہا ہوں، کیونکہ اب تک نئی نسل کا دین کے ساتھ جو تعلق قائم ہے، اس کی بنیاد انہی مدارس پر ہے، لیکن جتنا کام ہونا چاہیے یا جتنا ہو سکتا ہے، اتنا نہیں ہو رہا۔ وجہ صرف یہ ہے کہ باہمی مشاورت نہیں ہے، منصوبہ بندی نہیں ہے اور کام کی ترجیحات متعیّن نہیں ہیں۔ اگر اس کا اہتمام ہو جائے تو انہی مکاتب و مدارس کی کارکردگی میں کم از کم سو فیصد اضافہ ہو سکتا ہے۔

شخصی دینی ضروریات سے آگے بڑھ کر دوسرا دائرہ مسلم کمیونٹی کی اجتماعی دینی ضروریات کا ہے۔ اس میں ہم دیکھتے ہیں کہ یہاں رہنے والے مسلمانوں کو ایسی دینی قیادت کی ضرورت ہے جو اسلامی احکام و تعلیمات سے پوری واقفیت رکھنے کے ساتھ ساتھ یورپی معاشرہ کی خرابیوں اور نفسیات سے بھی آگاہ ہو تاکہ وہ دینی قیادت مسلمانوں اور ان کی نئی نسل کو اس معاشرہ کی خرابیوں سے حکمت عملی کے ساتھ بچاتے ہوئے صحیح اسلامی زندگی بسر کرنے میں راہنمائی کر سکے۔ اس دینی قیادت کو ہم تین حصوں میں تقسیم کریں گے:

ایک مساجد کے ائمہ کا طبقہ، یعنی یہاں مساجد میں ایسے ائمہ کی ضرورت ہے جو نماز پڑھا سکیں، قرآن کریم ناظرہ اور ترجمہ کی تعلیم دے سکیں، ضرورت کے مطابق بچوں کو ایک دو پارے یاد کرا سکیں اور دینی معلومات اور احکام و مسائل کی چھوٹی کتابیں پڑھا سکیں۔ یہ کھیپ یہیں تیار ہونی چاہیے، کیونکہ باہر سے آنے والے ائمہ اور حفاظ یہاں کے ماحول کے ساتھ ساتھ زبان سے بھی واقف نہیں ہوتے جس سے استاد اور شاگرد کے درمیان حجاب قائم رہتا ہے اور مطلوبہ مقاصد حاصل نہیں ہوتے۔ میں سمجھتا ہوں کہ دینی مدارس کو سب سے زیادہ ایسے ائمہ کی تیاری کی طرف توجہ دینی چاہیے اور اس سطح کے لیے کسی لمبے چوڑے نصاب کی ضرورت نہیں۔ یہ امور کفایت کر جائیں گے کہ امام صاحب قرآن کریم معروف لہجہ میں صحیح تلفظ کے ساتھ پڑھ سکتے ہوں، حافظ ہوں تو بہت بہتر، ورنہ ایک دو پارے انہیں ضرور یاد ہوں، قرآن کریم کو سمجھنے کی حد تک عربی گریمر پر انہیں عبور ہو، فقہ کی ایک آدھ کتاب مثلاً قدوری انہوں نے اہتمام سے پڑھ رکھی ہو اور اپنی علاقائی زبان کے ساتھ ساتھ اردو اور انگلش پر بھی

انہیں عبور ہو۔ اس سے زیادہ علم کی اس سطح پر ضرورت نہیں ہے، ہاں کوئی اپنے شوق کی تکمیل کے لیے پڑھنا چاہے تو اس کی کوئی حد متعیّن نہیں کی جاسکتی۔

دوسرا درجہ خطبائے کرام کا ہے جو دراصل مسلمانوں کی عمومی راہنمائی کرتے ہیں اور جن کی تیاری پر سرے سے ہمارے ہاں کوئی توجہ نہیں دی جاتی۔ میرے نزدیک یورپ کی کسی مسجد میں خطبہ دینے والے یا کسی اسٹیج پر تقریر کرنے والے خطیب کے لیے ضروری ہے کہ وہ درس نظامی کا مستند فاضل ہو، اسلامی تاریخ کا مکمل مطالعہ رکھتا ہو، یہودیت، عیسائیت، ہندو ازم، سکھ مت اور بدھ مت جیسے مذاہب کے بارے میں ضروری معلومات اسے حاصل ہوں اور اسلام کے ساتھ ان مذاہب کے اعتقادی اور معاشرتی فرق پر اس کی نظر ہو، مسلم ممالک میں دور غلامی کے دوران علماء کی جدوجہد اور دینی تحریکات سے واقف ہو، یورپ میں اجتماعی زندگی کے حوالہ سے مادی فلسفہ سے عیسائیت کی شکست کے تاریخی پس منظر سے آگاہ ہو، مطالعہ کا ذوق رکھتا ہو اور اپنی علاقائی زبان کے علاوہ اردو اور انگلش میں گفتگو پر بھی اسے قدرت حاصل ہو۔ ان اوصاف کے بغیر اگر کوئی شخص یورپ کی کسی مسجد میں منبر رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر بیٹھتا ہے تو میں نہیں سمجھتا کہ وہ یہاں بسنے والے مسلمانوں کی دینی راہنمائی کا حق ادا کر سکتا ہے۔ وقت گزارنا اور بات ہے اور دینی راہنمائی کے فریضہ کی ادائیگی اس سے بالکل مختلف چیز ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ اس وقت جو ائمہ اور خطباء برطانیہ اور یورپ کی مساجد میں موجود ہیں اور اس معیار پر پورے نہیں اترتے، ان کا کیا کیا جائے؟ ان کے لیے میرے خیال میں ایسے ریفریشر کورسوں کا اہتمام کیا جاسکتا ہے جو کمزوریوں کو دور کر سکیں۔ یہ کورس سال میں ایک ماہ یا وقفہ وقفہ سے پندرہ روز کے لیے ہو سکتے ہیں یا خط و کتابت کورسز کے ذریعہ بھی اس خلا کو پر کیا جاسکتا ہے، لیکن شرط یہ ہے کہ بڑے ادارے اس طرف متوجہ ہوں اور خود ائمہ اور خطباء بھی اس کی ضرورت کا احساس اپنے اندر پیدا کریں۔

تیسرا درجہ مدرسین اور اسکالرز کا ہے جن کے ساتھ مفتیان کرام کو بھی شامل کیا جاسکتا ہے۔ یہ دینی راہ نمائی کی اعلیٰ سطح ہے اور اس کے لیے اسی درجہ کے ذہین علماء کی ضرورت ہے جو تدریس اور افتاء کے ساتھ ساتھ تحقیق و مطالعہ کے میدان میں بھی علماء اور طلبہ کی راہنمائی کر سکیں۔ اس طبقہ کے

افراد کے لیے از حد ضروری ہے کہ وہ کسی نہ کسی زبان میں اچھا لکھنے پر قادر ہوں، مسائل کے تجزیہ و تحقیق اور استنباط اور استخراج کی صلاحیت سے بہرہ ور ہوں اور اسلام کے بارے میں مغربی میڈیا کی زبان اور لہجہ کو اچھی طرح سمجھتے ہوئے اسی زبان میں اس کا جواب دینے کی اہلیت رکھتے ہوں۔ یہ طبقہ خود بخود نہیں پیدا ہوگا، اس کے لیے بڑے دینی مدارس کو تربیتی شعبے قائم کرنا ہوں گے، تخصص کے کورس ترتیب دینا ہوں گے اور مستقل اکیڈیمیاں قائم کرنا ہوں گی۔

ایک مسلمان کی شخصی دینی ضروریات اور یورپ میں بسنے والی مسلم کمیونٹی کی اجتماعی دینی ضروریات کے ساتھ ہم نے یورپی معاشرہ کی مجموعی دینی ضروریات کا بھی ذکر کیا تھا۔ اس سے مراد یہ ہے کہ جس معاشرہ میں ہم رہتے ہیں، اس کا بھی ہم پر حق ہے کہ اس کے افراد تک اسلام کی دعوت کو صحیح طریقہ سے پہنچائیں اور یہ ہمارے دینی فرائض میں شامل ہے جس کی ادائیگی کے بارے میں روز محشر ہم سے پرسش ہوگی۔ اس لیے اس پہلو پر بھی سنجیدگی کے ساتھ توجہ کی ضرورت ہے۔ یہ درست ہے کہ تبلیغی جماعت اس سلسلہ میں پوری مسلمان آبادی کی طرف سے فرض کفایہ ادا کر رہی ہے اور ہمیں اس اس کا شکر گزار ہونے کے ساتھ اس کی کامیابی کے لیے دعا گو اور عملاً اس کا معاون بھی بننا چاہیے، لیکن اس میں کوئی شبہ نہیں کہ یہ کام اصلاً علماء کرام کا ہے اور وہی اس کام کو صحیح طریقہ سے سرانجام دے سکتے ہیں، مگر اس کے لیے ضروری ہے کہ دینی مدارس اپنے تعلیمی نصاب و نظام میں دعوت اسلام کے لیے طلبہ کی ذہن سازی اور اس کی عملی تربیت کو ایک مستقل مضمون کی حیثیت سے شامل کریں جس میں یہاں کی معاشرتی نفسیات اور دعوت اسلام کے دیگر تقاضوں کو سمو دیا جائے تاکہ فارغ ہونے والے علماء کرام اس فریضہ سے غافل اور بے توجہ نہ ہوں۔

ان گزارشات کے بعد مولانا محمد کمال خان کے استفسار کے حوالہ سے ایک بڑے دینی جامعہ کے لیے تعلیمی نصاب کا ایک خاکہ اپنی ذاتی سوچ اور مطالعہ کی بنیاد پر پیش کر رہا ہوں:

یورپ میں قائم ہونے والے کسی بھی بڑے دینی جامعہ کے لیے سب سے پہلے یہ ضروری ہے کہ یہاں سرکاری طور پر جتنی تعلیم لازمی ہے، اس کی کلاسوں کا اہتمام جامعہ میں کیا جائے اور ثانوی حیثیت سے نہیں بلکہ ایک معیاری اسکول ہو جس کا معیار تعلیم سرکاری اسکولوں سے کسی طرح کم نہ ہو، البتہ ماحول اپنا ہو تاکہ مسلم نوجوان عصری تعلیم میں دیگر آبادی سے پیچھے نہ رہیں اور یہاں کے تعلیمی

ماحول کے برے اثرات سے بچ سکیں۔ یہ تعلیم علماء اور حفاظ کے لیے بھی ازحد ضروری ہے، بالخصوص انگلش زبان کو اس حد تک اہمیت دی جائے کہ دینی جامعات کے فضلاء تحریری اور تقریری طور پر مافی الضمیر کا اظہار عمدگی سے کر سکیں۔ قرآن کریم ناظرہ، ابتدائی عربی گریمر، کم از کم ایک پارہ حفظ اور عقائد و احکام کی بنیادی تعلیم کو اسی اسکول کے نصاب میں سمو دیا جائے اور احادیث نبویہ کا ایک منتخب حصہ بھی اس میں شامل کیا جائے۔

دوسرے مرحلہ پر خالص دینی تعلیم کے لیے درس نظامی کی طرز پر ایک متوسط نصاب ترتیب دیا جائے جس کا دورانیہ پانچ سال سے زائد نہ ہو۔ اس میں عربی صرف و نحو شامل کیے جائیں لیکن اس سطح پر چار امور کا اہتمام ازحد ضروری ہے:

۱. زیر درس کتابوں میں مضامین کا بہت زیادہ تکرار نہ ہو۔
۲. مضامین طلبہ کو رٹانے کی بجائے قواعد ذہن نشین کرا کے اجرائے تمرین کے ذریعہ ان کی ذاتی استعداد کو اجاگر کیا جائے۔
۳. سیرت النبی صلی اللہ علیہ وسلم، دور صحابہ رضی اللہ عنہم اور اسلام کی مجموعی تاریخ کو اس نصاب میں لازماً شامل کیا جائے۔
۴. ہر مضمون میں قدیم کتابوں کے ساتھ ساتھ دور حاضر میں لکھی گئی ایک ایک دو دو نئی کتابیں بھی شامل نصاب کی جائیں تاکہ طلبہ ان علوم میں نئے رجحانات سے نابلد نہ رہیں۔

تیسرے مرحلہ میں میرے نزدیک دورۂ حدیث ہونا چاہیے، لیکن موجودہ طرز پر ہرگز نہیں۔ میں دورۂ حدیث کے لیے صحاح ستہ کی تعلیم کے موجودہ نصاب سے متفق ہوں، اس کی برکات و اہمیت کو پوری طرح تسلیم کرتا ہوں، لیکن یہ مرحلہ دو سال میں ہونا چاہیے کیونکہ دورۂ حدیث کے طلبہ کی غالب اکثریت موجودہ طرز میں احادیث کے مضامین کا ادراک نہیں کر پاتی اور احادیث کے اتنے بڑے ذخیرہ سے یوں گزر جاتی ہے جیسے کوئی شخص نیم خوابی کی حالت میں اونگھتے ہوئے ایک بڑے باغ سے گزر جائے اور پھر یہ بیان کرتا پھرے کہ میں نے باغ میں یہ دیکھا، وہ دیکھا۔ اس لیے میرے خیال میں دورۂ حدیث کے دورانیہ میں ایک سال کا اضافہ ضروری ہے۔

اس کی ترتیب یہ ہو کہ پہلے سال صحاح ستہ کی دو کتابوں کے ساتھ ساتھ طلبہ کو اصول حدیث کا اعادہ کرایا جائے اور اس میں سنت کی اہمیت، حجیت حدیث پر دور حاضر کے اعتراضات و شبہات کا جواب ذہن نشین کرایا جائے، قانون سازی کے موجودہ تصورات کا اصول فقہ سے تقابل کرا کے طلبہ کو آئین و قانون کے بارے میں اسلامی اصولوں سے واقف کرایا جائے، تجارت، بنکاری، قانون، اجتہاد، سیاست، معاشرت، انسانی حقوق، جدلی معاشیات، نظریہ ارتقا اور دیگر ضروری اجتماعی مباحث سے انہیں متعارف کرایا جائے، نیز اسی سال کے دوران حجۃ اللہ البالغہ کے چند منتخب مباحث بھی شامل نصاب کیے جائیں اور اس ایک سالہ تیاری کے بعد دوسرے سال میں انہیں صحاح ستہ کی باقی چار کتابیں پڑھائی جائیں تاکہ وہ حدیث و سنت کے اتنے بڑے ذخیرہ سے اچھی طرح روشناس ہوں اور عملی زندگی میں انہیں کسی مسئلہ میں راہنمائی کی ضرورت ہو تو اس ذخیرہ سے استفادہ کر سکیں۔ اس مرحلہ کے بعد طالب علم کو فاضل کی سند دی جائے۔

اس کے بعد چوتھا درجہ تخصصات کا ہے اور ایک بڑے جامعہ میں کسی بھی اسلامی موضوع پر تخصص کی سہولت موجود ہونی چاہیے، لیکن چند مضامین دور حاضر کے تقاضوں کے مطابق بہت زیادہ اہم ہیں اور ان میں تخصص کے شعبوں کا قیام ازبس ضروری ہے۔

مذاہب باطلہ:

عیسائیت، یہودیت، ہندوازم، بدھ مت اور دیگر مذاہب سے اس کا ذوق رکھنے والے علماء کو مکمل واقفیت کرائی جائے، لیکن صرف اعتقادی مباحث کو مناظرانہ انداز میں رٹانے پر اکتفانہ کیا جائے بلکہ ان مذاہب کے ساتھ اسلام کے تعلقات کے تاریخی تناظر، تہذیبی تصادم اور موجودہ دور میں ان کے مابین درپیش عملی مسائل سے بھی ان کو روشناس کرایا جائے۔

فقہی مذاہب:

احناف، شوافع، حنابلہ، مالکیہ اور دیگر فقہی مذاہب اپنے علماء اور طلبہ کو اپنی فقہ کی ترجیحی بنیادوں اور دلائل سے واقف کرانا چاہیں تو یہ بہت بہتر ہے بلکہ اس کا بہت بڑا حصہ احادیث کی کتابوں کی تدریس میں خود بخود آجاتا ہے، لیکن اس کا دائرہ فقہی اور فروعی ہی رکھا جائے اور ان فقہی مذاہب کے مابین محاذ آرائی کی فضا پیدا کرنے سے گریز کیا جائے۔

تاریخ اسلام:

تاریخ اسلام کو دوسرے درجہ کے نصاب میں شامل کرنے کی تجویز پہلے گزر چکی ہے، لیکن وہاں صرف تاریخ سے واقفیت مراد ہے، جبکہ علماء اسلام کے ایک طبقہ کی تاریخ کے تقابلی مطالعہ پر گہری نظر ہونی چاہیے اور اس میں تخصص کا شعبہ ضروری ہے، بالخصوص آج کے دور میں ایک عالم دین کے لیے دور نبوی، خلافت راشدہ، صلیبی جنگوں، یورپ میں جدید فلسفہ اور کلیسا کی تاریخی کشمکش اور مسلم ممالک پر استعماری قوتوں کے قبضہ کے دوران وہاں کی دینی تحریکات سے آگاہی انتہائی ضروری ہے، کیونکہ اس کے بغیر وہ سمجھ نہیں سکتا کہ آج کے دور میں دعوت اسلام کا تقاضا کیا ہے اور اسلام کی بات کو اس نے کس انداز میں پیش کرنا ہے۔

خطابت و دعوت:

خطیب اسلام کا داعی ہے، وہ اسلام کی دعوت، پیغام اور احکام کو معاشرہ کے سامنے پیش کرتا ہے، اس لیے اسے خطابت اور دعوت دونوں کے تقاضوں سے بہرہ ور ہونا چاہیے اور اس مقصد کے لیے تخصص کے ایک مستقل شعبہ کا قیام ضروری ہے۔

افتا:

فقہ و افتا میں تخصص کے شعبے پاکستان کے بڑے جامعات میں موجود ہیں۔ اس طرز پر یہاں بھی یہ شعبہ قائم ہونا چاہیے۔

میڈیا:

الیکٹرانک میڈیا اور اخبارات و جرائد آج کے دور میں ابلاغ کا سب سے بڑا ذریعہ ہیں بلکہ رائے عامہ پر دراصل انہی کا کنٹرول ہوتا ہے، اس لیے ان سے کلیتاً صرف نظر ممکن نہیں ہے۔ ضروری نہیں کہ سب ذرائع بیک وقت اختیار کیے جائیں، لیکن جن ذرائع کو استعمال میں لایا جاسکتا ہے، انہیں ضرور اختیار کیا جائے اور اسے ''کیف ما اتفق'' لوگوں کی صوابدید پر نہ چھوڑ دیا جائے، بلکہ علماء کو اس کی باقاعدہ تربیت دی جائے، بالخصوص صحافت کے جدید طرز سے علماء کا واقف ہونا اسی طرح ضروری ہے جیسے خطابت اور دعوت کے اصولوں سے آگاہی لازمی ہے اور اس مقصد کے لیے بڑے جامعات کو

مستقل تربیتی شعبہ قائم کرنا چاہیے۔

اسلام اور دور حاضر:

یہ ایک مستقل مضمون ہے، اس لیے کہ کمیونزم کی شکست وریخت کے بعد مغربی دنیا کا سب سے بڑا ہدف اب اسلام ہے اور اسلام کے حقیقی نظریات و افکار کو دبائے رکھنے اور مسلمانوں کی نئی نسل بالخصوص دانش ور طبقہ کو مرعوبیت کے حصار میں بند رکھنے کے لیے وہ اپنے تمام وسائل اور صلاحیتیں صرف کر رہی ہے۔ اسلام اور مسلمانوں کے حوالہ سے مغرب کی سرگرمیوں کا مطالعہ، تجزیہ اور اس کے پھیلائے ہوئے اعتراضات و شبہات کے جوابات کے لیے بڑے دینی جامعات میں الگ الگ شعبے قائم ہونے چاہئیں جن میں اس انتہائی اہم فریضہ کی ادائیگی کے ساتھ ساتھ ذہین اور ذی استعداد علماء کی تربیت کا بھی اہتمام ہو۔

روحانی تربیت:

آخر میں اس پورے تعلیمی نظام کی اصل روح کا ذکر ضروری سمجھتا ہوں جس کے بغیر تعلیم و تدریس کا بڑے سے بڑا نظام بھی بے جان لاشہ ہے اور وہ ہے تزکیہ نفس اور روحانی تربیت کا اہتمام جس سے بے اعتنائی نے ہمارے مروجہ تعلیمی نظام کو بڑی حد تک بے ثمر کر رکھا ہے۔ میں نے بہت سخت بات لکھ دی ہے، لیکن حالات کا تجزیہ کیا جائے تو اس سے نرم الفاظ اس کی تعبیر کے لیے نہیں ملیں گے۔ یہ درست ہے کہ روحانی سلسلوں میں اہلیت کا معیار کم ہوتا جا رہا ہے اور دکانداریاں بڑھ رہی ہیں، لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ اس سے دست برداری اختیار کر لی جائے۔ ضرورت کی کوئی چیز اگر بازار میں خالص نہ مل رہی ہو تو اس کی تلاش ترک کر دینا عقلمندی کا راستہ نہیں ہے۔ اس کساد بازاری میں بھی اللہ والے یقیناً موجود ہیں، ان سے علماء اور طلبہ کا تعلق ہونا چاہیے اور مدارس کو اس کا اہتمام کرنا چاہیے۔ میرے نزدیک دینی مدارس سے فارغ التحصیل ہونے والے طالب علم کے لیے دو باتوں میں سے ایک بہرحال ضروری ہے: یا تو اس کا کسی صاحب نسبت بزرگ سے تربیت کا تعلق ہو یا اس نے تبلیغی جماعت کے ساتھ کچھ وقت لگا رکھا ہو، اس کے بغیر عملی تربیت کا وہ رنگ نہیں چڑھتا جو آج کے معاشرہ میں ایک باکردار عالم دین پر غالب ہونا ناگزیر ہے۔

مولانا محمد کمال خان کا شکر گزار ہوں کہ ان کے توجہ دلانے پر تعلیمی نظام کے بارے میں گزارشات قلم بند کرنے کی توفیق مل گئی۔ اللہ تعالیٰ انہیں جزائے خیر دے اور ان گزارشات میں جو بات صحیح اور مسلمانوں کے لیے مفید ہو، اسے اپنانے کی ہم سب کو توفیق عطا فرمائیں۔ آمین یا الٰہ العالمین۔

(الشریعہ، دسمبر ۱۹۹۲ء)

دینی مدارس کا تعلیمی نصاب اور چند ناگزیر جدید تقاضے

دو تین روز جامعہ الہدیٰ نوٹنگھم کی تعلیمی مشاورت میں گزرے۔ یہ جامعہ، مدنی ٹرسٹ نوٹنگھم کے زیر اہتمام مصروف عمل ہے جس کے چیئرمین میرپور آزاد کشمیر سے تعلق رکھنے والے مولانا حکیم اختر الزمان غوری اور سیکرٹری سیاکھ آزاد کشمیر کے مولانا رضاء الحق ہیں۔ جامعۃ الہدیٰ کے دو حصے ہیں۔ طالبات کے لیے اس کا تعلیمی نظام نوٹنگھم میں ہے جو ایک وسیع اور خوبصورت بلڈنگ میں ہے اور جہاں اسکول کی مروجہ تعلیم کے ساتھ ساتھ معیاری دینی تعلیم کا نظم موجود ہے۔ گیارہ سال کی بچیوں کے لیے سات سالہ اور سولہ سال کی بچیوں کے لیے چار سالہ کورس ہے جس میں قرآن وحدیث، فقہ اسلامی، تاریخ، عربی زبان اور دیگر متعلقہ علوم کی تعلیم دی جاتی ہے۔ مختلف درجات میں دو سو کے لگ بھگ طالبات ہیں جو ہاسٹل میں رہتی ہیں۔ لڑکوں کے لیے شیفیلڈ میں ایک اسکول کی عمارت خرید کر اس میں جامعۃ الہدیٰ کا قیام عمل میں لایا گیا ہے۔ اس کی تعلیمی مشاورت اور امتحانی نظام میں محترم ڈاکٹر محمود احمد غازی آف اسلام آباد اور حضرت مولانا سید سلمان ندوی آف لکھنو کو سرپرست کی حیثیت حاصل ہے جو وقتاً فوقتاً جامعہ میں آتے رہتے ہیں۔ مولانا محمد عیسیٰ منصوری، مولانا محمد اکرم ندوی اور راقم الحروف بھی اس مشاورتی نظام کا حصہ ہیں، اس لیے جب بھی حاضری ہوتی ہے، جامعہ کے پرنسپل مولانا رضاء الحق سیاکھوی باقی مصروفیات کو سمیٹ کر دو تین روز کی مسلسل مشاورت کی بساط پھیلا لیتے ہیں۔ جامعہ کے تعلیمی نظام کا جائزہ لیا جاتا ہے، کارکردگی پر بحث ہوتی ہے، نصاب کی کانٹ چھانٹ ہوتی ہے اور مستقبل کے منصوبے زیر بحث آتے ہیں۔

اس دفعہ بھی یہی ہوا اور ۲۴، ۲۵، ۲۶ ستمبر کے تینوں ایام اسی مشاورت میں گزرے۔ ہمارے ہاں پاکستان میں اس طرح کی طویل نشستوں کا معمول نہیں ہے۔ ہم تو زیادہ سے زیادہ چار پانچ گھنٹے کی مشاورتی محفلوں کے عادی ہیں مگر مولانا رضاء الحق برطانوی نظام تعلیم سے واقف ہیں، ان کے سسٹم کو سمجھتے ہیں اور اپنے تعلیمی کام کو جاری رکھنے کے لیے ان سے واسطہ رکھتے ہیں، اس لیے دو چار گھنٹے کی کسی نشست پر ان کی تسلی نہیں ہوتی اور کسی بھی مسئلہ کی جزئیات وتفصیلات کو اچھی طرح کھنگالے بغیر ان کا

گزارا نہیں ہوتا، اس لیے سات سالہ اور چار سالہ نصابوں پر نظر ثانی میں ہمیں تین دن لگ گئے، پھر بھی سب امور پر حتمی فیصلے نہیں کر سکے اور بعض امور کو اگلے سال کی میٹنگ تک مؤخر کرنا پڑا۔ اس سال کی مشاورت میں حکیم اختر الزمان غوری، مولانا رضاء الحق، مولانا محمد اکرم ندوی، مولانا قاری عارف محمود سیاکھوی، مولانا قاری سید ابرار حسین شاہ ہزاروی اور راقم الحروف کے علاوہ اسلام آباد کے معروف تعلیمی مرکز ادارہ علوم اسلامی بھارہ کہو کے قاری محبوب الٰہی رحیمی بھی شریک تھے۔

یہاں کے تعلیمی مسائل بھی کم و بیش وہی ہیں جن سے ہمیں پاکستان میں واسطہ پڑتا ہے۔ عصری تعلیم یہاں لازمی ہے۔ اس کے ساتھ دینی علوم میں سے کون سے امور کو شامل کیا جا سکتا ہے اور دونوں میں توازن قائم رکھنے کے لیے کیا طریقہ کار اختیار کرنا چاہیے؟ دونوں نصاب پورے پڑھائے جائیں تو چند ذہین بچوں کے سوا باقی طلباء و طالبات کے لیے بھاری بھرکم نصاب بوجھ بن جاتا ہے۔ اسکول کی تعلیم کے نصاب اور معیار میں کمی رہ جائے تو طلباء اور ان کے والدین مطمئن نہیں ہوتے بلکہ یہاں کے لوکل تعلیمی سسٹم کو بھی شکایت ہوتی ہے اور اگر دینی تعلیم کا معیار کمزور ہو تو ہماری تسلی نہیں ہوتی اور ایسے جامعات کے قیام کا مقصد فوت ہو کر رہ جاتا ہے۔ دوسرا مسئلہ طلبہ و طالبات کے ذوق اور نفسیات کا ہے۔ انہیں جن مضامین کا امتحان دینے پر سرکاری سند یا ڈگری ملتی ہے، ان پر ان کی توجہ طبعی طور پر زیادہ ہوتی ہے اور وہ دینی علوم جن پر حاصل ہونے والی سند ان کے لیے ملازمت یا مزید تعلیمی ترقی کے لیے زیادہ سودمند نہیں ہوتی، وہ اس درجہ کی توجہ نہیں حاصل کر پاتے۔ تیسرا مسئلہ اساتذہ کا ہے کہ تعلیمی نصاب و نظام میں جن تبدیلیوں کے ہم خواہاں ہیں، ان کے لیے اساتذہ کی ذہنی تیاری اور عملی تربیت کا ماحول موجود نہیں ہے۔ انہوں نے کسی اور ماحول میں تعلیم حاصل کی ہے اور ہم ان سے مختلف ماحول میں کام لینا چاہتے ہیں۔

پھر جامعۃ الہدیٰ میں ایک اور تجربہ سے بھی گزرنا پڑ رہا ہے۔ یہاں عرب اساتذہ اور استانیاں بھی ہیں اور ہمارے جنوبی ایشیا کے مدارس سے تعلیم اور تربیت حاصل کرنے والے اساتذہ اور استانیاں بھی ہیں۔ دونوں کا تعلیمی پس منظر مختلف ہے۔ مثلاً عربی زبان کی تعلیم کو لے لیجیے۔ ہمارے ہاں زیادہ زور گریمر اور قواعد و ضوابط پر دیا جاتا ہے جبکہ عرب اساتذہ کے نزدیک اس کی چنداں اہمیت نہیں ہے اور وہ عربی زبان کو عرب ماحول کے مطابق بول چال کی زبان کے طور پر پڑھانا چاہتے ہیں۔ اسی طرح

ہمارے ہاں حدیث نبوی پڑھانے کا انداز اور ہے اور عربوں کا انداز اس سے بالکل مختلف ہے۔ اس کے ساتھ یہ الجھن بھی پیش آجاتی ہے کہ ہمارے اساتذہ اور استانیاں متصلب حنفی ہوتی ہیں جبکہ عرب اساتذہ اور استانیوں کا حنفی ہونا ضروری نہیں ہے۔ کوئی شافعی المذہب ہوگا، کوئی سلفی ہوگا اور کوئی حنبلی یا مالکی ہوگا۔ ان کے درمیان ہم آہنگی کا ماحول قائم ہوتے ہوئے وقت لگے گا اور اس عمل کو کئی رکاوٹوں اور مشکلات کے مراحل سے گزرنا ہوگا۔

یہاں ایک مرحلہ وہ بھی آتا ہے کہ اسکول کی عصری تعلیم لازمی نہیں رہتی اور تعلیمی نصاب کی بنیاد دینی علوم پر رکھی جا سکتی ہے مگر پھر یہ سوال اٹھ کھڑا ہوتا ہے کہ نصاب کی بنیاد دینی علوم پر رکھ کر اس میں عصری علوم میں سے کون سا مواد شامل کرنا ضروری ہے اور کون سے مضامین کو نظر انداز کیا جا سکتا ہے؟ مثال کے طور پر اسی مشاورتی دور میں ہونے والی ایک گرما گرم بحث کا حوالہ دینا چاہوں گا۔ مسئلہ زیر بحث یہ تھا کہ سولہ سال سے اوپر کے طلباء جو یہاں کے سرکاری تعلیمی نظام کے مطابق لازمی تعلیم کے دائرے سے نکل جاتے ہیں اور ان کے لیے ہم دینی علوم کی زیادہ سے زیادہ تعلیم کا اہتمام کر سکتے ہیں، ان کے نصاب میں سائنس، انگلش زبان اور ٹیکنالوجی کے مضامین شامل کیے جائیں یا نہیں؟ بعض دوستوں کی رائے یہ تھی کہ انہیں درس نظامی کے مطابق صرف دینی علوم پڑھائے جائیں مگر میری گزارش یہ تھی کہ پہلے آپ اپنا ہدف طے کریں کہ اس تعلیمی نظام کے ذریعے سے آپ معاشرہ کو دینی قیادت فراہم کرنا چاہتے ہیں اور امام، خطیب، مفتی، مدرس، قاری اور مبلغ و داعی پیدا کرنا آپ کا مقصود ہے یا آپ یہ چاہتے ہیں کہ دینی تعلیم اور تربیت سے بہرہ ور لوگ یہاں کی یونیورسٹیوں میں جائیں، اعلیٰ تعلیم حاصل کریں اور قومی زندگی کے مختلف شعبوں میں ممتاز مقام حاصل کریں؟ یہ دو الگ الگ ہدف ہیں۔ دونوں کی اہمیت و ضرورت مسلم ہے اور دونوں کے تقاضے مختلف ہیں۔ دینی قیادت فراہم کرنا مقصد ہے تو پھر دینی علوم کو ترجیح دینا ہوگی اور قرآن و حدیث اور فقہ اسلامی میں کامل مہارت کا اہتمام کرنا ہوگا اور اگر آپ اپنے تربیت یافتہ افراد کو یونیورسٹیوں اور سرکاری شعبوں میں بھیجنے کے خواہش مند ہیں تو پھر عصری علوم میں ان کا معیار بلند رکھنا ہوگا، کیونکہ اس کے بغیر وہ آگے نہیں بڑھ پائیں گے۔ پھر دینی قیادت کے حوالے سے بھی یہ مسئلہ غور طلب ہے کہ دینی علوم میں مکمل مہارت کے باوجود اگر ان کی انگلش معیاری نہیں ہے، عصر حاضر کے بارے میں ان کی معلومات ناقص ہیں یا وہ جن لوگوں

میں کام کرنا چاہتے ہیں، ان کی نفسیات اور ذہنی سطح سے ہی واقف نہیں ہیں تو دینی علوم میں ان کی مہارت بے معنی ہو کر رہ جائے گی اور وہ اس معاشرہ میں کوئی مؤثر کردار ادا نہیں کر سکیں گے۔

اسی بحث میں یہ پہلو بھی گرماگرم گفتگو کا موضوع بنا کہ دینی تعلیم کے نصاب میں سائنس اور جغرافیہ کا شامل ہونا ضروری ہے یا نہیں؟ ایک دوست اس بات پر مصر تھے کہ کوئی ضرورت نہیں ہے مگر میری رائے یہ تھی کہ بطور فن کے تو ضروری نہیں ہے، مگر بنیادی اور جنرل معلومات کی حد تک ان دونوں علوم کا شامل نصاب ہونا ضروری ہے۔ مثلاً ایک خطیب صاحب کو یہ معلوم نہیں کہ میکسیکو نامی ملک کون سے براعظم میں ہے اور وہ کسی حوالہ سے اپنے خطبہ میں اسے یورپ کا ملک بتا دیتے ہیں تو اس سے ان کے پڑھے لکھے سامعین میں ان کے بارے میں جو تاثر پیدا ہو گا، وہ ان کی دینی راہنمائی کے معیار کو بھی مشکوک بنا دے گا۔ اسی طرح اگر کسی عالم دین کے علم میں یہ بات نہیں ہے کہ ایٹم بم کیا ہے اور کیسے بنتا ہے اور وہ اس کے بارے میں درس میں کوئی اوٹ پٹانگ بات کہہ دیتا ہے تو اس سے اس کی شخصیت اور اعتماد پر جو منفی اثر پڑے گا، وہ ان کی دینی معلومات کے معیار کو بھی مجروح کر دے گا، اس لیے سائنس، جغرافیہ اور عمرانی علوم کا بنیادی معلومات کی حد تک دینی تعلیم کے نصاب میں شامل ہونا انتہائی ضروری ہے اور ان سے مکمل صرف نظر کرنا حکمت و دانش کے خلاف ہے۔

اس مشاورت کے دوران میں اور بعض دیگر محافل میں یہ سوال کیا گیا کہ ہم مدرسہ نصرۃ العلوم اور الشریعہ اکادمی گوجرانوالہ میں ان ضروری تبدیلیوں کے حوالے سے کیا کر رہے ہیں جن کا ہم اکثر تذکرہ کرتے رہتے ہیں۔ میں نے دوستوں کو بعض باتوں سے آگاہ کیا تو ایک صاحب نے کہا کہ ان کا ذکر آپ کے کسی کالم میں تفصیل کے ساتھ ہونا چاہیے تاکہ دوسرے حضرات بھی اس کے بارے میں سوچ سکیں اور کوئی رائے قائم کر سکیں۔

میں نے دوستوں کو بتایا کہ مدرسہ نصرۃ العلوم گوجرانوالہ کے دورۂ حدیث کے نصاب میں حضرت امام شاہ ولی اللہ دہلویؒ کی حجۃ اللہ البالغۃ ابتدا سے مستقل طور پر شامل ہے۔ عم مکرم حضرت مولانا صوفی عبدالحمید سواتی دامت برکاتہم نے کم و بیش چالیس سال تک یہ کتاب دورۂ حدیث کے طلباء کو پڑھائی ہے اور اب چند سال سے یہ خدمت میرے سپرد ہے۔ اس کے علاوہ گزشتہ دو سال سے ہم نے دورۂ حدیث کے مضامین میں دو باتوں کا اضافہ کیا ہے: ایک یہ کہ آج کے بین الاقوامی قوانین بالخصوص انسانی

حقوق کا فلسفہ و نظام کیا ہے اور اسلامی احکام و قوانین کے ساتھ اس کا کہاں کہاں ٹکراؤ ہے۔ دوسرے نمبر پر معاصر ادیان مثلاً یہودیت، مسیحیت، ہندو ازم، بدھ مت، سکھ مت وغیرہ کا ضروری تعارف اور آج کے معروضی حالات میں اسلام اور مسلمانوں کے ساتھ ان کا تقابلی مطالعہ بھی ایک مضمون کے طور پر شامل کیا گیا ہے اور یہ دونوں مضامین میں خود پڑھاتا ہوں۔ اس کے ساتھ ہماری کوشش ہوتی ہے کہ احادیث کی قراءت و تعلیم کے دوران میں طلباء کو یہ بتایا جائے کہ اس حدیث کا آج کے علمی مسائل کے ساتھ کیا تعلق ہے اور جدید فکری، علمی اور فقہی مسائل کا حل قرآن و سنت کی روشنی میں کیسے تلاش کیا جانا چاہیے۔

اسی طرح الشریعہ اکادمی گوجرانوالہ میں ہم درس نظامی کے فضلاء کا ایک سالہ کورس چلا رہے ہیں جس میں انہیں حجۃ اللہ البالغۃ کے منتخب ابواب کے علاوہ معاصر ادیان و مذاہب کا تقابلی مطالعہ، انگلش اور عربی زبانیں، نفسیات و معاشیات اور جنرل سائنس کا تعارفی مطالعہ، کمپیوٹر ٹریننگ اور ضروری تاریخ کے ساتھ ساتھ مضمون نویسی کی مشق کرائی جاتی ہے اور کسی موضوع پر ان سے مقالہ لکھوایا جاتا ہے۔ گزشتہ دو سال میں ہمارے پاس اس کورس میں پانچ پانچ علماء کرام نے شرکت کی ہے جبکہ تیسرے سال کا کورس رمضان المبارک کے بعد شروع ہو رہا ہے جس کے داخلہ کے لیے ہم نے یہ شرط رکھی ہے کہ درس نظامی کا فارغ التحصیل ہو، لکھنے پڑھنے کا ذوق رکھتا ہو، اور کم از کم میٹرک ہو۔ اس کے علاوہ گزشتہ سال شوال میں ہم نے الشریعہ اکادمی گوجرانوالہ میں دینی مدارس کے اساتذہ کے ایک سیمینار کا اہتمام کیا تھا جس میں خود دینی مدارس کے اساتذہ نے اپنے نصاب و نظام کے بارے میں کھل کر اظہار خیال کیا تھا اور اس کی بنیاد پر ایک رپورٹ مرتب کی گئی، جبکہ اس سال ۱۰ شوال/۲۲ نومبر کو دینی مدارس کے اساتذہ کے لیے ایک ورکشاپ کا اہتمام کیا جا رہا ہے جس کا عنوان "دینی مدارس میں عمرانی علوم کی تعلیم و تدریس کی اہمیت" طے کیا گیا ہے۔ مختلف دینی مدارس کے اساتذہ تشریف لائیں گے اور اس موضوع پر اظہار خیال کریں گے اور ان کے خیالات و ارشادات کی روشنی میں ایک رپورٹ مرتب کر کے دینی مدارس کے ارباب حل و عقد کی خدمت میں پیش کی جائے گی، ان شاء اللہ تعالیٰ۔

(روزنامہ اسلام، ۱۵ اکتوبر ۲۰۰۴ء)

بچیوں کی تعلیم اور نصاب تعلیم

دو روز قبل اتوار کو جامعۃ الہدیٰ نوٹنگھم میں ایک خصوصی نشست تھی جس میں جامعہ میں تعلیم حاصل کرنے والی طالبات کے والدین کو بلایا گیا تھا۔ جامعہ کے پرنسپل مولانا رضاء الحق سیاکھوی نے مجھے طالبات کے والدین سے گفتگو کے لیے کہا اور میں نے اس موقع پر دو امور کی طرف بطور خاص توجہ دلائی:

ایک یہ کہ دینی ذمہ داریوں میں مردوں کے ساتھ عورتیں بھی برابر کی شریک ہیں اور فرائض و واجبات کے ساتھ ساتھ سزا و جزا میں بھی ان کا برابر کا حصہ ہے۔ فرائض و واجبات، حلال و حرام، حقوق و معاملات اور آداب و اقدار، ہر معاملہ میں ان کے لیے وہی مسائل و احکام ہیں جو مردوں کے لیے ہیں۔ مردوں اور عورتوں کے مسائل و احکام میں مردوں اور عورتوں کے درمیان اسلام نے صرف وہاں فرق کیا ہے جہاں مرد اور عورت کے نوعی امتیاز اور عورت کی مخصوص ذہنی و جسمانی ساخت اور دائرۂ کار کے لحاظ سے ضروری تھا، ورنہ کم و بیش سبھی معاملات میں قرآن و سنت میں مردوں اور عورتوں سے یکساں خطاب کیا گیا ہے۔ انہی امور میں علم حاصل کرنا اور اس کی تعلیم و اشاعت بھی ہے۔ جس طرح مرد علم حاصل کرنے اور اسے اگلی نسلوں تک منتقل کرنے کے مکلف ہیں، اسی طرح عورت کے لیے بھی ضروری ہے کہ وہ علم حاصل کرے اور اس پر خود عمل کرنے کے ساتھ ساتھ معاشرے میں اس کی اشاعت و تعلیم کے لیے متحرک کردار ادا کرے۔

جناب سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے تلامذہ اور تربیت یافتگان میں جہاں مردوں کی بہت بڑی تعداد ہے، وہاں بے شمار عورتیں بھی درس گاہ نبوی سے فیض یاب ہوئی ہیں اور صحابیات رضی اللہ عنہن کی ایک بڑی تعداد ہے جنھوں نے قرآن و سنت کی تعلیم اور پھر تدریس و اشاعت میں نمایاں کردار ادا کیا ہے۔ ام المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو تو بطور خاص اس مقصد کے لیے تعلیم دی گئی تھی اور ان کی تربیت کی گئی تھی کہ وہ امت کی خواتین کو تعلیم دیں اور ان کی دینی تربیت کریں۔ انہوں نے عمر کا وہ حصہ جو تعلیم حاصل کرنے کی عمر ہوتی ہے، ایک بیوی کے طور پر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے گھر میں

گزارا۔ وہ نو سال کی عمر میں حرم نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں آئیں اور اٹھارہ سال کی عمر تک اس سرچشمہ علم سے استفادہ کرتی رہیں ور پھر کم و بیش نصف صدی تک انہوں نے درس گاہ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے اس شعبے کو مسند نشین کی حیثیت سے آباد کیا۔ وہ جن علوم میں دسترس رکھتی تھیں اور جن میں ان سے خواتین کی ایک بڑی تعداد کے ساتھ ساتھ مردوں نے بھی فیض حاصل کیا، ان میں قرآن و سنت، ادب و شعر، نسب و تاریخ اور میراث و فرائض کے ساتھ ساتھ طب و علاج کے علوم بھی شامل ہیں۔ ان کے بھانجے اور شاگرد حضرت عروہ بن زبیر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے ان علوم میں اپنے دور میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے بڑا کوئی عالم نہیں دیکھا۔

حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا کے بارے میں خود جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک صحابیہ حضرت شفا عدویہ رضی اللہ عنہا کو ہدایت فرمائی کہ وہ انہیں لکھنا پڑھنا سکھا دیں اور حضرت اسعد بن زرارہ رضی اللہ عنہ کی پوتی حضرت عمرہ بنت عبد الرحمن رضی اللہ عنہا، ام المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی سیکرٹری کے طور پر خط و کتابت کی ذمہ داری سنبھالے ہوئے تھیں۔ یہ وہی عمرہ رضی اللہ عنہا ہیں کہ جب امیر المومنین حضرت عمر بن عبد العزیز رضی اللہ عنہ نے احادیث نبویہ کو باقاعدہ سرکاری طور پر محفوظ کرنے کا فیصلہ کیا اور اس کے لیے صوبوں کے عمّال کو ہدایات جاری کیں تو مدینہ منورہ کے قاضی کو لکھا کہ حضرت عمرہ رضی اللہ عنہا کے علوم و روایات کو جمع و محفوظ کرنے کا خصوصی اہتمام کیا جائے، اس لیے کہ وہ ام المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے علوم کی وارث ہیں۔

اس کے بعد بھی امت میں ہمیشہ معلمات، فقیہات، محدثات اور مفتیات کی ایک بڑی تعداد موجود رہی ہے۔ ہمارے ایک دوست جو محدثات کے حالات زندگی مرتب کر رہے ہیں، بتاتے ہیں کہ وہ آٹھ ہزار محدثات کے حالات زندگی منضبط کر چکے ہیں جس سے امت کی خواتین میں علمی ذوق کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ البتہ گزشتہ ڈیڑھ دو صدیوں میں جب دینی تعلیم کے فروغ کی طرف سرکاری اور عمومی توجہ نہ رہی اور محدود سطح پر دینی مدارس کے قیام کا رضاکارانہ نظام وجود میں آیا تو وسائل اور مواقع کی کمی کے باعث خواتین کی تعلیم کا کوئی خاطر خواہ نظم قائم نہ ہو سکا اور اس شعبے میں خلا پیدا ہوتا گیا۔ اس کی وجہ یہ نہیں تھی کہ عورتوں میں دینی تعلیم کی ضرورت نہیں ہے، بلکہ اس کا باعث یہ تھا کہ دینی تعلیم کا سوسائٹی میں اہتمام کرنے والوں کے پاس وسائل اور مواقع اس قدر موجود نہیں تھے کہ وہ

اس کو بھی اپنے ایجنڈے میں شامل کر سکتے، چنانچہ جونہی حالات نے موافقت کی، خواتین کی دینی تعلیم و تربیت کے مدارس قائم ہونا شروع ہو گئے اور اب ان کی تعداد شاید مردوں کے دینی مدارس سے بھی بڑھتی جا رہی ہے۔

اس بات کے لیے بھی کسی دلیل کی ضرورت نہیں ہے کہ خواتین میں تعلیم کے فروغ کے لیے ابتدائی مرحلے کے بعد خواتین معلمات ہی ناگزیر ہیں اور اس شعبے میں ہمارے یہاں بہت بڑا خلا پایا جاتا ہے۔ اسی طرح یہ بات بھی ناقابل فہم نہیں ہے کہ عورتیں اپنے مسائل کے بارے میں رہنمائی حاصل کرنا چاہیں تو خواتین مفتیات ہی ان کی زیادہ بہتر طور پر رہنمائی کر سکتی ہیں۔ اس لیے ضروری ہے کہ اس ضرورت کو محسوس کیا جائے اور خواتین معلمات اور مفتیات کی تیاری کی طرف توجہ دی جائے اور یہ "کیف ما اتفق" نہ ہو بلکہ وہ طالبات جو زیادہ باصلاحیت ہوں اور دوران تعلیم ان کے ذوق اور صلاحیت و استعداد کو ان کے اساتذہ نے چیک کر لیا ہو، ان کا انتخاب کیا جائے اور انہیں اس مقصد کے لیے اہتمام کے ساتھ تیار کیا جائے۔ اس کے لیے والدین کو زیادہ ایثار کا مظاہرہ کرنا ہوگا کہ وہ باصلاحیت طالبات کے بارے میں اپنی ترجیحات کا تعین اس انداز سے کریں کہ انہیں اگلے مرحلے کے لیے آسانی کے ساتھ تربیت دی جا سکے۔

(روزنامہ اسلام، ۱۹ جون ۲۰۰۵ء)

(جامعہ الہدیٰ ٹوتھم میں تقسیم انعامات کی سالانہ تقریب
کے موقع پر گفتگو)

ہمارے ہاں دینی حلقوں میں عام طور پر یہ بحث رہتی ہے کہ لڑکیوں کی تعلیم کا نصاب کیا ہونا چاہیے اور بچیوں کے لیے مخصوص دینی مدارس میں طالبات کو کیا کچھ پڑھانا چاہیے؟ میں سمجھتا ہوں کہ اس سلسلے میں ہمارے سامنے سب سے بڑا اور روشن اسوہ ام المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی ذات گرامی ہے جو درس گاہ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کی سب سے کامیاب طالبہ اور امت کی سب سے بڑی معلمہ تھیں۔ ان کے علمی فضل و کمال کا یہ عالم تھا کہ ان کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ نصف دین

ان سے حاصل کیا جائے۔ یہ نصف اگر مقدار کے لحاظ سے نہ بھی ہو تو کیفیت کے لحاظ سے ضرور نصف دین ہے کہ چار دیواری کے اندر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی اور تعلیمات کا کم و بیش نوے فیصد حصہ انہی سے روایت ہے۔ وہ حدیث نبوی کی سب سے بڑی راویہ ہیں۔ انہیں دور صحابہ کے ان سات بڑے مفتیوں میں شمار کیا جاتا ہے جو خلافت راشدہ کے دور میں فتویٰ دیا کرتے تھے۔ وہ فتویٰ بھی دیتی تھیں، دوسرے مفتیوں کے فتوے پر نقد کرتی تھیں اور اجتہاد کا حق پورے اعتماد کے ساتھ استعمال کرتی تھیں۔ وہ قرآن کریم کی مفسرہ تھیں اور احکام اسلام کی حکمت اور فلسفہ بیان کرنے میں امتیازی شان رکھتی تھیں حتیٰ کہ بعض محققین نے انہیں علم اسرار دین کی بانیہ قرار دیا ہے، یعنی احکام شریعت کی حکمت و فلسفہ بیان کرنے میں پہل انہوں نے کی جس پر آگے چل کر امام غزالی اور شاہ ولی اللہ دہلوی جیسے فضلاء نے عظیم الشان دینی فلسفہ کی بنیاد رکھ دی۔

وہ عرب قبائل کی روایات، تاریخ اور کلچر پر اس حد تک عبور رکھتی تھیں کہ لوگ اس سلسلہ میں ان سے راہنمائی حاصل کرتے تھے۔ انہیں عرب قبائل کے نسب ناموں سے بھی کماحقہ واقفیت حاصل تھی۔ سخن فہم اور سخن شناس تھیں اور عرب شعراء کے اشعار ان کی نوک زبان پر ہوتے تھے۔ خود بھی ادب و فصاحت سے بہرہ ور تھیں اور انہیں اپنے دور کے بڑے خطباء میں شمار کیا جاتا تھا۔ علمی اور فقہی معاملات کے علاوہ عوامی مسائل پر بھی کھل کر رائے دیتی تھیں اور خلفائے راشدین تک بہت سے امور میں ان سے راہنمائی حاصل کرتے تھے، حتیٰ کہ حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ کا ارشاد ہے کہ ہم اصحاب رسول کبھی کسی ایسی مشکل نہیں پھنسے جس کے بارے میں ہمیں ام المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے پاس سے راہنمائی نہ ملی ہو۔ اس کے علاوہ طب و علاج پر بھی دسترس رکھتی تھیں اور ان کے سب سے بڑے شاگرد اور بھانجے حضرت عروہ بن زبیرؓ کہتے ہیں کہ میں نے اپنے دور میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے زیادہ طبی معلومات رکھنے والا کوئی نہیں دیکھا۔ ان کی مسند تدریس نصف صدی تک مدینہ منورہ میں آباد رہی اور سینکڑوں تشنگان علوم نے ان سے استفادہ کیا۔ صرف حدیث رسول صلی اللہ علیہ وسلم میں ان کے براہ راست شاگردوں کی تعداد دو سو سے زائد بیان کی جاتی ہے جن میں مرد عورتیں دونوں شامل ہیں۔ یہ سب معلومات ان کے سیرت نگاروں نے مختلف کتابوں میں بیان کی ہیں اور اس سلسلے میں علامہ سید سلیمان ندویؒ نے ''سیرتِ عائشہ'' میں بیشتر

معلومات کو جمع کر دیا ہے جس کا مطالعہ ہر دینی اور علمی ذوق رکھنے والی خاتون کو کرنا چاہیے۔

سوال یہ ہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے یہ سب کچھ کہاں سے سیکھا؟ وہ جب حرم نبوی میں داخل ہوئیں تو ان کی عمر صرف نو برس تھی جس پر بہت سے لوگوں کو اعتراض بھی ہے، لیکن میں سمجھتا ہوں کہ یہ عین حکمت و دانش کا تقاضا تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حرم میں ایک خاتون اس عمر میں آئیں جو سیکھنے اور تربیت حاصل کرنے کی عمر ہو اور وہ بیوی کی حیثیت رکھتی ہوں تاکہ کسی بات کے پوچھنے، سمجھنے اور سیکھنے میں حجاب نہ ہو اور امت تک دین کا وہ حصہ بے کم و کاست پہنچ سکے جو میاں بیوی کے تعلقات اور گھر کی چار دیواری کے اندر کے حالات کے حوالہ سے ہے اور اس تعلیم و تربیت میں اور کسی کی آمیزش نہ ہو۔ اس مقصد کے لیے بالکل نیو اور صاف "ہارڈ ڈسک" چاہیے تھی جس کا اعزاز ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کو حاصل ہوا اور انہوں نے امت کی سب سے پہلی اور سب سے بڑی معلمہ کی حیثیت سے خود کو اس کا اہل ثابت کر دکھایا۔ وہ حرم نبوی میں داخل ہوئیں تو نو برس کی تھیں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات ہوئی تو وہ اٹھارہ انیس برس کے پیٹے میں تھیں۔ ظاہر بات ہے کہ انہوں نے ان علوم و کمالات کا بڑا حصہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے گھر میں ہی حاصل کیا، کیونکہ ان کی درس گاہ وہی تھی اور اسی چشمہ صافی سے انہوں نے سارا فیض پایا تھا۔

ان کے علمی کمالات پر ایک نظر ڈال لیجیے: وہ قرآن کریم کی بہت بڑی مفسرہ تھیں، حدیث رسول کی ایک بڑی راویہ اور شارحہ تھیں، دینی مسائل و احکام کی حکمت و فلسفہ بیان کرنے والی دانش ور تھیں، عرب قبائل کی روایات، کلچر، نسب ناموں اور تاریخ پر عبور رکھتی تھیں، انہیں ادب و شعر اور خطابت پر دسترس حاصل تھی، وہ مجتہد درجے کی مفتیہ تھیں، عوامی مسائل پر رائے دینے والی راہنما تھیں، اور طب و علاج کے بارے میں بھی ضروری معلومات سے بہرہ ور تھیں، اور یہ سب کمالات انہوں نے درس گاہ نبوی سے سیکھے تھے۔ اس لیے میرے نزدیک تو عورتوں کے لیے درس گاہ نبوی کا نصاب یہی ہے اور اس حوالے سے امت مسلمہ میں بچیوں کی تعلیم و تربیت کے لیے سب سے بڑا اسوہ ام المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی ذات گرامی ہے جن کو راہنما اور معیار بنائے بغیر ہم اپنی نئی نسل کی بچیوں کو دینی تعلیم سے بہرہ ور کرنے کے تقاضے پورے نہیں کر سکیں گے۔

طالبات اور معلمات کو چاہیے کہ وہ پورے اعتماد کے ساتھ حصول علم میں آگے بڑھیں۔ وہ ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا اور دیگر جلیل القدر صحابیات رضی اللہ عنہن کی زندگیوں اور علمی کارناموں کا مطالعہ کریں اور مغرب کے اس پراپیگنڈے سے قطعاً متاثر نہ ہوں کہ اسلام عورتوں کو علم حاصل کرنے سے روکتا ہے، کیونکہ ہمارا شاندار ماضی اور تابناک تاریخ ہمارے سامنے ہے اور امت کی اولوالعزم خواتین کی خدمات اور کارنامے تاریخ کا روشن حصہ ہیں جن کا دنیا کی کوئی اور قوم مقابلہ نہیں کر سکتی، لیکن اس کے لیے یہ ضروری ہے کہ یہ سب کچھ دینی احکام کے دائرہ میں رہ کر ہو اور شرعی قواعد و ضوابط کی پوری طرح پابندی کی جائے۔

(روزنامہ اوصاف، ۱۲ ستمبر ۱۹۹۸ء)

علماء اور اہلِ فکر و دانش کی ذمہ داریاں

عالمِ اسلام پر مغربی فکر کی یلغار اور علماء کرام کی ذمہ داری

(۲ اگست ۱۹۹۲ء کو ہڈرسفیلڈ، انگلینڈ میں جمعیۃ علماء برطانیہ کی ساتویں سالانہ کانفرنس سے خطاب)

بعد الحمد والصلوٰۃ!

رکھیو غالب! مجھے اس تلخ نوائی پہ معاف
آج کچھ درد مرے دل میں سوا ہوتا ہے

حضرت الامیر، قابل صد احترام علماء کرام اور محترم بزرگو اور ساتھیو!

سب سے پہلے جمعیت علماء برطانیہ کا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ اس کانفرنس میں حاضری اور آپ حضرات سے گفتگو کا موقع فراہم کیا۔ اللہ تعالیٰ جمعیت کے راہ نماؤں کو جزائے خیر دیں اور کچھ مقصد کی باتیں عرض کرنے کی توفیق سے نوازیں، آمین۔

میری گفتگو کا عنوان ہے: ”عالم اسلام پر مغربی فکر کی یلغار اور علماء کرام کی ذمہ داری“۔ یہ عنوان خود میرا تجویز کردہ ہے اور آج کی اس ملاقات سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اس عنوان کے تحت کچھ تلخ گزارشات آپ حضرات کی خدمت میں پیش کرنا چاہتا ہوں اور اسی لیے غالب مرحوم کا شعر بطور معذرت ابتدا میں آپ کی نذر کیا ہے۔ حضرات محترم! اس عنوان کے تحت بنیادی طور پر چار امور غور طلب ہیں: ایک یہ کہ مغربی فکر کیا ہے؟ دوسرا یہ کہ مغربی فکر کے عالم اسلام پر اثرات کیا ہیں؟ تیسرا یہ کہ اس کے مقابلہ میں ہم جو کچھ کر رہے ہیں، وہ کہاں تک مؤثر ہے؟ اور چوتھا یہ کہ مسلمانوں کو اس مغربی فکر کے حصار سے نکالنے کے لیے علماء کرام پر کیا ذمہ داری عائد ہوتی ہے؟

جہاں تک مغربی فکر اور فلسفہ کا تعلق ہے، اس کا مختصر تعارف یہ ہے کہ یورپ میں بادشاہت اور

کلیسا کے مظالم کے خلاف یہاں کے عوام کی بغاوت اور صنعتی انقلاب کے ساتھ اس فکر کا آغاز ہوا اور رفتہ رفتہ اس نے پوری دنیا کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ انقلاب فرانس اس کا نقطہ آغاز ہے جو بادشاہت کے خلاف تھا اور اس انقلاب سے ہی یورپ میں جمہوری دور شروع ہوا۔ کلیسا نے اس کشمکش میں بادشاہت کا ساتھ دیا اور صنعت و سائنس کی ایجادات و انکشافات سے انکار کی راہ اختیار کی، اس لیے بادشاہت کے ساتھ ساتھ پورے یورپ میں کلیسا کے اقتدار کا بوریا بستر بھی لپیٹ دیا گیا۔ بائبل کی صرف وہ باتیں قابل توجہ قرار پائیں جن کا تعلق اعتقادات، عبادات اور شخصی اخلاق سے ہے اور سیاست، معاشرت، معیشت، قانون اور نظم ونسق سمیت انسانی زندگی کے تمام اجتماعی شعبوں سے مذہب، بائبل، کلیسا اور پادری کو کلیتاً بے دخل کر دیا گیا۔ یہ ہے مغربی فکر اور فلسفہ جس کی بنیاد انسانی زندگی کے اجتماعی شعبوں سے مذہب کی مکمل لاتعلقی پر ہے اور اسے سیاسی زبان میں سیکولرازم کہا جاتا ہے جو آج عالم اسلام میں بھی دین اور دینی قوتوں کے خلاف صف آرا ہے۔

آپ حضرات برطانیہ میں رہتے ہیں اور اجتماعی زندگی کی مذہب سے لاتعلقی کے نتائج و ثمرات اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں۔ ابھی مولانا عبد الرشید ربانی نے اپنے خطاب میں بتایا ہے کہ برطانیہ میں جو چرچ خرید کر مساجد میں تبدیل کیے گئے ہیں، ان کی تعداد تین سو سے زائد ہے۔ یہاں کے عام آدمی کا مذہب کے ساتھ کوئی عملی تعلق باقی نہیں رہا، چرچ فروخت ہو رہے ہیں اور پادری کا کردار دن بدن محدود ہوتا جا رہا ہے۔ یہ اس بات کی شہادت ہے کہ جس مذہب کا انسان کی عملی اور اجتماعی زندگی سے کوئی تعلق باقی نہ رہے، وہ کبھی زندہ نہیں رہ سکتا۔

اب آئیے ان اثرات کا جائزہ لیں جو گزشتہ دو سو سالہ استعماری تسلط کے دوران اس فکر و فلسفہ کے حوالہ سے عالم اسلام پر مرتب ہوئے ہیں۔ عالم اسلام کے بیشتر ممالک ایک عرصہ تک مغربی ممالک کے زیر تسلط رہے ہیں۔ کچھ پر برطانیہ کا قبضہ رہا ہے، کچھ فرانس کے زیر نگیں تھے اور کچھ پر ولندیزیوں نے قبضہ جما رکھا تھا۔ اس دوران ان قوتوں نے ہماری پوری طرح برین واشنگ کی ہے اور ہمیں ہمارے ماضی سے کاٹنے کے لیے پورے ذرائع استعمال کیے ہیں۔ اس مقصد کے لیے مرزا غلام احمد قادیانی جیسے فتنے کھڑے کیے گئے، جہاد اور خلافت کے تصور کو مسلمانوں کے ذہنوں سے محو کرنے کے لیے منظم محنت کی گئی۔ علماء اسلام نے ان فتنوں کا مقابلہ کیا، ان کو ناکام بنانے کے پورے جتن کیے، لیکن

آج نتائج کے اعتبار سے جب دیکھتے ہیں تو اس تلخ حقیقت کا اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ استعماری قوتیں اپنے مقاصد میں کامیاب رہی ہیں۔ ہم نے مرزا غلام احمد قادیانی کے فتنہ کا مقابلہ کیا، اسے کافر قرار دیا، اس کے گمراہ کن عقائد کی تردید کی اور اس گروہ کو غیر مسلم اقلیت قرار دلوانے میں کامیابی حاصل کی، لیکن اس کی جھوٹی نبوت کا بنیادی مقصد جہاد کی مخالفت تھا۔ اس لحاظ سے دیکھیں تو اس کا مشن کامیاب نظر آتا ہے۔ آج ہماری اجتماعی زندگی میں جہاد کا تصور نہیں ہے۔ وہ تو افغان مجاہدین کو دعائیں دیں کہ انہوں نے لاکھوں جانوں کی قربانی سے جہاد کے عمل کو عالم اسلام میں دوبارہ زندہ کر دیا اور اللہ تعالیٰ نے انہیں جہاد کے احیا کا ذریعہ بنا دیا، ورنہ جہاد اور خلافت کے تصور کو ہمارے ذہنوں اور اجتماعی زندگی سے نکالنے میں استعماری قوتیں کامیاب رہی ہیں۔

ہمارے سیاسی نظام کی بنیاد خلافت پر ہے، لیکن ہم میں سے کوئی آج خلافت کے حوالہ سے بات نہیں کرتا، حتیٰ کہ علماء کرام کی زبان پر بھی جمہوری نظام کی باتیں ہیں اور خلافت و جہاد کا ذکر تک متروک ہو گیا ہے۔ ہم اسلامی نظام کے نعرے لگاتے ہیں، لیکن اجتماعی زندگی میں مذہب کی عمل داری قبول کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ ایک مسلمان ملک کی پارلیمنٹ قرآن و سنت کو بالاتر قانون تسلیم کرنے کا بل منظور کرتی ہے لیکن اس شرط کے ساتھ کہ اس سے سیاسی نظام اور حکومتی ڈھانچہ متاثر نہیں ہوگا۔ سیکولرازم اسی کا نام ہے اور مغرب کا فکر و فلسفہ یہی ہے جو آج ہماری اجتماعی زندگی کے رگ و پے میں سرایت کیے ہوئے ہے۔

حضرات گرامی قدر! اگر علماء کرام مجھے اس گستاخی پر معاف فرمائیں تو یہ عرض کرنا چاہوں گا کہ ہماری دینی درسگاہوں میں بھی اسلام کے اجتماعی پہلوؤں پر بات نہیں ہوتی۔ دینی تعلیم کے حوالہ سے ہماری گفتگو اعتقادات، عبادات، اخلاقیات یا زیادہ سے زیادہ خاندانی معاشرت کے مسائل تک محدود رہتی ہے۔ ہم بخاری شریف پڑھاتے ہیں تو ہمارا سارا زور کتاب الطہارۃ اور کتاب الصلوٰۃ کے مباحث میں صرف ہوتا ہے۔ بخاری میں کتاب البیوع بھی ہے، کتاب الجہاد بھی ہے، کتاب الامارۃ بھی ہے، کتاب المزارعۃ بھی ہے اور زندگی کے اجتماعی شعبوں سے تعلق رکھنے والے دوسرے ابواب بھی ہیں، لیکن ہم ان ابواب سے یوں گزرتے ہیں جیسے یہ سب منسوخ ہو گئے ہیں۔ ہم آج کے نظاموں سے ان ابواب کا تقابل نہیں کرتے اور اپنے تلامذہ کو یہ نہیں بتاتے کہ آج کی تجارت میں اور اسلامی تجارت

میں کیا فرق ہے اور آج کے جنگی اصولوں اور جہاد میں کیا فرق ہے۔ مجھے اس دکھ کا اظہار کرنے کی اجازت دیجیے کہ ہم بخاری اور ترمذی پڑھاتے ہوئے ایک مسئلہ پر چھ چھ دن بحث کرتے ہیں اور دلائل کا انبار لگاتے ہیں، آخر میں نتیجہ کیا نکلتا ہے؟ یہی کہ یہ اولیٰ ہے اور وہ غیر اولیٰ ہے، جبکہ سیکولر دانش ور ہمیں سود کا متبادل پیش کرنے کا چیلنج کر رہے ہیں، اسلامی قوانین کو وحشیانہ اور ظالمانہ قرار دے رہے ہیں اور انسانی حقوق کے حوالے سے اسلامی نظام کا راستہ روکنے کی کوشش کر رہے ہیں، مگر ہمیں سرے سے ان مسائل کا ادراک ہی نہیں ہے، ان کی کوئی اہمیت ہمارے نزدیک نہیں ہے اور ہم ان مباحث کو علمی مباحث کا موضوع بنانے کو وقت کا ضیاع سمجھتے ہیں۔ آخر یہ ذہن ہمیں کہاں سے ملا ہے؟ کیا ہم بھی غیر شعوری طور پر مغربی فلسفہ اور فکر کو قبول تو نہیں کر چکے؟

میرے محترم بزرگو اور دوستو! ہم تسلیم کریں یا نہ کریں، یہ حقیقت ہے کہ مغرب کا لادینی فلسفہ ہمارے دل و دماغ پر حاوی ہو چکا ہے اور ہم اس کے دائرہ سے نکلنے کا حوصلہ نہیں پاتے، جبکہ صورت حال یہ ہے کہ مغرب اس پر بھی مطمئن نہیں ہے۔ وہ عالم اسلام کو اسلامی نظام سے دور رکھنے کے لیے نئی صف بندی کے ساتھ سامنے آگیا ہے، انسانی حقوق اور بنیاد پرستی کے عنوان سے ایک نئی فکری جنگ کا آغاز کر چکا ہے۔ وہ یہ سمجھتا ہے کہ دنیا کے کسی خطے میں اگر اسلامی نظام صحیح طور پر عملاً نافذ ہو گیا تو مغربی فلسفہ کے لیے اس کا سامنا کرنا مشکل ہو جائے گا اور روسی کیمونزم کی طرح مغربی سیکولرازم بھی ریت کی دیوار کی طرح بکھر کر رہ جائے گا، اسی لیے مغرب اور صرف مغرب نہیں، چین، جاپان اور تمام غیر اسلامی قوتیں اس نکتہ پر متفق ہو چکی ہیں کہ انسانی حقوق کا واویلا کر کے اور بنیاد پرستی کا ہوا کھڑا کر کے اسلامی نظام کے خلاف نفرت کا ایک طوفان بپا کر دیا جائے اور دنیا کے کسی خطہ میں اسلامی نظام کو کسی قیمت پر نافذ نہ ہونے دیا جائے۔

یہ حقیقت ہے کہ آج دنیا کے کسی مسلمان ملک میں اسلامی نظام مکمل طور پر نافذ نہیں ہے۔ صرف سعودی عرب کا عدالتی نظام قرآن و سنت کے مطابق ہے اور فقہ حنبلی کے مطابق لوگوں کے مقدمات کے فیصلے ہوتے ہیں۔ سیاسی اور معاشی شعبوں میں وہاں بھی اسلامی نظام نہیں ہے۔ صرف عدالتی نظام اسلام کے مطابق ہے اور قرآن و سنت کے قوانین نہ صرف نافذ ہیں بلکہ ان پر بلا امتیاز عمل بھی ہوتا ہے۔ اس کی برکات یہ ہیں کہ دنیا میں جرائم کی سب سے کم شرح سعودی عرب میں ہے۔

گزشتہ سال کے سروے رپورٹوں کے مطابق نیویارک میں ایک سال کے دوران ڈکیتی کی ترانوے ہزار وارداتیں ہوئیں اور لندن میں چوری کرنے کی پونے دو لاکھ وارداتوں کو ریکارڈ پر لایا گیا، مگر مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ میں سروے کر کے دیکھ لیں کہ گزشتہ سال کے دوران چوری اور ڈکیتی کے کتنے واقعات ہوئے ہیں؟ یہ اسلام کی برکات ہیں، اسلام کے نظام و قانون کے ثمرات ہیں اور آپ خود اندازہ کریں کہ اگر صرف ایک شعبہ میں اسلام نافذ کرنے کے نتائج و ثمرات یہ ہیں تو مکمل اسلامی نظام کی برکات کا کیا عالم ہوگا؟ مغرب اس سے بے خبر نہیں ہے۔ مغربی دانشور ناسمجھ نہیں ہیں، بے حد دانا اور عقل مند ہیں، انہیں اپنے فلسفہ و نظام کا کھوکھلا پن اور اسلامی نظام کی برکات و ثمرات نظر آرہے ہیں اور وہ اچھی طرح سمجھتے ہیں کہ دنیا کے کسی ملک میں صحیح اور مکمل اسلامی نظام نافذ ہونے کی صورت میں مغربی فلسفہ کا حشر کیا ہوگا۔ وہ اسی لیے اسلامی نظام کا راستہ روکنے اور اس کے سامنے نفرت کی دیوار کھڑی کرنے کی کوشش میں مصروف ہیں۔ یہ صرف پاکستان کا مسئلہ نہیں، الجزائر، مصر، تیونس، مراکش، انڈونیشیا اور ملائیشیا سمیت دنیا بھر کے بیشتر مسلم ممالک میں یہی جنگ جاری ہے۔ افغانستان کی خانہ جنگی کے پیچھے یہی سازش کار فرما ہے کہ کہیں افغان مجاہدین مکمل اسلامی نظام نافذ کرنے میں کامیاب نہ ہو جائیں۔

حضرات محترم! آج امریکہ کا ”نیو ورلڈ آرڈر“ سامنے ہے۔ اس حوالہ سے امریکہ عالم اسلام پر اپنا شکنجہ مضبوط کرنے کی کوشش کر رہا ہے اور ایک بات آپ کے نوٹس میں لانا ضروری سمجھتا ہوں کہ امریکہ نے پاکستان کی جو امداد بند کر رکھی ہے، اس کی بحالی کی شرائط میں صرف ایٹمی تنصیبات کا مسئلہ نہیں بلکہ اسلامی قوانین اور قادیانیت کے مسائل بھی ان شرائط میں شامل ہیں۔ آج ان شرائط کے حوالہ سے صرف ایٹمی تنصیبات کا مسئلہ عوام کے سامنے ہے۔ اس پر پاکستان کی قوم کا ایک ہی موقف ہے اور ہم ان کے ساتھ پوری طرح ہم آہنگ ہیں بلکہ ہمارا موقف تو اس سے آگے ہے اور ہم یہ سمجھتے ہیں کہ ایٹم بم بنانا مسلمان ملکوں کا حق ہے اور اس کے بارے میں مسلم حکومتوں کو معذرت خواہانہ طرز عمل اختیار نہیں کرنا چاہیے، لیکن یہ بات آپ کے علم میں ہونی چاہیے کہ امریکی شرائط میں صرف ایٹمی تنصیبات کا سوال نہیں، بلکہ یہ بات بھی شامل ہے کہ حکومت پاکستان قادیانیوں کے خلاف کیے گئے آئینی و قانونی اقدامات واپس لے اور یہ بھی ان شرائط میں ہے کہ پاکستان میں انسانی حقوق کے منافی کوئی قانون نافذ نہ کرنے کی ضمانت دی جائے۔

بظاہر یہ ایک خوبصورت سا جملہ ہے، لیکن اس کی تہہ میں جو زہر چھپا ہوا ہے، اس سے آپ حضرات کا آگاہ ہونا ضروری ہے۔ انسانی حقوق کا مغربی تصور یہ ہے کہ قرآن کریم نے چوری، زنا، ڈکیتی اور قتل کی جو سزائیں مقرر کی ہیں، مغربی دانشور انہیں انسانی حقوق کے منافی سمجھتے ہیں۔ ان کے نزدیک ہاتھ کاٹنا، کوڑے مارنا، سنگسار کرنا اور قاتل کو قصاص میں قتل کرنا تہذیب کے خلاف ہے۔ یہ ان سزاؤں کو وحشیانہ قرار دیتے ہیں اور انسانی حقوق کے منافی قرار دیتے ہیں، جبکہ ہماری مرعوبیت کا حال یہ ہے کہ اس وقت بھی پاکستان کی عدالت عظمیٰ میں اس نکتہ پر بحث جاری ہے کہ مجرم کو عام لوگوں کے سامنے سزا دینا انسانی حقوق کے منافی ہے یا نہیں؟ وہاں یہ دلائل دیے جا رہے ہیں کہ مجرم کو برسر عام سزا دینا اس کی عزت نفس کے خلاف ہے، عزت نفس انسانی حقوق میں شامل ہے اور ہم انسانی حقوق کی پاسداری کا وعدہ کر چکے ہیں، اس لیے پاکستان میں کسی مجرم کو برسرعام سزا نہیں دی جا سکتی۔ قرآن کریم کہتا ہے کہ مجرم کو عام لوگوں کے سامنے سزا دو تاکہ وہ عبرت پکڑیں، لیکن ہماری عدالت عظمیٰ اس بحث میں الجھی ہوئی ہے کہ کہیں یہ انسانی حقوق کے منافی تو نہیں؟ اس سے آپ بخوبی اندازہ کر سکتے ہیں کہ مغرب کا انسانی حقوق کا تصور کیا ہے اور جب مغربی ممالک اور لابیاں ہم سے انسانی حقوق کی پاسداری کا تقاضا کرتی ہیں تو اس سے ان کی مراد کیا ہوتی ہے۔

علماء کرام! آئیے تھوڑی دیر کے لیے "بنیاد پرستی" کے طعنے کا بھی جائزہ لے لیں۔ آج ہمیں مغرب کی طرف سے بنیاد پرستی کا طعنہ دیا جاتا ہے اور ہم جذبات میں آ کر جوش کے ساتھ یہ کہہ دیتے ہیں کہ ٹھیک ہے، ہم بنیاد پرست ہیں۔ مجھے اس سے اختلاف ہے۔ ہمیں اس طعنہ اور الزام کے پس منظر کو جانے کی کوشش کرنی چاہیے اور اس کی وجہ سمجھنا چاہیے کہ آخر اس طعنہ کا مقصد کیا ہے اور بنیاد پرستی سے مغرب کی مراد کیا ہے؟ کسی لفظ یا جملہ کا لفظی معنی کچھ بھی ہو، لیکن جب تاریخ اسے کسی خاص مفہوم اور مصداق کے لیے متعین کر دیتی ہے تو وہ جب بھی بولا جاتا ہے، اس سے وہی اصطلاح و معنٰی مراد ہوتا ہے، اس لیے ہمیں بنیاد پرستی کے اصطلاحی معنی تلاش کرنا ہوں گے۔ تاریخ یہ کہتی ہے کہ بنیاد پرست سب سے پہلے ان پادریوں کو کہا گیا جو یورپ میں بادشاہت اور کلیسا کے مظالم کے خلاف جمہوری انقلاب میں بادشاہ کے ساتھ تھے اور عوام پر بادشاہ اور جاگیردار کے مظالم کی حمایت کرتے تھے۔ صرف یہ نہیں بلکہ سائنسی مشاہدات اور صنعتی ایجادات سے انکار کر کے ان پر کفر کے

فتوے صادر کیا کرتے تھے۔ وہ پادری جو جدید سائنسی ترقی اور عوامی حقوق کے خلاف فریق بن گئے، انہیں تاریخ میں بنیاد پرست کا خطاب ملا اور بادشاہ اور جاگیردار کے ساتھ ساتھ معاشرہ پر ان پادریوں کے اقتدار کا سورج بھی ہمیشہ کے لیے غروب ہوگیا۔ آج جب مغربی لابیاں عالم اسلام میں دینی بیداری کی تحریکات پر بنیاد پرستی کی پھبتی کستی ہیں تو اس سے ان کا مقصد اپنی رائے عامہ کو یہ باور کرانا ہوتا ہے کہ عالم اسلام کے یہ علماء اور دینی راہ نما دراصل اسی پادری کی طرح ہیں جسے مغربی رائے عامہ نے تین سو سال قبل مسترد کر کے گرجوں میں محصور کر دیا تھا۔ مغربی لابیاں ہمیں بنیاد پرست قرار دے کر اپنے ملک کی رائے عامہ پر خوف مسلط کرنا چاہتی ہیں کہ عوام کو حقوق سے محروم کرنے والا اور سائنسی انکشافات اور ایجادات سے انکار کرنے والا پادری دوبارہ زندہ ہو رہا ہے، اس سے بچو، اس کو روکو اور اس کو کسی ملک پر مسلط نہ ہونے دو، ورنہ تمہارا وہ ظلم اور تاریکی کا دور واپس آجائے گا۔

یہ ہے پس منظر بنیاد پرستی کے طعنہ کا اور اب آپ فیصلہ کریں کہ آپ اس الزام کو قبول کرتے ہیں یا نہیں! میں تو اس سے انکار کرتا ہوں اور اس پادری کا کردار قبول کرنے کے لیے تیار نہیں ہوں جو عوام کے مقابلے میں بادشاہ کا ساتھی تھا اور علم و ترقی کے مقابلہ میں جہالت کا طرف دار تھا۔

محترم بزرگو اور دوستو! میں نے آپ کا خاصا وقت لے لیا ہے اور گستاخیوں کا مرتکب بھی ہوا ہوں، لیکن اپنے ضمیر کے ہاتھوں مجبور ہوں اور آپ سے دوبارہ عرض کرتا ہوں کہ صورت حال کا سنجیدگی کے ساتھ جائزہ لیں، مغرب کے عزائم اور چیلنج کو سمجھنے کی کوشش کریں اور اس بات کا ٹھنڈے دل و دماغ کے ساتھ تجزیہ کریں کہ اس چیلنج کے مقابلہ میں ہم کیا کر رہے ہیں؟ ہماری دینی تحریکات کیا کر رہی ہیں؟ حقیقت حال یہ ہے کہ ہم میں سے بیشتر کو تو ان مسائل کا ادراک و احساس ہی نہیں ہے اور اگر کسی حلقہ میں ادراک و احساس ہے تو ہماری ترجیحات درست نہیں ہیں اور ہم مسائل کے تجزیہ و تحلیل اور ان کے حل کے لیے گہری سوچ اور منصوبہ بندی کے عادی نہیں رہے۔

آپ حضرات مغرب میں رہتے ہیں، آپ نے مغربی معاشرہ سے بہت سی باتیں سیکھی ہیں، لیکن ان کی یہ عادت اپنانے کی ہم نے کوشش نہیں کی۔ ان کی یہ عادت اچھی ہے کہ مسائل کا تجزیہ جذبات سے ہٹ کر ٹھنڈے دل و دماغ کے ساتھ کرتے ہیں اور پوری سنجیدگی اور منصوبہ بندی کے ساتھ ان کا حل تلاش کرتے ہیں۔ ہمیں بھی جذبات سے ہٹ کر عالم اسلام کی صورت حال کا جائزہ لینا چاہیے،

مغرب کے چیلنج کو سمجھنا چاہیے، اس کے طریق واردات کو سمجھنا چاہیے اور پورے شعور، دانش اور جرات کے ساتھ اس کا مقابلہ کرنا چاہیے۔ آج ضرورت اس امر کی ہے کہ ہم مغرب کی رائے عامہ تک رسائی حاصل کریں، مغربی میڈیا اور سائنٹفک طریق کار تک رسائی حاصل کریں اور اسلام کے احکام و قوانین کو آج کی زبان میں آج کی دنیا کے سامنے پیش کریں۔ اگر ہم ایسا نہ کر سکے تو ہمارا یہ جرم نہ خدا تعالیٰ کی بارگاہ میں معافی کے قابل ہوگا اور نہ ہی تاریخ ہمیں معاف کرے گی۔

میں ایک بار پھر جمعیۃ علماء برطانیہ کا شکریہ ادا کرتے ہوئے تلخ و ترش گزارشات پر آپ سب بزرگوں اور دوستوں سے معذرت خواہ ہوں اور دعاگو ہوں کہ اللہ رب العزت ہم سب کو صحیح سمت پر دین اسلام کی مثبت اور مؤثر خدمت کی توفیق سے نوازیں، آمین۔

(الشریعہ، اکتوبر ۱۹۹۲ء)

اسلامی نظام، انسانی حقوق اور قادیانیت

(۲۴ جولائی ۱۹۹۳ء کو مرکزی جامع مسجد گلاسکو اور ۱۶ اگست ۱۹۹۳ء کو مرکزی جامع مسجد برمنگھم، برطانیہ میں عالمی مجلسِ تحفظِ ختمِ نبوت کے زیراہتمام منعقدہ اجتماعات سے خطاب)

بعد الحمد والصلوٰۃ!

حضرت الامیر! قابل احترام علماء کرام، بزرگو، دوستو اور ساتھیو!

ایک دور تھا جب مرزا غلام احمد قادیانی کی امت کا ہیڈ کوارٹر قادیان میں تھا اور یہ وہ زمانہ تھا جب قادیانیت کے خلاف کوئی بات کہنا حکومت وقت کے غیظ و غضب کو دعوت دینا تھا۔ تب مجلس احرار اسلام کے شعبہ تبلیغ نے قادیان میں کانفرنس کا اہتمام کیا جہاں قادیانی امت اپنا سالانہ اجتماع منعقد کیا کرتی تھی اور اسے معاذ اللہ حج کی طرح مقدس اجتماع کی حیثیت دی جاتی تھی۔ اس دور میں قادیان میں مسلمانوں کا اجتماع منعقد کرنے میں احرار کو کن مشکلات کا سامنا کرنا پڑا، یہ ایک الگ داستان ہے۔ بہرحال اس دور میں یہ روایت قائم ہو گئی کہ قادیانی گروہ کے سالانہ اجتماع کے علاوہ مسلمان بھی اپنا اجتماع قادیان میں منعقد کرنے لگے۔ پھر قیام پاکستان کے بعد قادیانیوں کا سالانہ اجتماع ربوہ میں منتقل ہوا تو مجلس تحفظ ختم نبوت نے ربوہ سے چند میل کے فاصلہ پر چنیوٹ میں سالانہ ختم نبوت کانفرنس کے انعقاد کا سلسلہ شروع کر دیا اور جب ۱۹۸۴ء میں قادیانی امت کے سربراہ مرزا طاہر احمد نے امتناع قادیانیت کے صدارتی آرڈیننس کے نفاذ کے بعد ربوہ کو چھوڑ کر اپنا ہیڈ کوارٹر لندن میں منتقل کر لیا اور سالانہ اجتماع بھی لندن میں منعقد ہونے لگا تو ۸۵ء سے سالانہ ختم نبوت کانفرنس بھی برطانیہ میں منتقل ہو گئی۔ پہلے چند سال لندن کے ویمبلے کانفرنس سنٹر میں ختم نبوت کانفرنس کا انعقاد ہوتا رہا، پھر برطانیہ کے مسلمانوں کے اصرار پر مختلف شہروں میں اس کے انعقاد کا فیصلہ کیا گیا۔

حضرات محترم! مجھ سے پہلے فاضل مقررین نے عقیدۂ ختم نبوت کی اہمیت اور اس کے تقاضوں پر مفید اور معلوماتی گفتگو کی ہے، لیکن میں اس روایتی انداز سے کچھ ہٹ کر اس سلسلہ میں آپ سے گفتگو

کرنا چاہتا ہوں اور ان سوالات واشکالات کے بارے میں کچھ عرض کرنے کا خواہش مند ہوں جو مغربی میڈیا اور قادیانیت کی سرپرست لابیاں قادیانیت کے حوالہ سے اسلام، پاکستان اور مسلمانوں کے خلاف مسلسل ابھار رہی ہیں، اور آپ حضرات چونکہ ویسٹرن میڈیا کی براہ راست زد میں ہیں، اس لیے آپ دوستوں کے سامنے ان امور کا تجزیہ انتہائی ضروری ہے۔ لہٰذا میری گزارشات چار امور کے بارے میں ہوں گی:

سب سے پہلے اس سوال کا جائزہ لوں گا کہ جب اسے مسلمان کہتے ہیں جو قرآن پاک اور جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان رکھتا ہوں اور قادیانی بھی ان دونوں پر ایمان کا اظہار کرتے ہیں تو آپ لوگوں کے پاس انہیں غیر مسلم کہنے کا آخر کیا جواز ہے؟

دوسرے نمبر پر میں یہ واضح کروں گا کہ قادیانیوں کے ساتھ ہمارا اصل جھگڑا کیا ہے؟

تیسرے نمبر پر اس سوال پر اظہار خیال کروں گا کہ جب آپ لوگ قادیانیوں کو غیر مسلم قرار دے چکے اور ایک آرڈیننس کے ذریعے ان کی سرگرمیوں پر پابندی لگا چکے تو اب ان کے پیچھے لٹھ لیے کیوں پھر رہے ہیں اور انہیں ان انسانی اور شہری حقوق سے کیوں محروم رکھے ہوئے ہیں جو ملک کے شہری کی حیثیت سے انہیں حاصل ہونے چاہئیں؟

اور آخر میں تحریک ختم نبوت کی تازہ ترین صورت حال سے آپ حضرات کو آگاہ کرنا چاہوں گا کہ قادیانیت کے خلاف جس تحریک کا آغاز حضرت پیر مہر علی شاہ صاحب گولڑویؒ، حضرت سید انور شاہ کشمیریؒ اور حضرت مولانا ثناء اللہ امرتسریؒ نے کیا تھا، وہ آج کس مرحلہ میں ہے اور حضرت مولانا خان محمد صاحب کی زیر قیادت کون سے مورچہ پر صف آرا ہے۔

محترم بزرگو اور دوستو! قادیانیوں کی طرف سے یہ کہا جاتا ہے اور آج کی نئی مسلمان نسل کے لیے یہ سوال بظاہر خاصا پیچیدہ ہے کہ قادیانی گروہ جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان کا اظہار کرتا ہے اور قرآن کریم کو بھی ماننے کا دعویدار ہے تو پھر وہ غیر مسلم کیوں ہے؟ جواب میں یہ عرض کروں گا کہ مسلمان ہونے کے لیے صرف قرآن کریم اور جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کو مان لینا کافی نہیں ہے اور دلیل میں دو واقعات پیش کرنا چاہوں گا جو خود جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے دور میں پیش آئے اور جن میں صرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کا اقرار کافی نہیں سمجھا

گیا۔

ایک واقعہ حافظ ابن البرؒ نے ''الاستیعاب'' میں نقل کیا ہے کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک نوجوان صحابی حضرت حبیب بن زید انصاریؓ کو مسیلمہ کذاب کے کچھ ساتھی پکڑ کر لے گئے۔ مسیلمہ یمامہ کے علاقہ میں بنو حنیفہ کا سردار تھا اور اس نے نبوت کا دعویٰ کر رکھا تھا۔ اس کا نام مسیلمہ تھا۔ کذاب کا خطاب اسے جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دیا تھا۔ حبیب بن زید کو مسیلمہ کے دربار میں پیش کیا گیا۔ مسیلمہ نے ان سے سوال کیا کہ تم حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ تعالیٰ کا رسول مانتے ہو؟ جواب دیا: ہاں مانتا ہوں۔ دوسرا سوال کیا کہ کیا تم مجھے اللہ تعالیٰ کا رسول مانتے ہو؟ جواب میں اس نوجوان صحابی نے جو جملہ کہا، وہ ایمان و استقامت اور عشق و محبت کا کمال اظہار ہے۔ ارشاد فرمایا "ان فی اذنی صمماً عن سماع ما تقول"۔

اس جملہ میں جو زور اور وزن ہے، ترجمہ میں شاید اس کا دسواں حصہ بھی ادا نہ کر سکوں مگر اس محاورہ کا ترجمہ یہ ہے کہ ''میرے کان تمہاری یہ بات سننے سے انکار کرتے ہیں''۔ روایات میں ہے کہ مسیلمہ نے اس عاشق رسول نوجوان صحابی کا ایک بازو کاٹنے کا حکم دیا جو کاٹ دیا گیا۔ پھر مسیلمہ نے اپنا سوال دہرایا، مگر جواب وہی ملا۔ پھر دوسرا بازو کاٹا گیا، مگر سوال دہرانے پر جواب حسب سابق تھا۔ حتیٰ کہ حضرت حبیب بن زیدؓ کے جسم مبارک کے ٹکڑے ٹکڑے کر کے انہیں شہید کر دیا گیا مگر ختم نبوت کے اس سب سے پہلے شہید نے جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کے بعد کسی اور کے لیے رسالت و نبوت کا جملہ سننے کے لیے اپنے کانوں کو آمادہ نہیں کیا۔

دوسرا واقعہ امام حاکمؒ نے ''المستدرک'' میں بیان کیا ہے کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں مسیلمہ کذاب کی طرف سے دو قاصد آئے۔ انہوں نے مسیلمہ کا خط پیش کیا جس کا عنوان تھا: ''محمد رسول اللہ کے نام مسیلمہ رسول اللہ (معاذاللہ) کی طرف سے''، اور خط میں یہ کہا گیا تھا کہ آپ اپنے بعد مجھے اپنا جانشین نامزد کر دیں یا شہروں کی نبوت اپنے پاس رکھیں اور دیہات کی نبوت میرے حوالہ کر دیں، پھر میرا اور آپ کا کوئی جھگڑا نہیں ہے۔ جناب رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے خط کا جواب تو یہ دیا کہ میں مسیلمہ کو ایک تنکا دینے کا روادار نہیں ہوں۔ زمین خدا کی ہے، وہ جسے چاہے اس کا وارث بنا دے۔ البتہ مسیلمہ کے قاصدوں سے پوچھا کہ کیا تم بھی مسیلمہ کو رسول مانتے ہو؟

انہوں نے جواب ہاں میں دیا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اگر قاصدوں کا قتل سفارتی آداب کے منافی نہ ہوتا تو میں تم دونوں کی گردنیں اڑا دیتا۔

یہاں ضمناً ایک بات اور بھی عرض کرتا جاؤں کہ جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تو سفارتی آداب کا لحاظ رکھا اور صاف طور پر فرما دیا کہ سفارتی آداب کی وجہ سے تمہاری جان بخشی ہو گئی ہے، ورنہ میرے پاس تمہارے لیے قتل کے سوا کوئی سزا نہ تھی، لیکن مسیلمہ کذاب نے سفارتی آداب کو پامال کر دیا اور جب خلیفہ اول حضرت ابوبکر صدیقؓ نے جنگ سے پہلے قاصد مسیلمہ کے پاس بھیجا تو مسیلمہ نے اسے شہید کرا دیا۔

میں نے دو واقعات آپ کے سامنے پیش کیے ہیں۔ دونوں دور رسالت کے ہیں اور دونوں میں مسیلمہ جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کے اقرار کے بعد ثانوی حیثیت سے اپنی رسالت کی بات کر رہا ہے، لیکن اس کی بات قبول نہیں کی گئی، حتیٰ کہ ایک نوجوان صحابیؓ نے اس تصور کو رد کرنے کے لیے اپنی جان کا نذرانہ پیش کر دیا جس سے واضح ہوتا ہے کہ مسلمان ہونے کے لیے صرف محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کا اقرار کافی نہیں بلکہ آپ کو آخری نبی ماننا اور آپ کے بعد کسی بھی شخص کے لیے رسالت و نبوت کے تصور کو رد کرنا ضروری ہے۔

اس کے بعد دوسرا سوال یہ ہے کہ قادیانیوں کے ساتھ ہمارا اصل جھگڑا کیا ہے؟ اصل واقعہ یہ ہے کہ قادیانیوں نے نئی نبوت اور نئی وحی کے ساتھ اپنے لیے ایک نئے مذہب کا انتخاب کیا ہے اور مسلمانوں سے اپنا مذہب الگ کر لیا ہے، لیکن اس کے باوجود وہ ہمارا نام اور ہماری اصطلاحات اور شعائر استعمال کر کے دنیا کو دھوکہ دینا چاہتے ہیں اور اسلام کے نام پر لوگوں کو گمراہ کرنا چاہتے ہیں۔ ہمارا ان کے ساتھ جھگڑا یہ ہے کہ قادیانی مذہب ہم سے الگ ایک مذہب ہے، لیکن نام ہمارا استعمال کرتا ہے۔ ہم اس کی اجازت نہیں دے سکتے۔

حضرات محترم! ایک مسلمہ اصول کے حوالے سے مسئلہ کا جائزہ لیجیے۔ مذاہب کا مسلّمہ اصول یہ ہے کہ نبی کے بدلنے سے مذہب بدل جاتا ہے۔ جب کوئی قوم نئے نبی اور اس کے ساتھ نئی شریعت پر ایمان لائے گی، اس کا مذہب پہلے سے چلے آنے والے مذہب سے الگ ہو جائے گا۔ آپ کے ہاں برطانیہ میں یہودی بھی رہتے ہیں، عیسائی بھی رہتے ہیں۔ یہودی حضرت موسیٰ کو مانتے ہیں اور تورات

پر ایمان رکھتے ہیں۔ عیسائی بھی حضرت موسیٰ کو مانتے ہیں اور تورات پر ایمان رکھتے ہیں۔ حضرت موسیٰ اور تورات پر دونوں کا ایمان ہے، لیکن چونکہ عیسائی حضرت عیسیٰ اور انجیل پر بھی ایمان رکھتے ہیں جنہیں یہودی تسلیم نہیں کرتے، اس لیے عیسائیوں کا مذہب یہودیوں سے الگ ہو گیا اور دونوں قومیں الگ الگ مذاہب کے پیروکار کی حیثیت سے دنیا میں آباد ہیں۔ اب اگر کوئی عیسائی حضرت عیسیٰ پر ایمان رکھتے ہوئے یہودی کہلائے گا یا اپنا تعارف یہودیت کے حوالے سے کرائے گا یا یہودیوں کے مخصوص مذہبی شعائر اپنے مذہب کی تبلیغ کے لیے استعمال کرے گا تو جھگڑا پیدا ہو گا اور دنیا کا کوئی یہودی کسی عیسائی کو اس بات کی اجازت نہیں دے گا کہ وہ خود کو یہودی کہلائے اور عیسائی مذہب کے پرچار کے لیے یہودیوں کے مذہبی شعائر و علامات کا استعمال کرے۔

اسی بنیاد پر ہم کہتے ہیں کہ جب مرزا غلام احمد قادیانی نے نبوت کا دعویٰ کیا، اپنے لیے رسول اللہ کا لقب اختیار کیا، اسلام کے احکام کو منسوخ کرنے کا دعویٰ کیا، نئی وحی اور نئے احکام کی بات کی تو اس کے ماننے والے، مسلمانوں سے الگ ایک نئے مذہب کے پیروکار بن گئے اور اس گروہ کا مذہب مسلمانوں کے مذہب سے الگ ہو گیا۔ اور یہ بات تو قادیانی بھی تسلیم کرتے ہیں کہ دنیا کے ایک ارب مسلمانوں کے مذہب سے مرزا غلام احمد قادیانی کے پیروکاروں کا مذہب الگ ہے۔ اس لیے ایک سادہ سی بات ہے کہ جب دونوں الگ الگ مذہب کے پیروکار ہیں تو دونوں کا نام بھی الگ الگ ہونا چاہیے اور قادیانیوں کو اپنے لیے اسلام اور مسلمانوں سے الگ کوئی اور نام اختیار کرنا چاہیے۔

حضرات محترم! اس حقیقت کو قادیانی گروہ بھی تسلیم کرتا ہے کہ مسلمانوں اور قادیانیوں کا مذہب الگ الگ ہے اور تاریخ کے ریکارڈ میں اس کی متعدّد دستاویزی شہادتیں موجود ہیں جن میں سے بعض کا میں اس وقت ذکر کرنا چاہتا ہوں۔

پہلی شہادت

جب پاکستان اور ہندوستان کی تقسیم ہو رہی تھی تو پنجاب کی تقسیم کے لیے ریڈکلف کمیشن بیٹھا تھا۔ پنجاب کو اس بنیاد پر تقسیم کیا جا رہا تھا کہ جن علاقوں میں مسلمانوں کی اکثریت ہے، وہ پاکستان میں شامل ہوں گے اور جہاں مسلمان اکثریت میں نہیں ہیں، وہ بھارت کا حصہ ہوں گے۔ گورداس پور کا علاقہ جہاں قادیان واقع ہے، اس علاقے کی صورت حال یہ تھی کہ اگر قادیانی آبادی خود کو مسلمانوں میں

شامل کراتی ہے تو یہ خطہ زمین پاکستان کے حصہ میں آتا ہے اور اگر قادیانی گروہ مسلمانوں سے الگ شمار ہوتا ہے تو گورداسپور کا یہ علاقہ بھارت کے پاس چلا جاتا ہے۔ اس وقت قادیانی گروہ کے سربراہ مرزا بشیر الدین محمود نے، جو مرزا غلام احمد قادیانی کا فرزند اور مرزا طاہر کا باپ تھا، اپنا کیس مسلمانوں سے الگ پیش کر کے یہ فیصلہ تاریخ میں ریکارڈ کرا دیا کہ قادیانی خود کو مسلمانوں سے الگ قرار دیتے ہیں۔ چنانچہ چودھری ظفر اللہ خان نے مرزا بشیر الدین محمود کی ہدایت پر قادیانیوں کی فائل مسلمانوں سے الگ ریڈکلف کمیشن کے سامنے پیش کی جس کی بنیاد پر گورداس پور غیر مسلم اکثریت کا علاقہ قرار پایا اور بھارت کے حوالے کر دیا گیا۔ اسی کے نتیجے میں بھارت کو کشمیر کے لیے راستہ ملا اور اس نے کشمیر پر قبضہ کر لیا اور آج بھی لاکھوں کشمیری عوام بھارتی تسلط اور وحشت و درندگی کے خلاف آزادی کی جنگ لڑ رہے ہیں۔

دوسری شہادت

بانی پاکستان قائداعظم محمد علی جناح کا جنازہ تھا۔ شیخ الاسلام علامہ شبیر احمد عثمانی جنازہ پڑھا رہے تھے۔ ملک بھر کے سرکردہ حضرات اور غیر ملکی سفرا جنازہ میں شریک تھے۔ حکومت پاکستان کا قادیانی وزیر خارجہ چودھری ظفر اللہ خان بھی موجود تھا، لیکن جنازہ میں شریک نہیں ہوا اور غیر مسلم سفیروں کے ساتھ الگ بیٹھا رہا۔ یہ بات قومی پریس کے ریکارڈ میں ہے کہ چودھری ظفر اللہ خان سے پوچھا گیا کہ آپ وزیر خارجہ ہیں، آپ کا گورنر جنرل فوت ہوا ہے، آپ کے ملک کا بانی اور سرپرست فوت ہوا ہے، آپ جنازہ کے وقت موجود ہیں لیکن جنازہ میں شریک نہیں ہوئے، اس کی وجہ کیا ہے؟ اس پر ظفر اللہ خان نے کہا کہ: ''مجھے کافر حکومت کا مسلمان وزیر خارجہ سمجھ لیا جائے یا مسلمان حکومت کا کافر وزیر خارجہ''۔ اس طرح چودھری ظفر اللہ خان نے بھی تاریخ میں اپنی شہادت ریکارڈ کروائی کہ مسلمانوں کا مذہب الگ ہے اور قادیانی ان سے الگ ایک نئے مذہب کے پیرو کار ہیں۔

تیسری شہادت

۱۹۷۴ء میں جب پاکستان کی قومی اسمبلی قادیانیوں کو غیر مسلم اقلیت قرار دینے کی آئینی ترمیم پر بحث کر رہی تھی تو اسمبلی نے یک طرفہ فیصلہ کرنے کے بجائے قادیانیوں کے دونوں گروہوں کو اسمبلی کے

سامنے اپنا موقف پیش کرنے کا موقع دیا۔ قادیانی گروہ کے سربراہ مرزا ناصر احمد نے گیارہ روز تک اور لاہوری گروپ کے سربراہ مولوی صدر الدین نے دو روز تک آسمبلی کے سامنے اپنے موقف کی وضاحت کی اور ان کا موقف پوری طرح سننے کے بعد آسمبلی نے اپنا فیصلہ صادر کیا۔ اس موقع پر مرزا ناصر احمد سے پوچھا گیا کہ وہ دنیا بھر کے ایک ارب کے لگ بھگ ان مسلمانوں کو کیا سمجھتے ہیں جو مرزا غلام احمد قادیانی کی نبوت کو تسلیم نہیں کرتے؟ مرزا ناصر احمد نے پہلے اس سوال کو گول کرنے کی کوشش کی، لیکن بالآخر پارلیمنٹ کے فلور پر انہیں اپنے اس عقیدہ کا دوٹوک اظہار کرنا پڑا کہ وہ مرزا غلام احمد قادیانی پر ایمان نہ لانے والے دنیا بھر کے ایک ارب کے لگ بھگ مسلمانوں کو کافر سمجھتے ہیں اور اس طرح مرزا طاہر احمد کے بڑے بھائی مرزا ناصر احمد نے بھی تاریخ کی عدالت میں اپنی یہ شہادت ریکارڈ کرا دی کہ وہ قادیانیت کو مسلمانوں سے الگ مذہب قرار دیتے ہیں۔

چوتھی شہادت

آج مرزا طاہر احمد دنیا بھر میں مسلمانوں اور پاکستان کے خلاف واویلا کر رہا ہے، لیکن میں مرزا طاہر احمد کو یاد دلانا چاہتا ہوں کہ ایک شہادت تو خود تم نے بھی ریکارڈ کرائی ہے جو تازہ ترین شہادت ہے۔ ابھی حال ہی میں ٹل فورڈ میں قادیانیوں کا سالانہ اجتماع ہوا ہے۔ مسلمانوں کے اجتماعات ہوتے ہیں تو مہمان خصوصی امام کعبہ ہوتے ہیں، شیخ الازہر ہوتے ہیں، مسلم ممالک کے سفرا ہوتے ہیں اور دیگر مسلم شخصیات شریک ہوتی ہیں۔ ہماری اس ختم نبوت کانفرنس میں حضرت مولانا خان محمد تشریف فرما ہیں، پاکستان کے مفتی اعظم تشریف فرما ہیں، لیکن ٹل فورڈ کے قادیانی اجتماع میں مہمان خصوصی کون تھا؟ بھارت کا ہندو ہائی کمشنر اور ساؤتھال کونسل کا سکھ میئر! یہ بھی تاریخ کی شہادت ہے۔

حضرات محترم! جب یہ بات طے شدہ ہے کہ قادیانیوں کا مذہب مسلمانوں سے الگ ہے اور دونوں ایک مذہب کے پیروکار نہیں ہیں تو ظاہر بات ہے کہ اسلام کا نام ان میں سے ایک ہی فریق استعمال کرے گا، دونوں استعمال نہیں کر سکتے۔ اسلام کا نام اور اس کے شعائر مثلاً کلمہ طیبہ، مسجد، امیر المومنین، ام المومنین، خلیفہ اور صحابی جو اسلام کے ساتھ مخصوص ہیں اور مسلمانوں کی پہچان بن چکے ہیں، انہیں استعمال کرنے کا حق ایک فرقہ کو ہو گا۔ آپ حضرات خانہ خدا میں بیٹھے ہیں، آپ ہی انصاف سے کہیں کہ کیا دونوں گروہوں کو اسلام کا نام، اسلام کا لیبل اور اس کا ٹریڈ مارک استعمال

کرنے کا حق ہے؟ اگر نہیں اور انصاف کا تقاضا یہ ہے کہ نہیں تو پھر انصاف کے ساتھ فیصلہ یہ بھی کیجیے کہ یہ حق دونوں میں سے کس فریق کا ہے؟ اس کا جو چودہ سو سال سے اس نام اور اصطلاحات کو استعمال کر رہا ہے یا اس کا جو ایک سو سال سے اس کا دعویدار ہے؟

اصل بات کو سمجھنے کی کوشش کریں۔ ایک عام کاروباری سی بات ہے، عام سی مثال ہے، اس حوالہ سے بات عرض کرتا ہوں۔ ایک کمپنی ہے جو سو سال سے کام کر رہی ہے۔ اس کا نام ہے، ایک لیبل ہے، ایک ٹریڈ مارک ہے۔ وہ اسی نام، لیبل اور ٹریڈ مارک کے ساتھ مارکیٹ میں متعارف ہے۔ اس کی ساکھ ہے، اسی حوالہ سے اس کا اعتبار قائم ہے۔ اب کچھ لوگ اس سے الگ ہو کر ایک نئی کمپنی بناتے ہیں۔ ایمان کے ساتھ بتائیے کہ کیا اس نئی کمپنی کو پہلی کمپنی کا نام، ٹریڈ مارک اور لیبل استعمال کرنے کا حق حاصل ہے؟ اگر نہیں اور اس کے باوجود نئی کمپنی اپنا مال مارکیٹ میں لانے کے لیے پہلی کمپنی کا نام استعمال کرتی ہے، اس کا ٹریڈ مارک اور لیبل استعمال کرتی ہے تو انصاف کی زبان اسے کیا کہتی ہے؟ قانون اسے کیا کہتا ہے؟ (لوگوں نے کہا: فراڈ، فراڈ) میں ان مغربی لابسٹوں سے جو ہمارے خلاف زور وشور سے پراپیگنڈا کرتے ہیں، پوچھتا ہوں کہ انصاف کا تقاضا کیا ہے؟ قانون کا تقاضا کیا ہے؟ دانش کا تقاضا کیا ہے؟ خدا کے لیے ہمارے موقف بھی سمجھنے کی کوشش کریں۔

نبوت کا دعویٰ بہاء اللہ نے بھی کیا تھا، اس کے ماننے والے بہائی بھی ہم سے الگ مذہب رکھتے ہیں۔ ہم انہیں کافر کہتے ہیں، لیکن ہمارا ان سے قادیانیوں کی طرز کا کوئی تنازعہ نہیں ہے، کشمکش کی کوئی فضا نہیں ہے، اس لیے کہ وہ اسلام کا نام استعمال نہیں کرتے۔ انہوں نے اپنا نام اور اصطلاحات الگ کر لی ہیں۔ وہ کلمہ طیبہ پڑھ کر لوگوں کو دھوکہ نہیں دیتے، اپنی عبادت گاہ کو مسجد نہیں کہتے۔ ہم انہیں کافر کہتے ہیں، لیکن ہمارا ان سے جھگڑا کوئی نہیں ہے۔ قادیانیوں کے ساتھ تنازعہ یہ ہے کہ مذہب نیا ہے، کمپنی نئی ہے، لیکن نام ہمارا استعمال کرتے ہیں، لیبل اور ٹریڈ مارک ہمارا استعمال کرتے ہیں۔ ہم اس کی اجازت نہیں دے سکتے۔ یہ دھوکہ ہے، فراڈ ہے، اور کھلا فریب ہے۔ ہم دنیا بھر کے قانون دانوں کو دہائی دیتے ہیں کہ خدا کے لیے ہمارے خلاف پراپیگنڈا کرنے سے پہلے یہ تو دیکھ لو کہ اصل قصہ کیا ہے اور تنازعہ کس بات پر ہے؟

محترم بزرگو اور دوستو! اب آیئے تیسرے سوال کی طرف کہ جب پاکستان میں قادیانیوں کو غیر مسلم

اقلیت قرار دے دیا گیا ہے، ان کی سرگرمیوں کے سدباب کے لیے آرڈی ننس بھی نافذ العمل ہو چکا ہے تو اب ان کے ساتھ جھگڑا کیا ہے اور انہیں انسانی اور شہری حقوق سے کیوں محروم رکھا گیا ہے؟ اس کے جواب میں پہلے آپ حضرات کو قادیانیوں کی اس تگ و دو سے آگاہ کرنا چاہوں گا جو انہوں نے اپنی مظلومیت کا ڈھنڈورا پیٹنے اور اسے مغربی ممالک کے سامنے انسانی حقوق کی پامالی کے مسئلہ کے طور پر پیش کرنے کے لیے کی ہے تاکہ آپ کو اندازہ ہو کہ قادیانی گروہ کے کام کا انداز کیا ہے اور اس کا طریقہ واردات کیا ہے۔

۱۹۸۴ء میں صدر جنرل محمد ضیاء الحق مرحوم نے ایک صدارتی آرڈیننس کے ذریعے قادیانیوں کی سرگرمیوں پر بعض پابندیاں عائد کر دیں جن کا خلاصہ یہ ہے کہ چونکہ قادیانی غیر مسلم اقلیت قرار دیے جا چکے ہیں، اس لیے وہ اسلام کے نام پر اپنے مذہب کی تبلیغ نہیں کر سکتے، خود کو مسلمان نہیں کہلوا سکتے، اپنی عبادت گاہ کو مسجد نہیں کہہ سکتے اور مسلمانوں کے مخصوص مذہبی شعائر اور علامات کو استعمال نہیں کر سکتے۔ آرڈیننس میں ایسا کرنے کو قابل سزا جرم قرار دیا گیا ہے۔

صدارتی آرڈیننس کے نفاذ کے بعد مرزا طاہر احمد لندن میں آکر بیٹھ گیا اور مغربی لابیوں کو اپروچ کر کے یہ دہائی دی کہ پاکستان میں امتناع قادیانیت کے صدارتی آرڈیننس کے ذریعے قادیانیوں کے انسانی حقوق چھین لیے گئے ہیں، ان کے ہیومن رائٹس پامال کر دیے گئے ہیں، انہیں عبادت کے حق سے روک دیا گیا ہے اور ان کے اپنے مذہب پر عمل کرنے پر پابندی لگا دی گئی ہے۔ ویسٹرن میڈیا بھی اس مہم میں شریک ہو گیا۔ اسے تو انتظار رہتا ہے کہ اسلام اور پاکستان کے خلاف کوئی بات کہنے کو ملے وہ تو بہانہ تلاش کرتے ہیں کہ مسلمانوں اور پاکستان کے خلاف کسی بات پر شور اٹھا سکیں۔

پھر بات یہیں تک نہیں رہی بلکہ جنیوا میں انسانی حقوق کے کمیشن کو اپروچ کیا گیا۔ یہ کمیشن یو این او کے تحت قائم ہے اور اس کا کام یہ ہے کہ دنیا کے مختلف ممالک پر نظر رکھتا ہے اور جہاں انسانی حقوق کی خلاف ورزی ہو رہی ہے، اس کی نشاندہی کرتا ہے اور اس کی بنیاد پر مغربی حکومتیں اپنی پالیسیاں مرتب کرتی ہیں۔ قادیانیوں کی طرف سے اس کمیشن کے پاس درخواست دائر کی گئی کہ پاکستان میں ان کے شہری حقوق پامال کیے جا رہے ہیں لیکن اس درخواست سے پہلے ایک اور بات کا اہتمام ہو چکا تھا کہ جنیوا میں پاکستان کی سفارت اور نمائندگی مسٹر منصور احمد سنبھال چکا تھا جو معروف قادیانی

ڈپلومیٹ ہے، پاکستان کا سینئر سفارت کار ہے اور اس وقت جاپان میں پاکستان کا سفیر ہے۔ اب راستہ صاف تھا۔ درخواست قادیانیوں کی طرف سے تھی اور کمیشن کے سامنے پاکستان کی نمائندگی اور حکومت پاکستان کے موقف کی وضاحت کی ذمہ داری ایک قادیانی سفارت کار پر تھی۔ نتیجہ وہی ہونا تھا جو ہوا اور جنیوا کے انسانی حقوق کمیشن نے اس مضمون کی قرار داد منظور کر لی کہ پاکستان میں واقعتا قادیانیوں کے انسانی حقوق پامال کر دیے گئے ہیں اور حکومت پاکستان اس کی ذمہ دار ہے۔

امریکی سینٹ کی قرار داد

بات اور آگے بڑھی اور قادیانی گروہ اس قرار داد کو لے کر واشنگٹن پہنچا جہاں پریسلر رہتا ہے، جہاں سولارز رہتا ہے۔ آپ جانتے ہیں ان کو؟ اور پاکستان کا کون سا باشعور شہری ہے جو پریسلر اور سولارز کو نہیں جانتا۔ وہاں لابنگ ہوئی۔ اس وقت امریکی سینٹ کی خارجہ تعلقات کمیٹی پاکستان کی اقتصادی اور فوجی امداد کے لیے شرائط طے کر رہی تھی۔ جنیوا کے انسانی حقوق کے کمیشن کی یہ قرار داد اس کے سامنے پیش ہوئی اور امریکی سینٹ کی خارجہ تعلقات کمیٹی نے پاکستان کے لیے امداد کی شرائط والی قرار داد میں قادیانیت کا مسئلہ بھی شامل کر لیا۔

یہ ہے مرزا طاہر احمد کی مہم اور یہ ہے اس کا طریق واردات جسے آپ کے علم میں لانا میں ضروری سمجھا۔

امریکی سینٹ کی خارجہ تعلقات کمیٹی نے پاکستان کی امداد کے لیے جن شرائط کو اپنی قرار داد میں شامل کیا، ان کا خلاصہ روزنامہ جنگ لاہور نے ۵ مئی ۱۹۸۷ء کو اور روزنامہ نوائے وقت لاہور نے ۲۵ اپریل ۱۹۸۷ء کو شائع کیا ہے۔ یہ میرے پاس موجود ہے اور آپ حضرات میں سے اکثر نہیں جانتے کہ ان شرائط میں کون کون سی باتیں شامل ہیں۔ عام طور پر صرف ایٹمی تنصیبات کے معائنہ کی شرط کا ذکر کیا جاتا ہے۔ بلاشبہ وہ بنیادی شرط ہے اور ہم اس مسئلہ پر پاکستانی حکومت اور قوم کے موقف کے ساتھ پوری طرح ہم آہنگ ہیں بلکہ ہم تو اس سے بھی آگے کی بات کہتے ہیں۔ ہمارا موقف یہ ہے کہ ایٹم بم پاکستان کا اور دیگر مسلم ملکوں کا حق ہے اور اس سلسلہ میں معذرت خواہانہ طرز عمل اختیار نہیں کرنا چاہیے۔ خیر، امریکی شرائط میں صرف ایٹمی تنصیبات کا مسئلہ نہیں، اور امور بھی ہیں جن میں سے دو کا بطور خاص آپ کے سامنے ذکر کرنا چاہتا ہوں۔

امریکی سینٹ کی خارجہ تعلقات کمیٹی کی اس قرار داد میں کہا گیا ہے کہ پاکستان کی امداد کے لیے ضروری ہو گا کہ امریکی صدر ہر سال ایک سرٹیفکیٹ جاری کرے جس میں یہ درج ہو گا کہ "حکومت پاکستان نے انسانی حقوق کی خلاف ورزیوں کے ازالہ میں نمایاں ترقی کی ہے۔"

یہ کتنا خوبصورت جملہ ہے، لیکن "كلمة حق اريد بها الباطل"۔ اس کے اندر جو زہر چھپا ہوا ہے، آپ حضرات نہیں جانتے۔ آپ کہیں تو عرض کر دوں کہ اس شوگر کے پردے میں کون سا زہر ہے؟ اس شرط میں انسانی حقوق کی خلاف ورزی کو روکنے کی بات کی گئی ہے۔ سوال یہ ہے کہ ان مغربی ملکوں کے ہاں انسانی حقوق کا تصور کیا ہے اور یہ کس چیز کو انسانی حقوق کی خلاف ورزی قرار دیتے ہیں؟ اس بات کو سمجھنے کے لیے دیکھنا پڑے گا کہ پاکستان میں مغربی میڈیا کے "بوسٹر" کیا کہتے ہیں؟ مغربی میڈیا کے بوسٹر ہر جگہ موجود ہیں، پاکستان میں بھی ہیں۔ امریکی سینٹ کی اس قرارداد کے بعد پاکستان میں بھی انسانی حقوق کمیشن قائم ہوا ہے جس کے سربراہ ریٹائرڈ جسٹس دراب پٹیل ہیں جو پارسی ہیں اور سیکرٹری جنرل بیگم عاصمہ جہانگیر ہیں جو ایک قادیانی ایڈووکیٹ مسٹر جہانگیر کی بیوی ہے۔ یہ لوگ پاکستان میں ہیومن رائٹس کے عنوان سے فورم منعقد کرتے ہیں، جلسوں کا اہتمام کرتے ہیں، مظاہرے کرتے ہیں اور امریکی سفارت کار ان کی پشت پناہی کرتے ہیں۔ ذرا سنیے، اس کمیشن کے سربراہ مسٹر پٹیل کیا کہتے ہیں۔ روزنامہ نوائے وقت لاہور ۲۵ اپریل ۱۹۸۷ء کے مطابق مسٹر دراب پٹیل نے کہا کہ:

> "کمیشن کو بہت سے ایسے قوانین منسوخ کرانے کی کوشش بھی کرنا ہوگی جو یک طرفہ ہیں اور جن سے انسانی حقوق کی خلاف ورزی کا راستہ کھلتا ہے۔ اس سلسلہ میں حدود آرڈیننس، قانون شہادت، غیر مسلموں کو مسلمانوں کی شہادت پر سزا دینے کا مسئلہ، قادیانیوں اور احمدیوں کو غیر مسلم قرار دینے والا قانون، جداگانہ انتخاب کا قانون، سیاسی جماعتوں کا قانون، یہ سارے قوانین ختم کرنا ہوں گے۔ یہ قوانین انسانی حقوق کے منافی ہیں۔"

روزنامہ نوائے وقت نے ۲۷ اپریل ۱۹۸۷ء کی اشاعت میں بیگم عاصمہ جہانگیر کے حوالہ سے کمیشن کے جنرل اجلاس میں کیے جانے والے مطالبات بھی شائع کیے ہیں جن کے مطابق:

"تعزیرات پاکستان اور حدود آرڈیننس کی بعض سزاؤں کو ظالمانہ اور غیر انسانی قرار دیا گیا ہے اور مطالبہ کیا گیا ہے کہ سنگسار کرنے، پھانسی پر لٹکانے اور موت کی سزا کو فی الفور ختم کیا جائے، نیز کوڑے لگانے، ہاتھ کاٹنے اور قید تنہائی کی سزائیں بھی ختم کر دی جائیں۔ جنرل اجلاس میں منظور کردہ ڈیکلریشن میں تمام مذہبی اقلیتوں کی تائید کی گئی ہے اور اس ضرورت پر زور دیا گیا ہے کہ حکومت کسی بھی شخص کے خلاف بالواسطہ یا بلاواسطہ مذہب یا فرقے کی بنیاد پر کوئی کارروائی نہ کرے۔"

حضرات محترم! اب تو آپ اچھی طرح سمجھ چکے ہوں گے کہ انسانی حقوق سے ان کی مراد کیا ہے اور ہیومن رائٹس کی خلاف ورزی کو روکنے کے عنوان سے مغربی ممالک اور لابیاں ہم سے کیا تقاضا کر رہی ہیں؟ امریکہ ہم سے یہ ضمانت چاہتا ہے کہ انسانی حقوق کی خلاف ورزی نہیں ہوگی اور اس سے مراد یہ ہے کہ ہم اسلامی قوانین نافذ نہیں کریں گے، قرآن کریم کے احکام نافذ نہیں کریں گے۔ ابھی حال ہی میں پاکستان کی پارلیمنٹ نے جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کی توہین پر موت کی سزا کا قانون منظور کیا ہے؟ معاذ اللہ ثم معاذ اللہ توہین رسالت کو بھی انسانی حقوق میں شامل کیا جا رہا ہے اور یہ حق مانگا جا رہا ہے کہ کوئی بدبخت توہین رسالت کا ارتکاب کرنا چاہے تو اسے اس کا حق حاصل ہو اور قانون کو حرکت میں آنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔

یہ ہے ان لوگوں کا انسانی حقوق کا تصور اور یہ اسی قسم کے انسانی حقوق کی خلاف ورزی سے ہمیں روکنا چاہتے ہیں۔ ہمارے ساتھ اس وقت کانفرنس کی اسٹیج پر پنجاب کے اسسٹنٹ ایڈووکیٹ جنرل جناب نذیر غازی ایڈووکیٹ بھی تشریف فرما ہیں، ان سے معذرت کے ساتھ ایک "ریڈ لائن" کراس کرانے لگا ہوں کہ ہم پر "انسانی حقوق" کا کیسا تصور تھوپا جا رہا ہے۔ گزشتہ سال چکوال میں اغوا اور قتل کی ایک واردات ہوئی۔ خصوصی عدالت میں مقدمہ چلا۔ عدالت نے قاتل کو موت کی سزا سنائی اور یہ فیصلہ دیا کہ پھانسی بر سر عام لوگوں کے سامنے دی جائے۔ اسلام کا فلسفہ بھی یہی ہے کہ سزا بر سر عام دی جائے تاکہ لوگوں کو عبرت حاصل ہو۔ قرآن کریم کا ارشاد ہے کہ "وليشهد عذابهما طائفة من المومنين" (النور) "مجرموں کو سزا دیتے وقت مسلمانوں کا ایک گروہ موجود رہے"۔ یہ اسلامی قانون کا تقاضا ہے، لیکن ہماری عدالت عظمیٰ نے اس سزا پر عمل درآمد روک دیا اور سپریم کورٹ میں گزشتہ چار

پانچ ماہ سے اس نکتہ پر بحث جاری ہے کہ مجرم کو لوگوں کے سامنے سزا دینا اس کی عزت نفس کے منافی ہے اور یہ انسانی حقوق کی خلاف ورزی ہے، اس لیے قاتل کو سرعام پھانسی نہیں دینی چاہیے۔

محترم بزرگو اور دوستو! یہ مثالیں میں نے وضاحت کے ساتھ اس لیے آپ کے سامنے رکھی ہیں تاکہ آپ اچھی طرح سمجھ سکیں کہ انسانی حقوق سے مغربی ممالک کی مراد کیا ہے اور یہ طاقتیں جب ہم سے انسانی حقوق کی خلاف ورزی نہ کرنے کی ضمانت طلب کرتی ہیں تو اس سے ان کا مقصد کیا ہوتا ہے؟

اب ایک اور شرط بھی سماعت فرما لیجیے جو امریکی سینٹ کی خارجہ تعلقات کمیٹی نے پاکستان کے لیے امریکی امداد کی شرائط کے ضمن میں اپنی قرارداد میں ذکر کی ہے۔ اس کے مطابق امریکی صدر ہر سال اپنے سرٹیفکیٹ میں یہ بھی لکھیں گے کہ: "حکومت پاکستان اقلیتی گروہوں مثلاً احمدیوں کو مکمل شہری اور مذہبی آزادیاں نہ دینے کی روش سے باز آرہی ہے اور ایسی تمام سرگرمیاں ختم کر رہی ہے جو مذہبی آزادیوں پر قدغن عائد کرتی ہیں"۔

آپ حضرات کو کچھ اندازہ ہو گیا ہوگا کہ مسئلہ کی نوعیت کیا ہے اور معاملات کہاں تک آگے پہنچ چکے ہیں۔ آپ میں سے بیشتر حضرات یہ کہہ دیں گے کہ ہمیں تو ان باتوں کا علم نہیں ہے، لیکن کیا آپ کا نہ جاننا بھی ہمارے ہی ذمہ ہے؟ کیا یہ بھی ہمارا قصور ہے کہ آپ حضرات مغرب میں رہتے ہوئے بھی ان امور سے واقف نہیں ہیں؟ خدا کے لیے آنکھیں کھولیے اور اپنی ذمہ داری کا احساس کیجیے۔

حضرات محترم! اب میں اس صدارتی آرڈیننس کی طرف آتا ہوں جسے مرزا طاہر احمد اور اس کی سرپرست لابیوں کی طرف سے پوری دنیا میں انسانی حقوق کی خلاف ورزی کا عنوان دے کر بدنام کیا جا رہا ہے یعنی ۸۴ء کا وہ صدارتی آرڈیننس جس کے تحت صدر جنرل محمد ضیاء الحق مرحوم نے قادیانیوں کو اسلام کا نام اور اصطلاحات استعمال کرنے سے روک دیا ہے اور جس کے بارے میں مغربی لابیاں یہ کہہ رہی ہیں کہ اس کے ذریعے قادیانیوں کے انسانی حقوق پامال ہو گئے ہیں۔ لیکن پہلے یہ وضاحت ضروری سمجھتا ہوں کہ یہ آرڈیننس صدر جنرل محمد ضیاء الحق مرحوم کا تیار کردہ نہیں ہے اور نہ ہی اسے فوجی ہیڈکوارٹر نے ترتیب دیا ہے بلکہ یہ آرڈیننس تحریک ختم نبوت کے ان مطالبات پر مشتمل ہے جن کے لیے ہم نے ملک بھر میں تحریک چلائی، سٹریٹ پاور کو منظم کیا، لوگوں کو سڑکوں پر لائے اور

راولپنڈی کی طرف لانگ مارچ کیا۔ اس پر مجبور ہو کر ہمارے مطالبات کو آرڈیننس کی شکل دی گئی، اس لیے یہ مارشل لاء ریگولیشن یا کسی ڈکٹیٹر کا نافذ کردہ قانون نہیں بلکہ عوامی مطالبات پر مشتمل ایک قانونی ضابطہ ہے۔ اس آرڈیننس کا مقصد اور منشا صرف یہ ہے کہ چونکہ قادیانیوں کا مذہب مسلمانوں سے الگ ہے، اس لیے قادیانی اسلام کا نام اور مسلمانوں کے مخصوص مذہبی شعائر استعمال نہ کریں۔ اس کے علاوہ اس آرڈیننس میں کچھ نہیں ہے۔

اس آرڈیننس کی رو سے پہلے قادیانیوں کو اس امر کا پابند کیا گیا ہے کہ وہ:

۱. اسلام کے نام پر اپنے مذہب کی تبلیغ نہ کریں اور خود کو مسلمان کے طور پر ظاہر نہ کریں۔

۲. اپنی عبادت گاہ کو ''مسجد'' نہ کہیں اور اپنی عبادت کے لیے لوگوں کو بلانے کا طریقہ ''اذان'' سے الگ اختیار کریں اور اسے اذان نہ کہیں۔

۳. جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواج مطہرات کے علاوہ کسی اور خاتون کو ''ام المومنین'' نہ کہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ اور خلفاء کے علاوہ کسی اور کے لیے ''صحابی'' یا ''خلیفہ'' کی اصطلاح استعمال نہ کریں۔

آرڈیننس میں ان امور کو جرم قرار دیتے ہوئے ان میں سے کسی ایک کے ارتکاب پر تین سال تک قید یا جرمانہ کی سزا مقرر کی گئی ہے۔ میں مغربی لابسٹوں سے پوچھتا ہوں کہ اس آرڈیننس میں قادیانیوں کو عبادت گاہ بنانے یا عبادت کرنے سے کہاں روکا گیا ہے؟ انہیں صرف اپنی عبادت گاہ کو مسجد کہنے سے روکا گیا ہے، اذان دینے سے روکا گیا ہے اور اسلام کے دیگر شعائر کے استعمال سے روکا گیا ہے اور جب قادیانیوں کا مذہب مسلمانوں کے مذہب سے الگ ایک جداگانہ مذہب ہے تو یہ پابندیاں اس کا منطقی تقاضا ہیں اور ان اصولی اور منطقی پابندیوں کو انسانی حقوق کی خلاف ورزی قرار دینا سراسر ناانصافی ہے۔ ہماری یہ آواز ویسٹرن میڈیا تک پہنچنی چاہیے اور مغربی لابیوں کے علم میں آنی چاہیے۔

برطانیہ میں رہنے والے مسلمان بھائیو! ہم تو مجبور ہیں، سال میں ایک آدھ بار آتے ہیں اور آواز لگا کر چلے جاتے ہیں۔ یہ آپ کی ذمہ داری ہے۔ اگر مرزا طاہر احمد یہاں کے ذرائع استعمال کر سکتا ہے تو مغرب کے ذرائع ابلاغ آپ کی دسترس سے باہر نہیں۔ اگر مرزا طاہر احمد مغربی لابیوں کو اپروچ کر سکتا

ہے تو آپ حضرات بھی کر سکتے ہیں۔ خدا کے لیے آپ بھی اپنے فرائض پہچانیں اور اسلام اور پاکستان کے دفاع کے لیے سائنٹفک بنیادوں پر کام کا طریقہ اختیار کریں۔

حضرات محترم! اگر بات انسانی حقوق کی ہے تو میں یہ بات ضرور عرض کرنا چاہوں گا کہ انسانی حقوق کی خلاف ورزی ہم نہیں کر رہے، بلکہ قادیانی کر رہے ہیں اور عملی صورت حال یہ ہے کہ خود ہمارے انسانی حقوق قادیانیوں کے ہاتھوں پامال ہو رہے ہیں اس لیے کہ اسلام کا نام، مسجد، اذان، کلمہ طیبہ اور دیگر اسلامی شعائر دنیا کے ایک ارب سے زائد مسلمانوں کی پہچان ہیں اور ان کی شناخت ہیں۔ اپنی شناخت کا تحفظ مسلمانوں کا حق ہے اور شناخت کی حفاظت انسانی حقوق میں شامل ہے جسے قادیانی مسلسل پامال کر رہے ہیں اور جب قادیانیوں کے خلاف اس جرم میں قانونی کارروائی ہوتی ہے تو مغربی لابسٹ چیخ اٹھتے ہیں کہ قادیانیوں کے انسانی حقوق پامال ہو رہے ہیں۔ مغرب میں بیٹھ کر اسلام اور پاکستان کے خلاف پراپیگنڈا کرنے والے لابسٹوں سے خدا کے نام پر اپیل کرتا ہوں کہ وہ کچھ انصاف کریں اور دنیا بھر کے مسلمانوں کا یہ حق تسلیم کریں کہ وہ اپنی شناخت اور پہچان کی حفاظت کر سکیں اور اسلام کا نام اور اس کا لیبل اور ٹریڈ مارک غلط استعمال کرنے والوں کو ایسا کرنے سے باز رکھ سکیں۔ یہ ہمارا حق ہے کہ ہم اپنے مذہبی نام کا تحفظ کریں، اپنی شناخت کا تحفظ کریں، اپنی علامات اور نشانیوں کا تحفظ کریں اور اپنی پہچان کو بچائیں۔ قادیانی گروہ مٹھی بھر ہونے کے باوجود مغربی طاقتوں اور لابیوں کی شہ پر ہماری پہچان خراب کر رہا ہے اور ہماری شناخت کو مجروح کر رہا ہے۔ صدارتی آرڈیننس میں قادیانیوں کو اسی جرم سے روکا گیا ہے، اس لیے انصاف کی بات یہ ہے کہ امتناع قادیانیت کا صدارتی آرڈیننس انسانی حقوق کی خلاف ورزی کا نہیں بلکہ ان کی حفاظت اور ہیومن رائٹس کے تقاضوں کی تکمیل کا آرڈیننس ہے۔

محترم بزرگو اور دوستو! میں نے آپ حضرات کا خاصا وقت لے لیا ہے، لیکن ابھی ایک اہم مسئلہ باقی ہے اور وہ ہے تحریک ختم نبوت کی موجودہ صورت حال اور وہ مسائل جن کا اس وقت ہمیں سامنا ہے۔ اس سلسلہ میں یہ اصولی بات آپ کے علم میں لانا ضروری سمجھتا ہوں کہ ہم نے اپنی تحریکی مطالبات کی بنیاد اپنے جذبات پر نہیں رکھی۔ آپ ہماری تقاریر میں بہت سی جذباتی باتیں سنتے ہیں۔ ہمارے مقررین واجب القتل ہونے کی بات بھی کرتے ہیں اور مسیلمہ کذاب کے خلاف حضرت

صدیق اکبرؓ کے مسلح جہاد وقتال کے حوالے بھی دیتے ہیں۔ ہمارے جذبات یہی ہیں اور ہر مسلمان کے جذبات یہی ہونے چاہئیں لیکن ہم نے اپنے مطالبات کی بنیاد ان جذبات سے بہت پیچھے ہٹ کر ایک سادہ اور منطقی سے تقاضے پر رکھی ہے اور قادیانیوں کو غیر مسلم اقلیت قرار دینے کے بعد اس کے منطقی اور قانونی تقاضے پورے کرنے کی بات کر رہے ہیں۔ یہ مطالبہ ہمارا نہیں تھا بلکہ سب سے پہلے یہ مطالبہ مفکر پاکستان علامہ محمد اقبالؒ نے کیا تھا اور انہوں نے اپنے بیانات اور خطوط میں اسے ناگزیر قرار دیا تھا۔ ہم نے اسے قبول کر لیا اور اسے ہی اپنی تحریک کی بنیاد بنا لیا۔ اس مطالبہ پر ۱۹۷۴ء میں ایک آئینی ترمیم کے ذریعے پاکستان کی پارلیمنٹ نے قادیانیوں کو غیر مسلم اقلیت قرار دیا تھا اور اسی کے تقاضے پورے کرنے کے لیے مسلسل جدوجہد اور تحریک کے نتیجہ میں ۱۹۸۴ء میں جنرل محمد ضیاء الحق مرحوم نے صدارتی آرڈیننس کے ذریعے قادیانیوں کو اسلام کا نام اور مسلمانوں کی مخصوص مذہبی اصطلاحات استعمال کرنے سے روک دیا تھا اور اس وقت ہم قادیانیوں کو غیر مسلم اقلیت قرار دینے کے سلسلہ میں مفکر پاکستان علامہ محمد اقبال کے اسی مطالبہ کے منطقی اور بدیہی تقاضوں کو پورا کرنے کی جدوجہد میں مصروف ہیں۔

حضرات محترم! ہمارے ہاں اس وقت ایک مسئلہ چل رہا ہے اور ہم اس کے لیے حضرت الامیر مولانا خواجہ خان محمد کی قیادت میں جدوجہد کر رہے ہیں۔ وہ مسئلہ پاکستان کے قومی شناختی کارڈ میں مذہب کے خانہ کا ہے اور ہمارا موقف یہ ہے کہ جب قادیانیوں کو غیر مسلم اقلیت قرار دے کر اسلام کا نام اور اسلامی اصطلاحات کے استعمال سے روک دیا گیا ہے اور جب انتخابات میں مسلمانوں اور غیر مسلموں کی نشستیں الگ الگ کر کے جداگانہ بنیادوں پر الیکشن کا طریق کار اختیار کر لیا گیا ہے اور جب الیکشن میں ووٹ کا استعمال شناختی کارڈ کی بنیاد پر ہوتا ہے تو ان تمام فیصلوں کا منطقی اور ناگزیر تقاضا ہے کہ قومی شناختی کارڈ میں مذہب کا خانہ بڑھا کر ہر شہری کی مذہبی حیثیت کو واضح کر دیا جائے تاکہ ووٹ کے استعمال، بیرون ملک سفر یا کسی بھی معاملہ میں کوئی اشتباہ باقی نہ رہے۔

جونیجو حکومت کے دور میں یہ سوال اٹھایا گیا تو کہا گیا کہ اصولاً یہ مطالبہ درست ہے، لیکن عملاً سارے ملک میں جاری شدہ شناختی کارڈوں کو منسوخ کرنا اور سب کارڈ نئے سرے سے جاری کرنا مشکل ہے۔ بے نظیر بھٹو صاحبہ کی حکومت میں بھی یہ بات اٹھائی گئی اور مطالبہ سے اتفاق کرتے ہوئے

عملی مجبوری ظاہر کی گئی۔ اب میاں نواز شریف صاحب کی حکومت میں یہ اعلان ہوا ہے کہ پورے ملک میں تمام شناختی کارڈوں کو کمپیوٹرائزڈ کیا جا رہا ہے تو ہم نے از سرِ نو مہم شروع کی کہ اب تو کوئی عملی رکاوٹ نہیں رہی۔ اب نئے شناختی کارڈوں میں مذہب کا خانہ بڑھا دیا جائے تو صدر پاکستان، وزیر اعظم اور وزیر داخلہ سے متعدّد وفود ملے۔ صدر محترم نے تو دو دفعہ قومی پریس میں وعدہ کیا کہ یہ مطالبہ درست ہے اور پورا کیا جائے۔ وزیر اعظم اور وزیر داخلہ نے بھی وفود سے وعدے کیے لیکن صدر پاکستان نے جس شناختی کارڈ کے ذریعے ملک میں کمپیوٹرائزڈ شناختی کارڈوں کے اجرا کا افتتاح کیا، اس میں مذہب کا خانہ نہیں تھا۔ ہم نے پھر احتجاج کیا۔ اسلام آباد میں تمام مکاتب فکر کی احتجاجی کانفرنس منعقد کی جس پر ہمیں بتایا گیا کہ شناختی کارڈوں کا اجرا روک دیا گیا ہے اور مذہب کے خانہ کے ساتھ نیا کارڈ تیار کیا جا رہا ہے۔ لیکن صورت حال ابھی جوں کی توں ہے اور تحریک ختم نبوت کے حوالہ سے آپ ہماری مشکلات کا اندازہ کریں کہ ایک سیدھی سی منطقی اور ناگزیر ضرورت کے لیے بھی ہمیں کن مراحل سے گزرنا پڑ رہا ہے۔ مجھے یہاں برطانیہ آنے کے بعد یہ افسوسناک بات معلوم ہوئی ہے کہ جناب وزیر اعظم نے تحریک ختم نبوت کے ایک وفد سے چند روز پہلے لاہور میں یہ کہا ہے کہ میں تو یہ کام کرنا چاہتا ہوں، لیکن ایک بہت بڑی لابی رکاوٹ ہے۔

میرے محترم بزرگو اور دوستو! کہنے کی باتیں بہت سی ہیں لیکن وقت کا دامن تنگ ہوتا جا رہا ہے اور میرے بعد دوسرے فاضل مقررین نے بھی آنا ہے، اس لیے آخر میں آپ حضرات سے پھر یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ مغرب کے ممالک اور لابیاں ایک بات طے کر چکی ہیں کہ کسی مسلمان ملک میں اسلامی نظام کو کسی قیمت پر نافذ نہ ہونے دیا جائے۔ یہ صرف ہمارا مسئلہ نہیں، الجزائر اور تیونس میں بھی یہی مسئلہ ہے اور مصر اور مراکش کا بھی یہی مسئلہ ہے۔ دنیا کے ہر مسلمان ملک میں مغربی میڈیا کے بوسٹر موجود ہیں جو انسانی حقوق اور بنیاد پرستی کے عنوان سے اسلامی قوانین کی مخالفت کر رہے ہیں اور قادیانیت جیسے گمراہ گروہوں کی پشت پناہی کر رہے ہیں۔ ان مسائل کا ادراک حاصل کرنا، مغربی لابیوں کے طریق واردات کو سمجھنا اور اس کا توڑ پیدا کرنا ہم سب کی ذمہ داری ہے، لیکن اس جسارت پر مجھے معاف فرمائیں کہ اس سلسلہ میں پہلی ذمہ داری آپ لوگوں کی ہے جو مغربی ممالک میں مقیم ہیں اور یہاں کے ذرائع تک رسائی حاصل کر سکتے ہیں۔ اس کے بعد ہماری ذمہ داری ہے۔ آئیے ہم سب

عہد کریں کہ اسلام، مسلمانوں اور پاکستان کے دفاع میں اپنی اپنی ذمہ داری کا احساس کریں گے اور اسے پورا کرنے کے لیے ہر ممکن کوشش کریں گے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو اس کی توفیق دیں، آمین۔

''وآخردعوانا ان الحمد للّٰہ رب العالمین''

سوشل گلوبلائزیشن کا ایجنڈا اور علماء کی ذمہ داریاں

(۲۰ جون ۲۰۰۵ء کو ابراہیم کمیونٹی کالج لندن میں ورلڈ اسلامک فورم کے زیر اہتمام ایک فکری نشست سے خطاب)

بعد الحمد والصلوۃ!

مجھے آج کی اس نشست میں گلوبلائزیشن کے ایجنڈے اور علماء کرام کی ذمہ داریوں کے حوالے سے گفتگو کے لیے کہا گیا ہے۔ اس سلسلے میں پہلی گزارش یہ ہے کہ گلوبلائزیشن کیا ہے؟ گلوبلائزیشن، عولمہ، بین الاقوامیت، عالمگیریت اور انٹرنیشنل ازم کی اصطلاحات کم و بیش ایک ہی معنی میں استعمال کی جا رہی ہیں۔ وہ یہ کہ سائنسی ترقی اور مواصلات کے جدید ترین ذرائع نے انسانی آبادی کو طویل جغرافیائی فاصلوں کے باوجود ایک دوسرے کے اس قدر قریب کر دیا ہے کہ پوری انسانی آبادی ایک مشترکہ سوسائٹی کا نقشہ پیش کر رہی ہے اور اسے "گلوبل ولیج" سے تعبیر کیا جا رہا ہے۔ دنیا کے ایک کونے میں واقعہ ہوتا ہے تو دوسرے کونے تک چند منٹوں میں اس کی نہ صرف خبر پہنچ جاتی ہے بلکہ اس کے مناظر بھی نظروں کے سامنے آجاتے ہیں اور اب صورت حال یہ ہے کہ دنیا کے کسی بھی حصے میں رونما ہونے والا واقعہ اور اس کے اثرات صرف اس خطے تک محدود نہیں رہتے بلکہ واقعہ کی نوعیت کے لحاظ سے دوسری دنیا بھی اس سے متاثر ہوتی ہے۔ سوسائٹیاں ایک دوسرے کے قریب آرہی ہیں، ثقافتیں ایک دوسرے میں مدغم ہو رہی ہیں اور تہذیبیں باہمی کشمکش کے باوجود ایک دوسرے کا اثر قبول کرتے ہوئے گڈمڈ ہوتی جا رہی ہیں۔ اس طرح دنیا ایک مشترکہ عالمی نظام کی طرف بڑھ رہی ہے اور عالمگیریت کا ماحول دن بدن گہرا ہوتا جا رہا ہے۔

یہ گلوبلائزیشن انسانی معاشرے کے ارتقا کا نام ہے جسے سائنس اور ٹیکنالوجی کی ترقی نے عروج

تک پہنچا دیا ہے اور نسل انسانی کے معاشرتی ارتقا اور سائنس و ٹیکنالوجی کی ترقی کے امتزاج نے پوری انسانی آبادی کو ایک دوسرے کے نہ صرف قریب کر دیا ہے بلکہ ذہنوں اور دلوں کے فاصلے بھی کم ہوتے جا رہے ہیں۔ اس گلوبلائزیشن کا اپنا کوئی ایجنڈا نہیں ہے۔ یہ صرف ارتقا کا ایک عمل ہے جو اپنی انتہا کی طرف فطری رفتار سے بڑھ رہا ہے، البتہ گلوبلائزیشن کے حوالے سے دنیا میں مختلف ایجنڈوں پر کام ہو رہا ہے اور ان ایجنڈوں کا مشترکہ نکتہ یہ ہے کہ مستقبل کے گلوبل ولیج میں جو کم و بیش پوری نسل انسانی کو محیط ہوگا، فکری اور تہذیبی قیادت کس کے ہاتھ میں ہوگی اور اس کا نظام کن اصولوں پر استوار ہوگا۔ اس پر مختلف ایجنڈوں میں کشمکش جاری ہے اور اس میں مسلسل پیش رفت ہو رہی ہے۔ یہ کشمکش دنیا کے وسائل پر کنٹرول کے حوالے سے بھی ہے، تہذیب و ثقافت کی بالادستی کے نام سے بھی ہے، فکر و عقیدہ کی برتری کے عنوان سے بھی ہے، عسکری کنٹرول اور اجارہ داری کے میدان میں بھی ہے اور مذہب کے شعبے میں بھی ہے۔ دنیا میں مختلف گروہ اور قوتیں ان میدانوں میں سرگرم عمل ہیں اور اس وقت مغرب کو بہرحال اس حوالے سے بالادستی کی پوزیشن حاصل ہے کہ دنیا بھر کے معاشی وسائل اس کے کنٹرول میں ہیں، اسے سائنس اور ٹیکنالوجی میں بالادستی بلکہ اجارہ داری حاصل ہے، بین الاقوامی سیاسی نظام میں اسے فیصلہ کن برتری حاصل ہے اور عسکری میدان میں اسے چیلنج کرنے والی کوئی قوت سردست میدان میں موجود نہیں ہے، اس لیے گلوبلائزیشن کے حوالے سے وہی اس وقت سب سے زیادہ سرگرم عمل ہے۔ امیر ترین ممالک مشترکہ گروپ قائم کر کے دنیا کے معاشی وسائل اور معدنی ذخائر پر اپنی اجارہ داری کو مضبوط کرنے، دنیا بھر کی تجارت و صنعت پر بالادستی قائم رکھنے، اسلحہ اور عسکریت کے میدان میں باقی ساری دنیا کو اپنی سطح تک آنے سے روکنے اور دنیا بھر میں اپنی ثقافت و تہذیب کو فروغ دینے کے لیے مسلسل مصروف کار ہیں، جبکہ ان کی تگ و تاز کا سب سے بڑا میدان عالم اسلام ہے۔

ہمارے حوالے سے مغرب کی یلغار دو جانب سے دنیا میں تیزی کے ساتھ بڑھ رہی ہے۔ ایک طرف مغرب کی سیکولر حکومتیں اور سیکولر لابیاں مسلم معاشرہ میں سیکولرازم اور لادینیت کو فروغ دے کر اور اس کے لیے اپنی توانائیاں اور صلاحیتیں پوری طرح جھونک کر ہماری نئی نسل کی دینی اساس اور فکر و عقیدہ کی بنیادوں کو کمزور کرنے میں لگی ہوئی ہیں۔ عالم اسلام کے بارے میں ان کے تمام تر ایجنڈے

کا مرکزی نکتہ یہ ہے کہ مسلمان اپنی معاشرتی زندگی میں مذہب کے کردار سے دست بردار ہو جائیں اور مذہب کے فکر و فلسفہ کو من وعن قبول کرتے ہوئے اپنی معاشرتی اور تہذیبی زندگی کو اس کے سانچے میں ڈھال لیں۔ دوسری طرف مسیحی مشنری سرگرمیاں دنیا کے مختلف مسلم ممالک میں سادہ لوح مسلمانوں کو مسیحیت کے دائرے میں شامل کرنے کی تگ و دو کر رہی ہیں۔ افریقہ کے کم و بیش سب ممالک، انڈونیشیا، بنگلہ دیش اور افغانستان سمیت وسطی ایشیا میں مسیحی مشنریوں اور مسیحی رفاہی این جی اوز کی تبلیغی سرگرمیاں دیکھیں تو اندازہ ہوتا ہے کہ مسلمانوں کو عیسائیت کا حلقہ بگوش کرنے کے لیے کس تیزی سے کام ہو رہا ہے۔ مغرب کی سیکولر حکومتوں اور مسیحی مشنری اداروں کو ایک دوسرے کا بھرپور تعاون حاصل ہے اور یوں محسوس ہوتا ہے کہ دونوں باقاعدہ منصوبے اور انڈرسٹینڈنگ کے ساتھ عالم اسلام کو مغلوب اور فتح کرنے کی مہم میں آگے بڑھ رہے ہیں۔

دوسری طرف عالم اسلام کی صورت حال یہ ہے کہ ہمارے بیشتر حلقوں اور افراد کو سرے سے اس صورت حال کا ادراک ہی نہیں ہے۔ مغرب کی اس مذہبی اور تہذیبی یلغار کا مقابلہ صرف دینی شعبہ سے تعلق رکھنے والے بعض حلقے کر رہے ہیں اور انہیں نہ صرف یہ کہ مسلم حکومتوں کا تعاون حاصل نہیں ہے بلکہ اکثر ممالک میں مسلم حکومتوں کا وزن دینی بیداری کے لیے کام کرنے والے دانش وروں اور حلقوں کے بجائے ان کے مخالف پلڑے میں ہے۔ اس طرح مسلم معاشرہ میں دینی بیداری، مذہبی وابستگی اور اسلامی تہذیب و ثقافت کے تحفظ و بقا کی جدوجہد کرنے والوں کو مغرب کی حکومتوں اور این جی اوز کے ساتھ ساتھ اپنی حکومتوں اور مقتدر طبقات کی مخالفت اور دباؤ کا بھی سامنا ہے اور انہیں دو طرفہ جنگ لڑنا پڑ رہی ہے۔

ان حالات میں علماء کرام کی ذمہ داریوں اور کردار کے حوالے سے سب سے پہلے یہ عرض کرنا ضروری ہے کہ ہمارا سب سے پہلا اور اہم فریضہ معروضی صورت حال سے آگاہی حاصل کرنا ہے، کیونکہ ہماری غالب اکثریت اس صورت حال سے آگاہ نہیں ہے اور اسے حالات کی سنگینی کا سرے سے کوئی ادراک نہیں ہے۔ ظاہر بات ہے کہ جب حالات پر ہماری نظر نہیں ہوگی اور ہم معروضی صورت حال سے باخبر نہیں ہوں گے تو اس کشمکش میں کوئی کردار ادا نہیں کر سکیں گے۔ یہ درست ہے کہ ہم سیاسی، معاشی، عسکری، سائنسی اور صنعتی و تجارتی میدانوں میں مغرب کا مقابلہ کرنے اور اس کا راستہ

روکنے کی پوزیشن میں نہیں ہیں، لیکن فکر وفلسفہ، تہذیب وثقافت، تعلیم وتربیت اور دعوت وتبلیغ کے میدان ہمارے لیے اجنبی نہیں ہیں اور ان محاذوں پر اگر ہم نئی نسل کی ذہن سازی اور صف بندی کے کام کو صحیح کر لیں تو نہ صرف یہ کہ عالم اسلام کو فتح کرنے کی مغربی مہم کا کم از کم ان میدانوں میں کامیابی کے ساتھ سامنا کر سکتے ہیں بلکہ زندگی کے دوسرے شعبوں کے باشعور افراد کو بھی ان کی ذمہ داریوں کی طرف توجہ دلا سکتے ہیں۔

اس سلسلے میں ہماری دوسری ذمہ داری یہ ہے کہ حالات کو سامنے رکھتے ہوئے اپنی ترجیحات کا از سر نو جائزہ لیں۔ جو کام ہم کر سکتے ہیں، اس کی منصوبہ بندی کریں۔ ایک دوسرے کے ساتھ تعاون کی فضا قائم کریں۔ ایک دوسرے کے تجربات سے استفادہ کریں اور مل جل کر نئی نسل کو دین کے ساتھ وابستہ رکھنے، اسے موجودہ صورت حال سے آگاہ کرنے اور بحیثیت مسلمان اپنی ذمہ داریوں کا احساس دلانے کی کوشش کریں۔ مجھے یقین ہے کہ ہم اگر فکری بیداری کے ماحول کو قائم رکھ سکیں اور زندگی کے مختلف شعبوں سے تعلق رکھنے والے حضرات کو ان کی ذمہ داریوں کا احساس دلاتے رہیں تو حالات میں بہت حد تک سدھار آ سکتا ہے۔

میں گفتگو کے خلاصہ کے طور پر علماء کرام سے یہ عرض کرنا چاہوں گا کہ وہ دنیا کے حالات سے بے خبر نہ رہیں۔ یہ بے خبریت جس میں ہم عافیت محسوس کر رہے ہیں، دینی فرائض کے حوالے سے ہمارے لیے زہر قاتل ہے۔ حالات سے آگاہی حاصل کریں اور ان کے مطابق اپنی صلاحیتوں، توانائیوں اور مواقع کا جائزہ لیتے ہوئے اپنے کردار کا تعین کریں۔ آج کے حالات میں یہی ہماری سب سے بڑی ذمہ داری ہے اور اسی صورت میں ہم عالم اسلام کی بہتری اور مسلم امہ کے مفاد کے لیے کوئی مثبت اور مؤثر کردار ادا کر سکتے ہیں۔

(الشریعہ، اگست ۲۰۰۵ء)

عصر حاضر کے چیلنج
اور علماء کی ذمہ داریاں

(۳ جون ۲۰۰۶ء کو لندن کے علاقے وائٹ چیپل میں ابراہیم کمیونٹی کالج کے ہال میں ورلڈ اسلامک فورم کے زیر اہتمام ایک علمی وفکری نشست سے خطاب)

اس وقت پورے عالم اسلام میں علماء کرام اور دین سے تعلق رکھنے والے حلقے، شخصیات اور ادارے جن دائروں میں کام کر رہے ہیں اور جو دین کے حوالے سے ان کی تگ و دو کے اصل دائرے ہیں، ان کی معروضی صورت حال پر میں اس وقت آپ حضرات سے گفتگو کرنا چاہتا ہوں تاکہ یہ بات آپ دوستوں کے سامنے آجائے کہ کون سے کام ہمارے کرنے کے ہیں؟ ان میں سے کون سے ہو رہے ہیں اور کون سے نہیں ہو رہے ہیں؟ میں نے موجودہ مسلم معاشرے اور عالمی ماحول کو سامنے رکھتے ہوئے دینی جدوجہد کی مختلف سطحوں کو سات دائروں میں تقسیم کیا ہے۔ ان کے علاوہ اور زاویے بھی ہیں، لیکن وقت کی کمی کے باعث میں اس وقت انہی کے بارے میں گفتگو کر سکوں گا۔

دینی مکاتب، مدارس، اداروں، شخصیات اور مساجد کی محنت کا ایک دائرہ یہ ہے کہ عام مسلمان کا دین سے تعلق قائم رہے اور اسلامی عقائد، عبادات، معاملات، اخلاقیات اور دیگر ضروری شعبوں کے بارے میں انہیں معلومات فراہم ہوتی رہیں۔ یہ کام نچلی سطح پر مساجد، مدارس اور دیگر مراکز میں وسیع پیمانے پر ہو رہا ہے اور اسی کی برکت ہے کہ مسلم سوسائٹی کے ایک بڑے حصے میں دین کے ساتھ تعلق، اس کی تعلیم اور اس کے بارے میں بیداری کا ماحول قائم ہے، لیکن اس حوالے سے میں ایک پہلو کی طرف علماء کرام اور دینی اداروں کی توجہ مبذول کرانا ضروری سمجھتا ہوں کہ ان مدارس، مکاتب اور تعلیمی اداروں سے تھوڑی بہت تعلیم پانے والے مسلم بچوں اور بچیوں کے تناسب پر ایک نظر ضرور ڈال لینی چاہیے کہ مجموعی آبادی کی نسبت سے وہ کتنے فیصد ہیں؟ اگر ہم اس کا صحیح اندازہ کر سکیں تو مسلم آبادی کے

دوسرے حصے کو دینیات کی ضروری تعلیم کے اس دائرے میں لانے کی محنت کرنا بھی ہماری ذمہ داری میں شامل ہے اور ہمیں اس کے راستے تلاش کرنا چاہییں۔

اس کے بعد دینی جدوجہد کا دوسرا دائرہ وہ نوجوان اور پڑھے لکھے لڑکے اور لڑکیاں ہیں جن کا تعلق اسکول اور کالج سے ہے۔ وہ جدید تعلیم حاصل کر رہے ہیں، ذرائع ابلاغ تک ان کی رسائی ہے، اخبارات، ریڈیو، ٹی وی اور انٹرنیٹ ان کے استعمال میں ہیں، ان کے ذہنوں کو ٹٹولنے اور وہاں کی صورت حال کا جائزہ لینا ضروری ہے، اس لیے کہ یہ نوجوان بچے اور بچیاں زبان سے کچھ کہیں یا نہ کہیں، ان کے ذہنوں سے اسلام کے مختلف احکام اور تعلیمات کے حوالے سے سوالات اور شکوک و شبہات کی ایک وسیع دنیا آباد ہے، لیکن وہ احتراماً یا فتوے کے ڈر سے اپنی زبانوں پر انہیں لانے کا حوصلہ نہیں پا رہے ہیں۔ آپ کسی پڑھے لکھے نوجوان لڑکے یا لڑکی کو جو مسلمان خاندان میں پیدا ہوا ہے اور اس کا دینی تعلیمات کے ساتھ براہ راست تعلق نہیں ہے، ٹٹول کر دیکھیں، اس کے ذہن میں جھانکیں اور بے تکلفی کے ماحول میں اس سے بات کریں۔ اس کے ذہن کے بند دروازے کے پیچھے سوالات اور شکوک کا جنگل آپ کو ملے گا اور خار دار جھاڑیوں کی ایک لمبی قطار آپ کو دکھائی دے گی۔ ہم میں سے کسی کو اس سے واسطہ پڑتا ہے تو ہم ذہن سے کانٹوں کو نکالنے کی بجائے انہیں فتوے، معاشرتی دباؤ اور دیگر مختلف حیلوں سے دبا دینے کی کوشش کرتے ہیں۔ میں اس صورت حال کی طرف آپ کو توجہ دلانا چاہوں گا کہ ہمیں اس کا جائزہ لینا چاہیے کہ کیا اس سلسلے میں ہم اپنی ذمہ داریاں صحیح طور پر پوری کر رہے ہیں؟ اور اگر نہیں کر رہے ہیں تو ہمیں اس کے لیے کیا راستہ اختیار کرنا چاہیے؟

دینی جدوجہد کا تیسرا دائرہ جس میں خاصا کام ہو رہا ہے، لیکن بہت سے کام کی ابھی ضرورت ہے، سوسائٹی کو دینی قیادت فراہم کرنا ہے۔ حافظ، قاری، امام، خطیب، مدرس اور مفتی حضرات کا وجود دینی قیادت کے حوالے سے مسلم معاشرے کی ضرورت ہے اور ہمارے دینی مدارس گزشتہ ڈیڑھ سو برس سے اس خلا کو پر کرنے اور ضرورت کو پورا کرنے کے لیے مصروف عمل ہیں، لیکن جنوبی ایشیا یعنی پاکستان، بھارت اور بنگلہ دیش کے دینی مدارس کے بارے میں یہ عرض کیا کرتا ہوں کہ مسلم معاشرے کو امام، خطیب، مدرس، قاری اور مفتی فراہم کرنے میں یہ مدارس نہ صرف خود کفیل ہیں، بلکہ بہت بڑے ایکسپورٹر بھی ہیں۔ آپ دنیا کے جس خطے میں بھی چلے جائیں، آپ کو پاکستان، بنگلہ دیش،

بھارت کے کسی نہ کسی مدرسے سے پڑھے ہوئے امام، خطیب اور قاری دینی خدمات سرانجام دیتے ہوئے ملیں گے، البتہ اس شعبے میں دو باتوں کی طرف توجہ دلانا میرے نزدیک انتہائی ضروری ہے:

ایک یہ کہ ہمیں یہ بات چیک کر لینی چاہیے کہ جن ضروریات کے لیے ہم ان افراد کو تیار کر رہے ہیں، کیا ان کی تعلیم و تربیت اور تیاری ان ضروریات کو پورا کرنے کے لیے کافی ہے؟ میرے خیال میں مسجد و مدرسے کے داخلی ماحول کی ضروریات کے لیے تو شاید تعلیم و تربیت کا موجودہ دائرہ کافی ہو، لیکن مسلم سوسائٹی کی اجتماعی ضروریات اور عالمی گلوبل ماحول کے تقاضوں کو پورا کرنے کے لیے ہمیں تعلیم و تربیت کے اس نظام کا بہرحال از سرِ نو جائزہ لینا ہوگا اور بہت سے تغیرات اور اضافوں کے لیے پیش رفت کرنا ہوگی۔

دوسری بات یہ ہے کہ ہم نے معاشرے کو خطیب فراہم کرنے کی ذمہ داری تو قبول کر رکھی ہے، لیکن ایک اچھا صحافی اور ایک اچھا قلم کار تیار کرنے کو ہم ابھی تک اپنی ذمہ داری سے باہر کی چیز سمجھ رہے ہیں، حالانکہ زبان اور قلم، دونوں ابلاغ کا ذریعہ ہیں۔ آج کے دور میں قلم کی اہمیت اگر زبان سے زیادہ نہیں تو اس سے کم بھی نہیں ہے بلکہ فکر و فلسفہ، عقائد اور تہذیب و ثقافت کی کشمکش کی اصل جولان گاہ قلم اور اس سے بڑھ کر الیکٹرانک میڈیا ہے جس کے لیے افراد کی تیاری کو دینی مدارس ابھی تک اپنی ذمہ داری نہیں سمجھ رہے۔ میرے نزدیک یہ المیہ سے کم نہیں اور اربابِ علم و دانش کو اس خلا کا احساس دلانا میں اپنا فرض سمجھتا ہوں۔

دینی محنت کا چوتھا دائرہ جسے دراصل پہلے نمبر پر ذکر کرنا چاہیے تھا، لیکن میں کام کی عملی تربیت کے پیش نظر اس کا چوتھے نمبر پر ذکر کر رہا ہوں، یہ ہے کہ پوری دنیائے انسانیت تک اسلام کی دعوت اور جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا پیغام پہنچانے کی فکر کی جائے۔ اس وقت دنیا میں چھ ارب کے لگ بھگ انسان بستے ہیں۔ ان میں مسلمانوں کی تعداد سوا ارب سے زیادہ بتائی جاتی ہے۔ باقی ساڑھے چار یا پونے پانچ ارب انسانوں تک اسلام کی دعوت پہنچانا اور انہیں قرآن کریم اور جناب اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بنیادی تعلیمات سے روشناس کرانا امت مسلمہ کا اجتماعی فریضہ ہے اور اس کے راستے تلاش کرنا دینی مدارس، شخصیات اور حلقوں کی ذمہ داری ہے۔ میرے مطالعے اور معلومات کے مطابق دنیا کے مختلف حصوں میں کچھ ادارے اور افراد اس کے لیے ضروری کام کر رہے ہیں، لیکن ایسا کوئی کام جسے

اجتماعی محنت اور ملّی جدوجہد سے تعبیر کیا جا سکے، کم از کم میرے علم میں اس کا کوئی وجود نہیں۔

دینی جدوجہد کا پانچواں دائرہ عالمی سطح پر اسلام کے بارے میں پھیلائے جانے والے شکوک و شبہات کا سامنا کرنا اور ان کے ازالے کے لیے محنت کرنا ہے۔ اس وقت بین الاقوامی سطح پر میڈیا اور لابنگ کے ادارے اسلامی تعلیمات اور احکام کے بارے میں شکوک و شبہات پھیلانے اور انسانی ذہنوں کو اس سے دور کرنے کے لیے جو منظم کام کر رہے ہیں، ان کا اس سطح پر کوئی جواب موجود نہیں ہے۔ ہم میں سے بہت سے افراد دنیا کے مختلف حصوں میں ان شکوک و شبہات کے ازالے کے لیے کام کر رہے ہیں، لیکن ان کا دائرہ بہت محدود ہے۔ مثلاً خود میری گفتگو اور تحریروں کا موضوع اکثر یہی باتیں ہوتی ہیں، لیکن ان کی حدود اور دائرۂ اثر اس قدر تنگ ہے کہ اسے عالمی سطح اور بین الاقوامی لیول کے کسی کام کا جواب تصور کرنا بھی شاید خود فریبی کے مترادف ہو۔ دینی جدوجہد کا یہ شعبہ بھی ہم سے توجہ مانگ رہا ہے اور ظاہر ہے کہ اس کے راستے تلاش کرنا اور اس کے لیے مناسب ماحول بنانا آخر کار دینی اداروں اور شخصیات ہی کی ذمہ داری ہے۔

دینی محنت اور تگ و تاز کا چھٹا دائرہ جو اس وقت عالمی سطح پر بہت زیادہ اہمیت اختیار کرتا جا رہا ہے، ''بین المذاہب مکالمہ'' ہے جس کا دائرہ کار روز بروز وسیع ہو رہا ہے۔ میرے نزدیک اس وقت ''بین المذاہب مکالمے'' کا جو ماحول منظم طریقے سے بنایا جا رہا ہے، وہ دراصل توجہ ہٹانے کی ایک سازش ہے، اس لیے کہ عالمی سطح پر جو کشمکش موجود ہے، اس کے اصل متحارب فریق مذاہب نہیں ہیں بلکہ مذہب اور لامذہبیت کے درمیان کشمکش ہے جسے لامذہبیت بڑی ہوشیاری کے ساتھ مذاہب کے درمیان کشمکش اور پھر مفاہمت و مکالمہ کا عنوان دے کر خود کو اس کے پردے میں چھپانے کی کوشش کر رہی ہے۔ اس چال کو سمجھنے کی ضرورت ہے اور اس فرق کو واضح کرنا ضروری ہے کہ مسلم علماء تو مذہب اور سوسائٹی دونوں کی نمائندگی کرتے ہیں، لیکن مسیحیت سمیت دوسرے مذاہب کے علماء صرف مذہب کی نمائندگی کرتے ہیں۔ وہ اپنی سوسائٹی کے نمائندہ نہیں ہیں، کیونکہ ان کی سوسائٹی کی نمائندگی وہ لوگ کر رہے ہیں جو مذہب کے معاشرتی کردار کی نفی کرتے ہیں اور سوسائٹی میں مذہب یا مذہبی نمائندوں کو کوئی اجتماعی کردار دینے کے لیے تیار نہیں ہیں، اس لیے انسانی سوسائٹی کے مسائل کے حوالے سے بات ہوگی تو اس میں دوسرا فریق دوسرے مذاہب کے علماء نہیں ہوں گے بلکہ وہ سیکولر

عناصر ہوں گے جو سوسائٹی کی نمائندگی کرتے ہیں۔ مذہبی علماء کے ساتھ صرف مذہب کے سوال پر بات ہوگی۔ کچھ عرصہ قبل مجھے اس نوعیت کے ایک مکالمے میں شمولیت کے لیے کہا گیا تو میں نے عرض کیا کہ پادری صاحبان سے گفتگو قرآن کریم یا بائبل کے بارے میں ہو سکتی ہے، انسانی حقوق کے عنوان سے ان سے گفتگو کا کوئی موقع نہیں ہے، اس لیے کہ وہ انسانی حقوق یا انسانی حقوق کے اداروں کے نمائندے نہیں ہیں۔ انسانی حقوق اقوام متحدہ کا ایجنڈا ہے، جنیوا ہیومن رائٹس کمیشن کا ایجنڈا ہے، اس لیے ان کے بارے میں جب بھی بات ہوگی تو انہی کے نمائندوں سے ہوگی۔ پادری صاحبان کا اس سلسلے میں کوئی کردار نہیں ہے۔

صورت حال کی یہ وضاحت اپنی جگہ، لیکن اس کے باوجود ''بین المذاہب مکالمے'' کی ضرورت اور اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا، اس کے روز بروز پھیلتے ہوئے دائرۂ کار کو آنکھیں بند کر کے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا اور یہ بھی دینی اداروں اور علماء کرام کی ذمہ داریوں میں شامل ہے۔

دینی جدوجہد کے ساتویں دائرے کے طور پر اس عالمی تہذیبی کشمکش کا تذکرہ کرنا چاہوں گا جو اگرچہ پہلی باتوں میں بھی شامل ہے، لیکن اس کی اہمیت کے پیش نظر اس کا الگ تذکرہ کرنا ضروری سمجھ رہا ہوں۔ عالمی تہذیبی کشمکش جس فیصلہ کن دور میں داخل ہوگئی ہے اور پوری قوت کے ساتھ آگے بڑھ رہی ہے، ہمارے دینی مدارس کے ماحول میں اس کی سرے سے کوئی خبر نہیں، حالانکہ مغربی فلسفہ و تہذیب سے واقفیت، اس کے طریق کار اور ہتھیاروں سے شناسائی اور ان کے توڑ کی کوششیں ان دینی مدارس کے فرائض میں سے ہیں جن مدارس نے اسلامی عقائد کی حفاظت اور قرآن و سنت کی تعلیم کے فروغ کے ساتھ ساتھ اسلامی معاشرت و تہذیب کی بقا اور تحفظ کی ذمہ داری سنبھال رکھی ہے، کیونکہ مغربی فلسفہ اور فکر کا براہ راست حملہ انہی پر ہے اور اس کی تمام تر تگ و دو کا اصل نشانہ اور ہدف وہی ہیں، اس لیے مغربی فلسفہ و فکر اور تہذیب و ثقافت سے خود واقف ہونا، اپنے اساتذہ اور طلبہ کو اس سے روشناس کرانا، علمی و فکری ماحول میں اس کے مقابلے کے لیے انہیں تیار کرنا اور اس شعبے میں متخصصین تیار کر کے اس چیلنج کا سامنا کرنا بہر حال دینی مدارس اور شخصیات ہی کا کام ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں ان امور کی طرف صحیح طور پر توجہ دینے کی توفیق دیں۔ آمین یا رب العالمین!

(روزنامہ پاکستان، ۷ جون ۲۰۰۶ء)

فکری بیداری کے مختلف دائرے
اور ہماری ذمہ داری

(۱۳ مئی ۲۰۰۸ء کو ورلڈ اسلامک فورم کے زیر اہتمام ابراہیم کمیونٹی کالج لندن میں فکری نشست کے حاضرین سے گفتگو)

بعد الحمد والصلوٰۃ!

اب سے سترہ اٹھارہ برس پہلے ہم نے ورلڈ اسلامک فورم تشکیل دیا اور احباب کو توجہ دلائی کہ وہ دینی جدوجہد کے حوالے سے آج کے دور کی ضروریات اور تقاضوں کا ادراک حاصل کریں اور ان کو سامنے رکھ کر اسلام اور مسلمانوں کے لیے اپنی محنت کو مؤثر بنائیں تو ہماری یہ آواز اجنبی سی محسوس ہو رہی تھی اور یوں لگتا تھا کہ شاید کوئی بھی ہماری اس آواز کو سنجیدگی کے ساتھ سننے کے لیے تیار نہیں ہو گا، لیکن آج بحمد اللہ تعالیٰ ہم مطمئن ہیں کہ اس آواز کو دھیرے دھیرے پذیرائی حاصل ہو رہی ہے اور دنیا کے مختلف حصوں میں بہت سے دوست اس طرف متوجہ ہو رہے ہیں۔ ہم نے کوئی انوکھی بات نہیں کی تھی، صرف یہ عرض کیا تھا کہ آپ دین کے جس شعبے میں کام کریں، اسی میں کام کریں اور اپنے ذوق کے مطابق کریں، البتہ اسے سلیقے سے کریں اور آج کے معروضی حالات اور ضروریات کو سامنے رکھ کر کریں۔ ہمیں دین کے حوالے سے کسی جدوجہد سے اختلاف نہیں ہے۔ کوئی جہاد کے عنوان سے کام کر رہا ہے، کوئی دعوت و تبلیغ کے دائرے میں مصروف عمل ہے، کوئی ختم نبوت کے تحفظ کا محاذ سنبھالے ہوئے ہے، کوئی تدریس و تعلیم کے شعبے میں سرگرم ہے، کوئی سلوک و احسان کے ذریعے امت کی خدمت کر رہا ہے، کوئی حضرات صحابہ کرام کے تقدس و ناموس کے تحفظ کے لیے محنت کر رہا ہے، کوئی امت میں فکری بیداری پیدا کرنے کے لیے کام کر رہا ہے، کوئی مغربی فلسفہ و ثقافت کی یلغار سے امت کو خبردار کرنے اور بچانے کو اپنا مقصد بنائے ہوئے ہے اور کوئی امت میں پیدا ہونے والے

فکری، اخلاقی اور اعتقادی فتنوں سے امت کو بچانے کی فکر میں ہے۔ یہ سب دین کے کام ہیں اور دینی جدوجہد کے شعبے ہیں، جس کا ذوق جس شعبے سے ہم آہنگی رکھتا ہو، اسے اسی میں کام کرنا چاہیے، لیکن اسے اپنے شعبے کے بارے میں وقت کے تقاضوں کا ادراک ضرور حاصل کرنا چاہیے، معروضی حالات کو سامنے رکھنا چاہیے اور مکمل شعور، ادراک اور منصوبہ بندی کے ساتھ کام کرنا چاہیے اور اس کے ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ وہ دوسرے دینی شعبوں میں کام کرنے والوں کی نفی نہ کرے، ان کی تحقیر نہ کرے بلکہ سب کو باہمی تعاون و مفاہمت کے ساتھ اپنے اپنے کام کو آگے بڑھانا چاہیے۔

ہمارا اپنا شعبہ امت کو مغرب کے فلسفہ و ثقافت کی یلغار سے آگاہ کرنا اور اس کے مقابلہ کے لیے علماء کرام اور دینی کارکنوں کو تیار کرنا ہے اور علماء کرام کو تعلیم، تبلیغ اور ابلاغ کے جدید ذرائع کے استعمال کی طرف متوجہ کرنا ہے جس کے لیے ہم گزشتہ اٹھارہ برس سے کام کر رہے ہیں اور اللہ تعالیٰ کا شکر ہے کہ ہماری بات اب دوستوں کو سمجھ آ رہی ہے اور دنیا کے مختلف حصوں میں اس سمت میں کام شروع ہو گیا ہے۔ ہم نے اس جدوجہد کے آغاز میں کہا تھا کہ ہم فکری بیداری پیدا کرنا چاہتے ہیں، لیکن آج میں اس سے اگلی بات آپ سے کرنا چاہتا ہوں کہ دنیا میں مختلف دائروں میں اور مختلف سطحوں پر دینی بیداری اور فکری بیداری کی جو لہر دکھائی دے رہی ہے اور شعور و ادراک کا جو احساس بیدار ہو رہا ہے، اسے صحیح ٹریک پر رکھنے کے لیے ہم کیا کر رہے ہیں؟ دنیا میں دینی بیداری بھی بڑھ رہی ہے اور فکری شعور میں بھی اضافہ ہو رہا ہے، ہمیں اس سے آگاہی حاصل کرتے ہوئے دیکھنا ہے کہ اسے صحیح رخ پر رکھنے اور غلط ٹریک پر جانے سے بچانے کے لیے ہم نے کیا کرنا ہے اور ہم پر اس کی کیا ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔

میں اسے تین حصوں میں تقسیم کروں گا۔ اسے آپ تین دائرے بھی کہہ سکتے ہیں اور تین سطحوں سے بھی تعبیر کر سکتے ہیں:

ان میں سے پہلی سطح تو یہ ہے کہ مسلمانوں کی نئی نسل میں دین سے وابستگی اور اس سے واقفیت کا رجحان بڑھ رہا ہے۔ اس کے اسباب میں آپ مختلف چیزوں کا ذکر کر سکتے ہیں۔ نوجوانوں میں دینی رجحانات میں اضافے کا سبب مسجد و مدرسہ کا نظام بھی ہے، دعوت و تبلیغ کا وسیع نیٹ ورک بھی ہے، مسلمانوں پر مسلسل ڈھائے جانے والے مظالم کا ردعمل بھی ہے اور سوسائٹی کی مذہب سے لاتعلقی

کے تلخ نتائج کا احساس بھی ہے۔ اس کے علاوہ بھی اس کے اسباب شمار کیے جاسکتے ہیں۔ سبب کوئی بھی ہو، مگر یہ امر واقعہ ہے کہ مسلم نوجوان میں دین سے وابستگی اور اس سے واقفیت کا رجحان بڑھ رہا ہے، لیکن سوال یہ ہے کہ اس رجحان کو صحیح رخ پر رکھنے کے لیے ہم کیا کر رہے ہیں؟ نوجوانوں کو دین سے واقفیت حاصل کرنے کے لیے میڈیا، تعلیم اور لابنگ کے جو ذرائع میسر ہیں، ان میں ہمارا یعنی دین کی جدوجہد کرنے والے روایتی حلقوں کا تناسب کیا ہے اور جدید دانش ور یعنی متجدد دین ان نوجوانوں کے ذہنوں میں شک کا بیج بونے کے لیے جو کچھ کر رہے ہیں، اس کے تدارک کے لیے ہمارا کردار کیا ہے؟

میرے نزدیک آج کا سب سے بڑا فتنہ تشکیک ہے۔ مغرب کی نمائندگی کرنے والے یا مغربی فکر و فلسفہ سے مرعوب و متاثر دانش وروں کی تکنیک اس دور میں یہ ہے کہ وہ نوجوانوں کو دین کے بارے میں معلومات فراہم کرتے ہیں اور قرآن کریم کے حوالے سے ان سے مخاطب ہوتے ہیں، وہ ان کے سامنے دین کی کسی بات سے انکار نہیں کریں گے، لیکن دین کا کوئی نہ کوئی مسئلہ ان کے سامنے رکھ کر اس کے حوالے سے شک کا بیج ان کے ذہنوں میں ڈال دیں گے۔ وہ جواب کے لیے علماء سے رجوع کرتے ہیں تو مناسب تیاری نہ ہونے کی وجہ سے وہ ان کا جواب نہیں دے پاتے جس سے شک اور زیادہ پختہ ہو جاتا ہے اور وہ نوجوان ایمان اور یقین کی پٹڑی سے اتر کر شکوک و شبہات کی دلدل میں پھنس جاتا ہے۔ آج کے نوجوانوں کے ذہنوں میں دین کے حوالے سے، دین کے احکام و مسائل کے حوالے سے اور سوسائٹی کے ساتھ دین کے تعلق کے حوالے سے سینکڑوں شبہات ہیں، بے شمار شکوک و شبہات ہیں جو ان کے ذہنوں میں ڈالے گئے ہیں۔ ہماری یعنی علماء کرام کی اس کے بارے میں تیاری نہیں ہے، مطالعہ نہیں ہے، تحقیق نہیں ہے، بلکہ سرے سے واقفیت ہی نہیں ہے جس کی وجہ سے ہم انہیں ڈانٹ دیتے ہیں یا گمراہی کا فتویٰ جڑ دیتے ہیں جس کے نتیجے میں آج کی نئی مسلمان پود میں ذہنی خلفشار بڑھتا جا رہا ہے۔

دوسری سطح یہ ہے کہ مسلم ممالک میں اسلامی شریعت کے ساتھ وابستگی کے عمومی رجحان میں بھی اضافہ ہو رہا ہے اور بین الاقوامی اداروں کی سروے رپورٹیں بتاتی ہیں کہ مسلم ممالک کی رائے عامہ اسلامی احکام و قوانین کے نفاذ میں دلچسپی رکھتی ہے۔ اس کا احساس و ادراک ورلڈ اسٹیبلشمنٹ کو ہے اور اس نے اس کا حل تلاش کر لیا ہے کہ مسلمانوں میں فقہی اسلام یعنی ''مولوی کے اسلام'' کی بجائے

”صوفی اسلام“ کو متعارف کرایا جائے۔ ورلڈ اسٹیبلشمنٹ کا خیال ہے کہ مولوی قاعدہ ضابطہ کی بات کرتا ہے، حلال و حرام کی بات کرتا ہے اور شرعی احکام کے نفاذ کی بات کرتا ہے، جبکہ صوفی نفس کی اصلاح کی بات کرتا ہے اور فرد کو خدا سے جوڑنے پر محنت کرتا ہے، اس لیے وہ مغرب کے انفرادیت (Individualism) کے فلسفہ سے زیادہ قریب ہے اور اسے سیکولرازم کے ساتھ ایڈجسٹ کیا جا سکتا ہے۔ مغرب اس معاملے میں الٹی زقند لگا کر داراشکوہ کے دور میں چلا گیا ہے، لیکن اسے یہ مغالطہ ہے، اس لیے کہ ہمارے ہاں جنوبی ایشیا میں تصوف کی نمائندگی داراشکوہ نہیں بلکہ مجدد الف ثانی، شاہ ولی اللہ دہلوی اور حاجی امداد اللہ مہاجر مکی کرتے ہیں اور ان کے ہوتے ہوئے تصوف کو انڈویجول ازم اور سیکولرازم کے لیے استعمال کرنے کا کوئی امکان موجود نہیں، مگر میں آپ حضرات کو توجہ دلانا چاہتا ہوں کہ ہماری جدوجہد اور فکرمندی کا ایک میدان یہ بھی ہے کہ مسلم معاشروں میں اسلامی شریعت کی عمل داری کے رجحانات کو باقی رکھنے اور انہیں سبوتاژ ہونے سے بچانے کے لیے ہمیں کام کرنا ہے اور انہیں غلط ٹریک پر چڑھانے کی سازش کو ناکام بنانا بہرحال ہماری ذمہ داری ہے۔

دنیا میں دینی بیداری اور فکری بیداری کی تیسری سطح یا تیسرا دائرہ یہ ہے کہ خود مغرب میں بھی آسمانی تعلیمات کی طرف واپسی اور مذہب کے معاشرتی کردار کی بحالی کے رجحانات رونما ہو رہے ہیں اور مغربی دانش وروں کو یہ محسوس ہو رہا ہے کہ مذہب صرف فرد کی نہیں بلکہ سوسائٹی کی بھی ضرورت ہے اور اس پر مسلسل کام ہو رہا ہے۔ شہزادہ چارلس کے لیکچروں میں وجدانیات کی طرف واپسی اور سابق وزیراعظم جان میجر کی ”بیک ٹو بیسز“ کی مہم اور آرچ بشپ آف کنٹربری کے بیانات میں شرعی احکام کے تذکرہ کو میں اسی پس منظر میں دیکھتا ہوں اور اس کے علاوہ اور بھی بہت سے شواہد موجود ہیں جو نشان دہی کرتے ہیں کہ مغرب میں ”مذہب بیزاری“ کے عمل کو نہ صرف بریک لگ گئی ہے بلکہ ”ریورس گیئر“ بھی لگ گیا ہے۔ اب یہ ہماری ذمہ داری ہے کہ ہم اس کا صحیح ادراک حاصل کریں اور اپنی دانش اور صلاحیتوں کو صحیح طور پر استعمال میں لا کر مذہب کے بارے میں اعلیٰ ترین سطح پر اس فکری بیداری کو صحیح رخ دینے کے لیے اسلام کی فطری تعلیمات کو آج کی زبان و اصطلاحات میں اور آج کی نفسیات کے مطابق دنیا کے سامنے لانے کا اہتمام کریں۔ یہ ہمارا فریضہ بھی ہے اور آج کی انسانی سوسائٹی کا ہم پر حق بھی ہے۔

اس لیے میں علماء کرام اور ارباب فکر و دانش سے عرض کروں گا کہ وہ فکری بیداری پیدا کرنے کے ساتھ ساتھ مختلف سطحوں پر نظر آنے والی فکری بیداری کو صحیح رخ پر رکھنے کے لیے بھی کردار ادا کریں اور معروضی حقائق و حالات سے مکمل واقفیت کے ساتھ اس سلسلے میں اپنی محنت کے خطوط کا تعین کریں۔ ورلڈ اسلامک فورم کا یہی پیغام ہے اور ہم اسی پیغام کو دنیائے اسلام تک پہنچانے کے لیے اپنی بساط کے مطابق جدوجہد کر رہے ہیں۔

(روزنامہ اسلام، ۲۹ و ۳۰ مئی ۲۰۰۸ء)

پاکستان میں نفاذ شریعت کی جدوجہد
اور مغربی ممالک میں مقیم مسلمانوں کی ذمہ داریاں

(۱۹۹۰ء میں شمالی امریکہ کے دورے کے موقع پر ۲ دسمبر کو شکاگو کے مسلم کمیونٹی سنٹر کے ہفتہ وار اجتماع سے ''شریعت بل اور پاکستان'' کے عنوان پر خطاب)

بعد الحمد والصلوۃ!

محترم بزرگو، دوستو اور قابل صد احترام بہنو!

ابھی تھوڑی دیر قبل شکاگو پہنچا ہوں اور مجھے ہدایت کی گئی ہے کہ آپ حضرات کے سامنے پاکستان میں شریعت اسلامیہ کے نفاذ کی جدوجہد کے بارے میں کچھ معروضات پیش کروں۔ اس عزت افزائی پر ایم سی سی کے ذمہ دار حضرات کا شکریہ ادا کرتے ہوئے آپ سب احباب سے اس دعا کا خواستگار ہوں کہ اللہ رب العزت کچھ مقصد کی باتیں کہنے اور سننے کی توفیق دیں اور حق کی جو بات بھی علم اور سمجھ میں آئے، اللہ تعالیٰ اس پر عمل کی توفیق عطا فرمائیں، آمین یا الہ العالمین۔

حضرات محترم!

پاکستان کا قیام ہی اس مقصد کے لیے عمل میں آیا تھا اور قیام پاکستان کی بنیاد اس امر کو ٹھہرایا گیا تھا کہ مسلمان ایک الگ قوم کی حیثیت رکھتے ہیں اور اپنے مذہب، اقدار، روایات اور نظریات و عقائد پر عمل درآمد کے لیے مسلمانوں کو الگ خطہ وطن کی ضرورت ہے۔ اسی مقصد کو سامنے رکھتے ہوئے ''پاکستان کا مطلب کیا، لا الہ الا اللہ'' کے نعرے کے ساتھ پاکستان قائم کیا گیا تھا، لیکن قیام پاکستان کو تینتالیس سال کا عرصہ گزر جانے کے باوجود ابھی تک ہم اپنے ملک کے نظام اور اجتماعی ڈھانچے کو اسلامی عقائد و احکام کے سانچے میں ڈھالنے کی منزل حاصل نہیں کر سکے اور شریعت اسلامیہ کی

بالادستی اور نفاذ کا جو خواب پاکستان کے قیام سے پہلے اس خطے کے مسلم عوام نے دیکھا تھا، وہ ابھی تک تشنہ تعبیر ہے۔ اس سے پہلے کہ میں ان رکاوٹوں کا ذکر کروں جو پاکستان میں اسلام کے نفاذ اور شریعت کی بالادستی کی راہ میں حائل ہیں، نفاذ شریعت کے حوالے سے اس تدریجی پیش رفت سے آپ کو آگاہ کرنا ضروری سمجھتا ہوں جس کی رفتار اگرچہ بہت سست ہے، لیکن بہرحال ایک پیش رفت موجود ہے اور اس سلسلے میں عملی کام بھی ہوا ہے جسے آگے بڑھانے کی کوشش مسلسل جاری ہے۔

اس سلسلے میں سب سے پہلا اور بنیادی کام "قرارداد مقاصد" کی منظوری ہے جو ۱۹۴۹ء میں دستور ساز اسمبلی کے رکن حضرت علامہ شبیر احمد عثمانی کی جدوجہد کے نتیجے میں متفقہ طور پر پاس ہوئی۔ اس قرارداد میں اللہ تعالیٰ کی حاکمیت اعلیٰ کے سامنے سر تسلیم خم کرتے ہوئے یہ طے کیا گیا ہے کہ عوام کے منتخب نمائندے خدا تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی ہدایات کے دائرے میں رہتے ہوئے ملک کا نظام چلائیں گے۔ یہ ایک اصولی فیصلہ تھا جس سے ملک کی نظریاتی بنیاد متعیّن ہو گئی اور اس امر کا فیصلہ ہو گیا کہ پاکستان ایک سیکولر ریاست نہیں بلکہ نظریاتی اسلامی مملکت ہے۔ قرارداد مقاصد پاکستان میں اب تک نافذ ہونے والے ہر دستور میں شامل رہی ہے اور موجودہ آئین میں بھی، جو ۱۹۷۳ء کا دستور کہلاتا ہے، شامل ہے لیکن اس قرارداد کی روشنی میں جو عملی اقدامات ہونے چاہئیں تھے، ان کی رفتار سست رہی بلکہ ایک لحاظ سے نہ ہونے کے برابر تھی۔

دوسرا مرحلہ ۱۹۷۳ء کے دستور کی تشکیل کا تھا۔ اس وقت دستور ساز اسمبلی میں حضرت مولانا مفتی محمود صاحب، حضرت مولانا عبد الحق صاحب، مولانا شاہ احمد نورانی، پروفیسر غفور احمد اور ان کے رفقاء کی جدوجہد سے ایک اور اہم دستوری فیصلہ ہو گیا کہ اسلام کو پاکستان کا سرکاری مذہب قرار دے دیا گیا اور ملک میں نافذ قوانین کو اسلامی احکام کے سانچے میں ڈھالنے کے لیے اسلامی نظریاتی کونسل کی تشکیل کے ساتھ اس کام کے لیے وقت کی ایک حد طے کر دی گئی۔

تیسرے مرحلے میں جنرل محمد ضیاء الحق مرحوم کے دور اقتدار میں ہونے والے وہ اقدامات شامل ہیں جن کے تحت بعض شرعی قوانین کے نفاذ کے علاوہ وفاقی شرعی عدالت کا قیام عمل میں لایا گیا۔ وفاقی شرعی عدالت ممتاز علماء کرام اور جسٹس صاحبان پر مشتمل ہے اور اسے یہ اختیار دیا گیا ہے کہ وہ ملک کے کسی بھی قانون کو قرآن و سنت کے منافی قرار دے کر حکومت کو قانون کی تبدیلی کا نوٹس دے سکتی

ہے۔ اگرچہ دستوری دفعات، عدالتی نظام، مالیاتی قوانین اور عائلی قوانین کو وفاقی شرعی عدالت کے دائرۂ اختیار سے مستثنٰی قرار دے دیا گیا ہے، لیکن اس کے باوجود بہت سے امور شرعی عدالت کی دسترس میں تھے اور اس نے اس ضمن میں متعدّد اہم فیصلے بھی کیے ہیں۔

چوتھا مرحلہ ''شریعت بل'' کے نفاذ کی جدوجہد کا ہے۔ ''شریعت بل'' سینٹ آف پاکستان کے دو ارکان مولانا سمیع الحق اور مولانا قاضی عبداللطیف نے ۱۹۸۵ء میں پیش کیا تھا جس کے لیے گزشتہ پانچ سال سے جدوجہد اور بحث و تمحیص ہر سطح پر ہوئی ہے۔ مختلف ایوانوں کے علاوہ قومی اخبارات اور عوامی حلقوں میں بھی اس کے بارے میں بہت کچھ کہا گیا ہے اور کہا جا رہا ہے۔ کچھ عرصہ قبل سینٹ نے شریعت بل کو متفقہ طور پر منظور بھی کر لیا تھا لیکن قومی اسمبلی ٹوٹ جانے کے باعث یہ بل اس میں پیش نہ ہو سکا اور اب پھر سینٹ میں دوبارہ منظوری کے لیے زیرِ بحث ہے۔

حضرات گرامی قدر!

اس وقت ''شریعت بل'' کی تمام دفعات کی وضاحت کرنے کی تو گنجائش نہیں ہے، کیونکہ وقت بہت مختصر ہے مگر بعض اہم دفعات کا تذکرہ ضروری ہے تاکہ آپ حضرات یہ سمجھ سکیں کہ اس بل کا بنیادی مقصد کیا ہے

شریعت بل کی سب سے اہم اور بنیادی دفعہ وہ ہے جس میں شریعت اسلامیہ کو ملک کا ''سپریم لا'' قرار دیا گیا ہے۔ اس وقت صورت حال یہ ہے کہ پاکستان میں مختلف قسم کے قوانین رائج ہیں۔ ان میں برطانوی دور غلامی کے قوانین بھی ہیں جو حصول آزادی کے باوجود بدستور چلے آ رہے ہیں اور بعض شرعی قوانین بھی ہیں۔ اس کے علاوہ رواجات بھی بعض دائروں میں قانون کے طور پر مؤثر ہیں، مگر ان سب پر بالادستی موجودہ قانونی نظام کو حاصل ہے جو برطانوی استعمار کی یادگار ہے۔ شریعت بل میں شریعت کو ملک کا سپریم لا قرار دے کر اس امر کا اہتمام کیا گیا ہے کہ تمام غیر شرعی قوانین کو غیر مؤثر بنایا جائے۔

بل کی ایک دفعہ میں شریعت کی قانونی تعریف متعیّن کی گئی ہے، کیونکہ مختلف حلقے شریعت کے بارے میں ابہام پیدا کرنے کی مسلسل کوشش کر رہے ہیں، اس لیے شریعت بل میں یہ طے کر دیا گیا ہے کہ شریعت سے مراد اسلام کے وہ احکام ہیں جو قرآن و سنت سے ثابت ہیں۔

ایک اور اہم دفعہ میں ملک کی تمام عدالتوں کو پابند کیا گیا ہے کہ وہ مقدمات کا فیصلہ شریعت کے مطابق کریں۔ اس سے ملک کے عدالتی نظام میں انقلابی تبدیلی کی راہ ہموار ہوگی اور اس دفعہ کے نفاذ کی صورت میں لوگوں کے مقدمات کے فیصلے انگریزی قانون کے بجائے شرعی قوانین کے تحت ہونے لگیں گے۔

ایک دفعہ کے تحت قانون کے نفاذ اور عدالتی احتساب کے دائرے میں صدر، وزیر اعظم، گورنر اور وزیر اعلیٰ سمیت ان تمام شخصیات کو شامل کیا گیا ہے جو اس وقت مروجہ قانون کے تحت عدالتی احتساب سے مستثنیٰ ہیں۔ اس کے علاوہ ملک کے معاشی نظام کو اسلام کے سانچے میں ڈھالنے کے لیے ایک نظام کار وضع کیا گیا ہے اور تعلیمی نظام کو اسلامی تقاضوں کے مطابق بنانے کے لیے طریق کار طے کیا گیا ہے۔

برادران محترم!

اس مختصر تعارف سے آپ کے ذہن میں یہ بات واضح ہوگئی ہوگی کہ ”شریعت بل“ کے نفاذ سے اصل مقصد کیا ہے۔ یہ دراصل نظام کی تبدیلی کی جدوجہد ہے اور خاص طور پر ملک کے عدالتی نظام کو اسلام کے سانچے میں ڈھالنے کی جنگ ہے جس میں اس وقت ہم مصروف ہیں اور آپ حضرات سے کامیابی کی دعاؤں کے ساتھ ساتھ تعاون اور حوصلہ افزائی کے بھی طلب گار ہیں۔

اب میں اس سوال کی طرف آتا ہوں جو آپ کے ذہنوں میں ضرور اٹھ رہا ہوگا کہ آخر اسلام کے نام پر بننے والے ملک اور مسلم اکثریت کے معاشرہ میں اس وقت شریعت بل پر آخر پانچ سال سے صرف بحث وتمحیص کیوں ہو رہی ہے اور یہ نافذ کیوں نہیں ہو جاتا؟ پھر یہ سوال بھی آپ حضرات کے ذہنوں کو پریشان کر رہا ہوگا کہ نفاذ اسلام کے جن تدریجی اقدامات کا میں نے ذکر کیا ہے، ان سب کے باوجود حالات میں تبدیلی کیوں نہیں آ رہی اور عملاً اسلامی احکام وقوانین کا نفاذ اور کارفرمائی کیوں دکھائی نہیں دے رہی؟

ان سوالات کے جواب میں مناسب تو یہ تھا کہ ان رکاوٹوں کا تفصیل سے ذکر اور تجزیہ کیا جاتا جو نفاذ شریعت کی راہ میں حائل ہیں، لیکن وقت مختصر ہے، اس لیے میں اس سلسلے میں سب سے بڑی رکاوٹ کا حوالہ دینے پر اکتفا کروں گا جو تمام رکاوٹوں کا سرچشمہ ہے اور جس رکاوٹ کو راستے سے

ہٹانے کے لیے ہم گزشتہ تینتالیس سال سے اس کے ساتھ سر پھوڑ رہے ہیں۔ وہ رکاوٹ یہ ہے کہ ہمارے ملک میں اجتماعی قیادت کی باگ ڈور جن عناصر کے ہاتھ میں ہے، وہ نہ صرف مغربی تعلیم گاہوں کے تربیت یافتہ اور مغربی تہذیب و ثقافت سے مرعوب ہیں، بلکہ اپنے معاشرے میں مغربی نظریات و اقدار کی فکری اور تہذیبی نمائندگی کو مقصد زندگی سمجھے ہوئے ہیں۔ ویسٹرن میڈیا اسلام کے بارے میں جو شوشہ چھوڑتا ہے، وہ ان کا منشور بن جاتا ہے۔ مغرب والے اگر نفاذ اسلام کی جدوجہد پر بنیاد پرستی کی پھبتی کستے ہیں تو ہمارے یہ بھائی بھی بنیاد پرستوں سے لاتعلقی کے اظہار کو ضروری سمجھ لیتے ہیں اور مغرب میں اگر اسلامی قوانین کو فرسودہ، وحشیانہ اور ظالمانہ کہا جاتا ہے تو ان لوگوں کی زبانیں بھی انہی الفاظ کا ورد کرنے لگتی ہیں۔

میرے محترم دوستو!

آپ حضرات تو خود مغرب میں رہتے ہیں، یہاں کی قیادت اور میڈیا کا مزاج آپ سے بہتر کون سمجھ سکتا ہے؟ آپ کے سامنے سب کچھ ہوتا ہے۔ عالم اسلام کے خلاف یہاں جو سازشیں ہوتی ہیں، آپ ان سے بے خبر نہیں ہیں اور آپ کو یہ بتانے کی ضرورت نہیں ہے کہ پاکستان بلکہ تمام مسلم مالک میں نفاذ شریعت کی تحریکات کو جن عناصر سے مقابلہ درپیش ہے، ان کی پشت پر مغرب خود کھڑا ہے۔ یہ صرف پاکستان کی بات نہیں، دوسرے مسلم ممالک میں بھی اسلام کی بالادستی اور شریعت کے نفاذ کی جدوجہد ہو رہی ہے اور ان سب کا مقابلہ ایک ہی قسم کے طبقے سے ہے جو مغرب سے مرعوب ہے اور مغرب پوری طرح اس طبقہ کی پشت پناہی کر رہا ہے۔ آپ حضرات یقیناً اس امر سے باخبر ہوں گے کہ امریکہ میں ایک باقاعدہ انسٹیٹیوٹ کام کر رہا ہے جس کا مقصد عالم اسلام میں دینی بیداری کی تحریکات کا کھوج لگانا، ان کے بارے میں معلومات حاصل کرنا اور انہیں ناکام بنانے کے منصوبے تیار کرنا ہے۔ اس انسٹیٹیوٹ کی سربراہی امریکہ کے سابق صدر نکسن کے ہاتھ میں ہے جنھوں نے مسلم بنیاد پرستی کی تحریکات کے تعاقب کو اپنا مشن بنایا ہوا ہے۔

ہمارا مقابلہ ان قوتوں کے ساتھ ہے۔ ہماری رفتار اگرچہ بہت سست ہے لیکن قدم بہرحال آگے بڑھ رہے ہیں۔ ہم آپ سے دعا کے خواست گار ہیں کہ اللہ تعالیٰ ہمیں کام کی صحیح رفتار نصیب فرمائیں اور نفاذ شریعت کی جدوجہد میں کامیابی سے ہم کنار کریں، آمین یا الٰہ العالمین۔

حضرات محترم!

ان گزارشات کے بعد ایک بات اور بھی آپ حضرات کی خدمت میں عرض کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔ وہ یہ ہے کہ آپ حضرات جو مغربی ممالک، بالخصوص امریکہ میں آباد ہیں، عالم اسلام اور پاکستان میں نفاذِ شریعت کی تحریکات کے حوالے سے آپ پر کیا ذمہ داری عائد ہوتی ہے اور وہ کون سے عملی کام ہیں جو اس سلسلے میں آپ کر سکتے ہیں؟ آپ کا کام صرف دعا کرنا یا نیک خواہشات کا اظہار کرنا نہیں، بلکہ اس سے آگے بڑھ کر آپ کو عملی جدوجہد میں شریک ہونا چاہیے اور اس کی کئی صورتیں ہو سکتی ہیں۔ مثلاً ایک صورت یہ ہے کہ نفاذ شریعت کی جدوجہد کرنے والی تحریکات کو آپ مالی طور پر مضبوط بنائیں اور انہیں فنڈز مہیا کریں تاکہ وہ اپنی جدوجہد کے لیے مزید وسائل فراہم کر سکیں اور زیادہ منظم طریقے سے کام کر سکیں۔ اس طریقے سے آپ اس کام میں عملی طور پر شریک ہو سکتے ہیں، لیکن اس وقت میں اس سے بھی زیادہ مؤثر اور ضروری پہلو کی طرف آپ کو توجہ دلانا چاہتا ہوں کہ جو لابیاں یہاں بیٹھ کر مسلم ممالک میں اسلام بیزار عناصر کی سرپرستی کر رہی ہیں، ان کا مقابلہ آپ بہتر طور پر کر سکتے ہیں۔ آپ ان لابیوں کو جانتے ہیں، ان کے مزاج اور طریق کار کو سمجھتے ہیں اور ایک آزاد سوسائٹی میں رہنے کی وجہ سے ان کا مقابلہ کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ آپ کے پاس وسائل ہیں، سوچ ہے، استعداد ہے، اور آپ ان تمام ذرائع تک پہنچ سکتے ہیں جو اسلام اور عالم اسلام کے خلاف استعمال ہو رہے ہیں۔ صرف اس کا احساس بیدار کرنے کی ضرورت ہے اور کام کو منظم کرنے کی ضرورت ہے۔

میں آپ کے سامنے کوئی منصوبہ پیش نہیں کر رہا، ایک اہم مسئلہ کی طرف توجہ دلا رہا ہوں اور اس کے حل کی ضرورت کا احساس بیدار کر رہا ہوں۔ اگر آپ اس کو مسئلہ سمجھتے ہیں اور اس کے لیے کوئی کردار ادا کرنے پر اپنے دل و دماغ کو تیار پاتے ہیں تو اس کا عملی طریقہ خود سوچیے۔ اگر یہودی یہاں بیٹھ کر صہیونیت اور اسرائیل کے لیے کام کر سکتا ہے تو مسلمان اسلام کے لیے کیوں نہیں کر سکتا؟ اگر یہودی یہاں کے وسائل اور سوسائٹی کی سہولتوں کو اپنے مذہب اور مرکز کے لیے استعمال میں لاتا ہے تو مسلمان کو بھی اس میں شرم محسوس نہیں کرنی چاہیے۔ بہر حال میری آپ حضرات سے اور امریکہ میں رہنے والے تمام مسلمانوں سے گزارش ہے کہ وہ اسلام دشمن لابیوں کے مقابلے کے لیے خود کو منظم کریں اور مسلم ممالک میں نفاذ شریعت کی راہ میں رکاوٹ ڈالنے والے عناصر کی سرپرست لابیوں کو ناکام

بنانے کے لیے جو کچھ آپ کے بس میں ہے، کر گزریں۔

محترم دوستو اور بھائیو!

آخر میں ایک اور ضروری بات آپ کی خدمت میں عرض کرنا ضروری خیال کرتا ہوں۔ وہ یہ کہ شریعت کے سارے احکام حکومت اور اقتدار سے متعلق نہیں ہیں، بلکہ بیشتر احکام ایسے ہیں جن پر عمل کے لیے ہمیں کسی حکومتی مشینری یا اتھارٹی کی ضرورت نہیں ہے۔ ہم اپنے وجود پر، اپنے خاندان پر اور اپنے ماحول پر آزادی کے ساتھ ان احکام و قوانین کا اطلاق کر سکتے ہیں۔ ایسے قوانین کا نفاذ تو ہمیں بہرحال کرنا چاہیے اور قرآن و سنت کے جن احکام پر بھی ہم عمل کر سکتے ہیں، ان پر عمل کرنا چاہیے۔ اس حوالے سے میرے علم میں یہ بات آئی ہے کہ ریاست ہائے متحدہ امریکہ کے آئین میں یہ گنجائش موجود ہے کہ آپ حضرات پرسنل لا اور بزنس لا میں اپنی مرضی کے قوانین پر عمل کر سکتے ہیں، اس مقصد کے لیے اپنی عدالتیں بنا سکتے ہیں اور ایک بورڈ آف آربٹریشن سپریم کورٹ سے منظور کرا کے یہ آئینی تحفظ بھی حاصل کر سکتے ہیں کہ مسلمانوں کے فیصلے پرسنل لا اور بزنس لا میں ان کی تسلیم کردہ عدالتوں میں ان کی مرضی کے قوانین کے تحت کیے جائیں اور ان فیصلوں کو آئینی طور پر حتمی حیثیت حاصل ہو۔

مجھے بتایا گیا ہے کہ یہودیوں نے یہاں یہ تحفظات اور سہولتیں حاصل کر رکھی ہیں اور ان کی اپنی عدالتیں ان کے مقدمات کے فیصلے کر رہی ہیں۔ اگر یہ درست ہے تو پھر آپ حضرات کو اس سہولت سے محروم نہیں رہنا چاہیے۔ اگر ایک معاملہ میں ہمیں شریعت کے قوانین پر عمل کرنے کا حق اور اختیار ملتا ہے اور ہم اسے استعمال نہیں کرتے تو اس میں حکومت کا کوئی قصور نہیں بلکہ ایسے معاملات میں شریعت پر عمل نہ کرنے میں ہم مجرم ہوں گے۔ اس لیے آپ حضرات سے میری درخواست ہے کہ اس پہلو پر ضرور سوچیں اور اگر اسے اجتماعی طور پر عملی شکل دی جا سکتی ہو تو اس میں سستی اور کوتاہی سے کام نہ لیں۔ پھر اسی میں ایک پہلو یہ بھی ہے کہ وہ عناصر جو امریکی معاشرہ سے مرعوب ہو کر نفاذ اسلام میں رکاوٹیں ڈال رہے ہیں، ان کے سامنے جب یہ صورت آئے گی کہ خود امریکی معاشرے میں مسلمان بہت سے معاملات میں اسلامی احکام و قوانین پر عمل کر رہے ہیں اور کچھ شعبوں میں یہاں اسلام عملاً نافذ ہے تو شاید انہیں بھی کچھ عقل آ جائے اور وہ امریکی معاشرہ کی تقلید کے شوق میں ہی

اسلامی احکام و قوانین کے نفاذ کی طرف پیش رفت پر آمادہ ہو جائیں۔

بہرحال میں نے مسلم ممالک میں نفاذ شریعت کی تحریکات کے ساتھ مغربی ممالک میں رہنے والے مسلمانوں کی عملی وابستگی کی تین صورتیں عرض کی ہیں:

۱. آپ حضرات ان تحریکات کی زیادہ سے زیادہ مالی امداد کریں۔

۲. مغربی ممالک میں اسلام کے خلاف کام کرنے والی منظم لابیوں کے منظم مقابلہ کا اہتمام کریں۔

۳. اس معاشرہ میں آپ کو جن شرعی قوانین پر عمل کرنے کا حق حاصل ہے، ان کے نفاذ اور عمل درآمد کی کوئی عملی صورت ضرور نکالیں۔

اللہ رب العزت مجھے اور آپ سب کو شریعت اسلامیہ کی بالادستی اور نفاذ کی جدوجہد میں زیادہ سے زیادہ محنت کرنے کی توفیق دیں اور عالم اسلام کو شریعت کے نفاذ کی منزل سے جلد ہم کنار فرمائیں، آمین۔

انسانی حقوق کا چارٹر اور مسلمانوں کے تحفظات

دو ہفتے قبل جب میں لندن پہنچا تو مولانا مفتی عبد المنتقم سلہٹی سے بنگلہ دیش میں دینی حلقوں کی اس احتجاجی مہم کے بارے میں معلومات حاصل ہوئیں جو عبوری حکومت کی طرف سے منظور کیے جانے والے ایک مسودہ قانون کے خلاف جاری ہے اور ایمرجنسی کے باوجود ہزاروں لوگ علماء کرام کی قیادت میں احتجاجی مظاہرے کر رہے ہیں۔ یہ مسودہ قانون عبوری حکومت نے ملک میں نفاذ کے لیے منظور کیا ہے، لیکن ابھی نافذ نہیں ہوا اور اس میں وراثت کے قانون میں ترمیم کر کے باپ کی وراثت میں لڑکی اور لڑکے کو برابر حصہ کا حق دار قرار دیا گیا ہے جب کہ دینی جماعتیں اور ان کے ساتھ عوام کی ایک بڑی تعداد اسے قرآن کریم کے صریح حکم کے منافی قرار دیتے ہوئے اس کے خلاف احتجاج کر رہی ہے۔ لندن میں بھی بنگلہ دیش کی مختلف جماعتوں نے "بنگلہ دیشی مسلمز" کے عنوان سے ایک مشترکہ فورم قائم کر لیا ہے اور احتجاجی مہم کو منظم کر رہے ہیں۔

مولانا مفتی عبد المنتقم کا تعلق سلہٹ سے ہے اور وہ دارالعلوم کورنگی کراچی کے فضلاء میں سے ہیں۔ مدرسہ نصرۃ العلوم گوجرانوالہ میں بھی پڑھتے رہے ہیں، ابراہیم کمیونٹی کالج وائٹ چیپل لندن کے شعبہ افتاء میں خدمات سرانجام دے رہے ہیں اور ہمارے ساتھ ورلڈ اسلامک فورم کے سیکرٹری اطلاعات کی حیثیت سے سرگرم عمل ہیں۔ ان کی خواہش تھی کہ بنگلہ دیش سے تعلق رکھنے والے سرکردہ علماء کرام کے ساتھ میری ایک نشست ہو جائے اور اس احتجاجی مہم کے حوالے سے ہم باہمی مشاورت کے ساتھ کوئی طریق کار تجویز کر لیں، چنانچہ ۱۳ مئی کو ایسٹ لندن کی مرکزی جامع مسجد میں جو وائٹ چیپل میں ہے اور لندن میں بنگلہ دیشی مسلمانوں کا سب سے بڑا مرکز ہے، عصر کے بعد "بنگلہ دیشی مسلمز" کے راہنماؤں کے ساتھ ایک تفصیلی نشست ہوئی جس میں ہمارے ساتھ ورلڈ اسلامک فورم کے نائب صدر مولانا سلمان ندوی بھی شریک ہوئے جو دار الارشاد میرپور ڈھاکہ کے پرنسپل ہیں۔

سرکردہ علماء کرام اور دینی راہنماؤں کے ساتھ اس مشاورتی نشست میں راقم الحروف نے جو گزارشات پیش کیں، ان کا خلاصہ درج ذیل ہے:

وراثت میں مرد اور عورت کے حصے کو مساوی قرار دینے کے جس مسودہ قانون کے خلاف آپ حضرات بنگلہ دیش میں احتجاج کر رہے ہیں، یہ ایک جزوی مسئلہ ہے اور اس عالمگیر عمومی مہم کا حصہ ہے جو اقوام متحدہ کے انسانی حقوق کے چارٹر کے تحت دنیا بھر میں مردوں اور عورتوں کے درمیان ہر معاملہ میں مساوات قائم کرنے اور عورتوں کے بارے میں امتیازی قوانین کو ہر ملک میں ختم کرانے کے لیے جاری ہے اور چونکہ قرآن کریم اور جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت مبارکہ میں مردوں اور عورتوں کے درمیان بہت سے معاملات میں احکام و قوانین کے حوالہ سے امتیاز موجود ہے اور ان امتیازی قوانین کو مردوں اور عورتوں کے درمیان مساوات کے منافی قرار دے کر انسانی حقوق کی خلاف ورزی سے تعبیر کیا جا رہا ہے، اس لیے یہ صرف بنگلہ دیش کا مسئلہ نہیں بلکہ پورے عالم اسلام کا مسئلہ ہے اور دوسرے بہت سے مسلم ممالک کی طرح ہمیں پاکستان میں بھی ایک عرصہ سے اسی صورت حال کا سامنا ہے کہ مردوں اور عورتوں کے بارے میں قرآن و سنت کے امتیازی احکام و ضوابط کو انسانی حقوق کے منافی قرار دے کر انہیں تبدیل کرنے پر زور دیا جا رہا ہے، بلکہ ہمارے بہت سے دانش ور قرآن و سنت کے اس نوعیت کے احکام و قوانین کی نت نئی تعبیرات سامنے لا کر انہیں مردوں اور عورتوں میں مساوات کے مغربی فکر و فلسفہ اور انسانی حقوق کے چارٹر کے مطابق ڈھالنے کی کوششوں میں بھی مصروف ہیں۔

جہاں تک اس بات کا تعلق ہے کہ قرآن و سنت میں مردوں اور عورتوں کے بارے میں الگ الگ احکام و قوانین موجود ہیں تو نہ صرف ایسا ہے، بلکہ ہم ان پر پورے شرح صدر کے ساتھ ایمان رکھتے ہیں اور قرآن و سنت کے صریح احکام میں کسی ردوبدل کو قبول کرنے کے لیے نہ ہم تیار ہیں اور نہ ہی اس کی کوئی ضرورت محسوس کرتے ہیں۔ چند روز قبل مجھ سے ایک صاحب نے سوال کیا کہ مردوں اور عورتوں کے درمیان امتیازی قوانین و احکام کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟ میں نے دریافت کیا کہ کیا مرد اور عورت کے درمیان مختلف حوالوں سے امتیاز موجود ہے یا نہیں؟ فرمانے لگے وہ تو موجود ہے۔ میں نے عرض کیا کہ جب امتیاز موجود ہے تو امتیازی قوانین کی ضرورت سے آپ کیسے انکار

کر سکتے ہیں؟ اسلام دین فطرت ہے اور اس نے مرد و عورت کے درمیان موجود فطری امتیاز کا لحاظ رکھتے ہوئے اس کے مطابق دونوں کے لیے ضرورت کے مقامات پر الگ الگ احکام دیے ہیں جو انسانی فطرت کے عین مطابق ہیں، مگر اس سے ہٹ کر میں آپ حضرات کو اس ساری مہم کے پس منظر کی طرف متوجہ کرنا چاہتا ہوں کہ اس کشمکش کا اصل سرچشمہ کہاں ہے؟ کیونکہ اسے سامنے رکھے بغیر نہ آپ حضرات کا کوئی احتجاج مؤثر ہو سکتا ہے اور نہ ہی اس سلسلے میں ہم اپنے موقف کو صحیح طور پر دنیا کے سامنے لا سکتے ہیں۔

جو بین الاقوامی حلقے مسلم ممالک میں عورتوں کے بارے میں امتیازی قوانین کو ختم کرنے پر زور دے رہے ہیں اور اس کے لیے مسلسل دباؤ بڑھاتے چلے جا رہے ہیں، ان کا کہنا ہے کہ اقوام متحدہ کے انسانی حقوق کے جس چارٹر میں مردوں اور عورتوں کے درمیان مساوات قائم کرنے اور امتیازی قوانین ختم کرنے کو تمام اقوام و ممالک کی ذمہ داری قرار دیا گیا ہے، اس پر تمام ممالک نے اتفاق کا اعلان کر رکھا ہے اور تمام حکومتوں نے دستخط کیے ہوئے ہیں، اس لیے اس بین الاقوامی معاہدے پر دستخط کرنے والے تمام ممالک کی ذمہ داری ہے کہ وہ اس کی پاسداری کریں اور اپنے قوانین کو اس کے مطابق بنائیں۔

میں اس چارٹر کی دو شقوں کا تذکرہ کرنا چاہوں گا۔ ایک یہ کہ چارٹر کی تمہید میں کہا گیا ہے کہ:

> ”تمام رکن اقوام نے اقوام متحدہ کے چارٹر میں بنیادی انسانی حقوق، انسانی شخصیت کی حرمت و وقار اور مردوں اور عورتوں کے مساوی حقوق کے بارے میں اپنے عقیدہ کی دوبارہ تصدیق کر دی ہے۔“

جبکہ اسی تمہید کے آخر میں کہا گیا ہے کہ:

> ”انسانی حقوق کا یہ عالمی منشور تمام اقوام کے واسطے حصول مقصد کا مشترک معیار ہو گا تاکہ ہر فرد اور معاشرے کا ہر ادارہ اس منشور کو ہمیشہ پیش نظر رکھتے ہوئے تعلیم و تبلیغ کے ذریعے ان حقوق اور آزادی کا احترام پیدا کرے اور انہیں قومی اور بین الاقوامی کارروائیوں کے ذریعہ رکن ملکوں اور ان قوموں میں جو رکن ملکوں کے تحت ہوں، منوانے کی بتدریج کوشش کر سکے“۔

اس طرح انسانی حقوق کے اس چارٹر کے مطابق مردوں اور عورتوں کے درمیان مساوات اقوام عالم کے لیے عقیدہ کا درجہ رکھتی ہے، یہ چارٹر ہی تمام اقوام و ممالک کے لیے حصول مقصد کا مشترکہ معیار ہے اور قومی اور بین الاقوامی کارروائیوں کے ذریعہ اسے تمام اقوام و ممالک سے منظور کرانا ضروری ہے۔

اقوام متحدہ کا یہ چارٹر جنرل اسمبلی نے ۱۰ دسمبر ۱۹۴۸ء کو منظور کیا تھا اور اس کے بعد سے یہ ایک بین الاقوامی میثاق اور معاہدہ کے طور پر نافذ العمل ہے، جبکہ ۱۸ اکتوبر ۱۹۷۹ء کو اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی نے ''عورتوں کے خلاف ہر قسم کے امتیازی قوانین کے خاتمے کا معاہدہ'' کے عنوان سے ایک اور بین الاقوامی میثاق کی منظوری دی جو تیس دفعات پر مشتمل ہے اور اقوام متحدہ کے مطابق تمام رکن ممالک پر اس کی پابندی لازم ہے۔ اس کی دفعہ نمبر ا میں عورتوں کے خلاف امتیازی قوانین کی وضاحت یوں کی گئی ہے کہ:

> ''جنس کی بنیاد پر کوئی ایسا سلوک، امتناع، پابندی یا تفریق روا نہیں رکھی جا سکتی جو مردوں کے ساتھ برابری کی بنا پر اور ازدواجی حیثیت سے قطع نظر عورتوں کو حاصل ایسے انسانی حقوق اور بنیادی آزادیوں کے حصول اور ان سے استفادہ کرنے پر اثرانداز ہوں یا سیاسی، اقتصادی، سماجی، ثقافتی، شہری یا کسی بھی شعبہ حیات میں عورتوں کے استحقاق کی نفی کرے یا ان کی بجاآوری میں رکاوٹ کا باعث بنے''۔

جبکہ اسی دفعہ میں تمام رکن ممالک کی حکومتوں کو اس کا پابند بنایا گیا ہے کہ وہ مردوں اور عورتوں کے درمیان مساوات کے اس اصول کو اپنے دستور و قانون کا حصہ بنائیں اور اگر کوئی قانون، ضابطہ، رسم و رواج یا روایت اس کے خلاف ان کے ملک میں موجود ہے تو اسے ختم کرنے کے لیے قانون سازی کریں۔

یہ دو بین الاقوامی معاہدے ہیں جن کی پاسداری اور ان پر عمل درآمد کا بین الاقوامی حلقوں کی طرف سے مسلمان حکومتوں سے مطالبہ کیا جا رہا ہے اور جو مسلمان حکومتیں اس بین الاقوامی مطالبے اور دباؤ کا سامنا کرنے کی ہمت نہیں رکھتیں، وہ جب موقع ملتا ہے ان معاہدوں پر عملدرآمد کے لیے اسلامی احکامات میں ترامیم کی طرف کوئی نہ کوئی پیش رفت کر ڈالتی ہیں۔

آپ حضرات اہل علم ہیں، اس لیے اگرچہ آپ سے الگ طور پر عرض کرنے کی ضرورت نہیں ہے لیکن میں اس اصولی گزارش کو اس گفتگو کا حصہ بنانا چاہتا ہوں، اس لیے یہ عرض کر رہا ہوں کہ اقوام متحدہ کے انسانی حقوق کے چارٹر اور عورتوں کے خلاف امتیازی قوانین کے خاتمہ کے معاہدہ کے ان دو بین الاقوامی میثاقوں میں جو کچھ کہا گیا ہے اور جن باتوں پر اتفاق کیا گیا ہے، ضروری نہیں کہ ہم ان سب باتوں کو رد کر دیں اور نہ ہی یہ ضروری ہے، اس لیے جو باتیں قرآن و سنت کے صریح احکام سے متصادم نہیں ہیں اور اجتہادی اصولوں کے مطابق ہمارے لیے ان کو قبول کرنے کی گنجائش موجود ہے، انہیں قبول کرنے میں کوئی اعتراض نہیں ہے، لیکن دو باتیں ہم کسی صورت میں قبول نہیں کر سکتے۔ وہ یہ کہ:

۱. مرد اور عورت کی جسمانی ساخت، ذہنی و عملی صلاحیتوں اور قوت کار میں جو تنوع اور فرق فطری پر موجود ہے، اسے ختم کر کے مساوات کا مصنوعی ماحول پیدا کرنے کی کوشش کی جائے۔
۲. قرآن و سنت کے جن صریح احکام و قوانین میں مردوں اور عورتوں کے حوالہ سے فرق اور امتیاز موجود ہے، انہیں کسی بھی طرح ترامیم اور تغیرات کا ہدف بنایا جائے۔

ان دو باتوں کے علاوہ ہم ہر وہ چیز قبول کرنے کے لیے تیار ہیں جن پر اقوامِ عالم اتفاق کرتی ہیں، اس لیے میں بنگلہ دیش کے علماء کرام اور دینی حلقوں کی اس جدوجہد میں پاکستان کے دینی حلقوں بالخصوص پاکستان شریعت کونسل کی طرف سے مکمل یک جہتی اور ہم آہنگی کا اظہار کرتے ہوئے یہ گزارش کرنا ضروری سمجھتا ہوں کہ بنگلہ دیش کی عبوری حکومت کی طرف سے وراثت میں مرد اور عورت کے حصوں کو برابر قرار دینے کے اس مسودہ قانون کے خلاف ضرور احتجاج کیجیے اور اسے رکوانے کی ہر ممکن کوشش کیجیے، اس میں ہم آپ کے ساتھ ہیں، لیکن اس جنگ کا اصل مورچہ یہ نہیں ہے۔ اس محاذ آرائی کا اصل میدان بین الاقوامی فورم ہے اور مسلمانوں کے دینی حلقوں کی ذمہ داری یہ ہے کہ وہ اقوام متحدہ کے انسانی حقوق کے چارٹر اور عورتوں کے خلاف امتیازی قوانین ختم کرکے معاہدہ کا تفصیلی جائزہ لے کر ان کے بارے میں اپنا دوٹوک موقف علمی بنیاد پر منطق و استدلال کے ساتھ واضح کریں اور بتائیں کہ قرآن و سنت کے مسلمات کی رو سے کون سی بات قابل قبول ہے اور کس بات کو قبول نہیں کیا

جاسکتا۔

پھر اس کے بعد مغربی ممالک بالخصوص لندن میں موجود مسلم اداروں اور حلقوں کی ذمہ داری ہے کہ وہ اس موقف کو بین الاقوامی حلقوں تک پہنچائیں، انہیں ان دونوں معاہدات کے بارے میں مسلمانوں کے تحفظات سے آگاہ کریں اور اس کے ساتھ ساتھ مسلمان حکومتوں اور اسلامی سربراہ کانفرنس کی تنظیم (او آئی سی) کو اس بات پر آمادہ کرنے کی کوشش کریں کہ وہ اقوام متحدہ کے فورم پر اس مسئلہ کو مضبوطی کے ساتھ اٹھائیں اور ان معاہدات پر نظر ثانی کے لیے عالمی سطح پر دباؤ کو منظم کریں۔ صرف مسلمان حکومتوں کے خلاف احتجاج کرتے رہنا کافی نہیں ہوگا، ہمیں ان مجبوریوں کو بھی سمجھنا ہوگا اور ان کے خلاف بین الاقوامی دباؤ کی نوعیت اور مراکز سے آگاہی حاصل کرتے ہوئے اس سطح پر بھی بریفنگ، لابنگ اور دباؤ کو منظم کرنا ہوگا اور میرے خیال میں لندن میں موجود مسلمانوں کے علمی و دینی ادارے اس سلسلہ میں سب سے زیادہ مؤثر کردار ادا کر سکتے ہیں۔

(روزنامہ پاکستان، ۳۱ مئی ۲۰۰۸ء)

مغربی معاشرے میں دعوت ومکالمہ کے امکانات

۲۸ ستمبر ۲۰۰۲ء کو لندن میں عراق پر مجوزہ امریکی حملے کے خلاف عوامی مظاہرہ تھا۔ گزشتہ سال انہی دنوں میں افغانستان پر امریکی حملے کے خلاف بھی لندن میں ایک بڑا مظاہرہ ہوا تھا جس میں شرکت کا مجھے بھی موقع ملا۔ مغربی ممالک میں ایسے لوگوں کی کمی نہیں ہے جو عراق، فلسطین، کشمیر اور افغانستان کے حوالے سے امریکا اور برطانیہ کی قیادت میں قائم عالمی اتحاد کے عزائم کو ان کے اصل پس منظر میں سمجھتے ہیں اور اسے سراسر ظلم قرار دیتے ہوئے اس کے خلاف آواز بھی بلند کرتے رہتے ہیں، چنانچہ برطانیہ میں عوامی سطح پر تین باتوں پر غصے کا سرعام اظہار ہو رہا ہے۔ ایک تو اسرائیل کی دہشت گردی اور امریکا کی طرف سے اس کی مسلسل پشت پناہی کا منظر یہاں کے عوام کے ذہنوں میں دن بدن اجاگر ہوتا جا رہا ہے۔ دوسرا وہ یہ سمجھنے لگے ہیں کہ یہ جنگ صرف اور صرف تیل کے چشموں پر قبضہ جمانے کے لیے ہے اور تیسرے نمبر پر افغان، کشمیری، عراقی اور فلسطینی عوام کی مظلومیت کا احساس بھی عالمی میڈیا کے یک طرفہ پروپیگنڈے کے باوجود اضافہ پذیر ہے۔

گزشتہ سال اس حوالے سے لندن اور گلاسگو میں ہونے والے عوامی مظاہرہ میں شریک ہو کر میری اس رائے کو تقویت حاصل ہوئی کہ حالیہ عالمی کشمکش میں ہمیں مغربی ممالک واقوام کو اقوام و ممالک کی حیثیت سے اپنا حریف نہیں سمجھنا چاہیے بلکہ جس طرح مسلم ممالک میں حکومتوں کے اہداف عوام کے اہداف و مقاصد سے مختلف ہیں، اسی طرح مغربی ممالک میں بھی حکومتوں اور بالادست قوتوں کے اہداف و عزائم کا عوام کے اہداف و مقاصد سے ہم آہنگ ہونا ضروری نہیں ہے۔ اگر ان دونوں میں فرق کو محسوس کرتے ہوئے ہمارے ارباب فکر و دانش مغرب کی رائے عامہ سے اس کی نفسیات اور ذہنی سطح کے مطابق براہ راست مخاطب ہو کر اس کے سامنے اپنا مقدمہ صحیح طور پر پیش کر سکیں تو میڈیا، رائے عامہ، بریفنگ اور لابنگ کے مغربی ہتھیاروں کو بھی مغرب کی بالادست قوتوں کے اسلام دشمن عزائم کے خلاف استعمال کیا جا سکتا ہے۔

”ورلڈ اسلامک فورم“ گزشتہ دس سال سے ارباب علم و دانش کو اسی طرف متوجہ کرنے کی کوشش

کر رہا ہے، لیکن بدقسمتی سے ایک محدود حلقہ کے سوا ہم اس ضرورت کا احساس زیادہ وسیع پیمانے پر عام کرنے میں کامیاب نہیں ہو پا رہے، حالانکہ نہ صرف مسلمانوں کی مشکلات اور عالم اسلام کے مسائل کے حوالے سے بلکہ اسلام کی دعوت اور اسلامی تعلیمات کے فروغ کے سلسلے میں بھی یہ صورت حال واضح ہے، مگر کام کا ایک وسیع میدان سامنے موجود ہونے کے باوجود مسلم ادارے اور تنظیمیں اس کے ناگزیر تقاضوں کو پورا کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کر رہیں یا ان کو پورا کرنے میں کامیاب نہیں ہو رہی ہیں۔

چند سال قبل برطانیہ کے ایک معروف ادارہ اسلامک فاؤنڈیشن لیسٹر میں، جو جماعت اسلامی پاکستان کے نائب امیر محترم پروفیسر خورشید احمد کی سربراہی میں کام کر رہا ہے، ایک تقریب سے خطاب کرتے ہوئے برطانوی پارلیمنٹ کے رکن جم مارشل نے کہا تھا کہ ہمارے سامنے اسلام کی مختلف تصویریں ہیں جو ایک دوسرے سے قطعی مختلف ہیں۔ اسلام کا جو نقشہ ہمارے بڑوں نے ہمیں بتا رکھا ہے، وہ اور ہے جبکہ جو اسلام ہم کتابوں میں پڑھتے ہیں، وہ اس سے قطعی مختلف ہے اور جس اسلام کا مشاہدہ ہم اپنے ارد گرد رہنے والے مسلمانوں کی عملی زندگی میں کر رہے ہیں، وہ ان دونوں سے الگ ہے۔ جم مارشل کا کہنا تھا کہ یہ "کمیونیکیشن گیپ" ہے جسے دور کر دیا جائے تو یہاں کے لوگ اسلام کی بات سننے کے لیے تیار ہیں۔

یوسف اسلام یہاں کے معروف نومسلم ہیں جو اسلام قبول کرنے کے بعد لندن میں تعلیمی محاذ پر گراں قدر خدمات سرانجام دے رہے ہیں۔ انہوں نے ایک موقع پر مغربی ممالک میں اسلام کی دعوت و تبلیغ اور مسلمانوں کے مسائل کی ترجمانی کے لیے مسلم ممالک سے آنے والے علماء کرام اور دانش وروں کے بارے میں کہا کہ آپ لوگوں کا المیہ یہ ہے کہ جن کے پاس علم ہے، ان کے پاس زبان نہیں ہے اور جو یہاں کی زبان اور اسلوب کے مطابق بات کہنے کی اہلیت رکھتے ہیں، ان کے پاس مطلوبہ علم نہیں ہے۔ اس لیے آپ پہلے اس مسئلہ کا حل نکالیں، اس کے بعد آپ یہاں کے معاشرے کو اپنی بات صحیح طور پر پہنچا سکیں گے۔

چند سال قبل ورلڈ اسلامک فورم کے سیکرٹری جنرل مولانا رضاء الحق سیاکھوی کے ہمراہ مجھے نوٹنگھم کے ایک بڑے پادری صاحب سے ملاقات کا موقع ملا اور ان سے بہت سے مسائل پر گفتگو ہوئی

جن میں انسانی معاشرہ میں بڑھتی ہوئی دلی بے چینی، فکری انتشار اور اس کے ساتھ بے حیائی، بدکاری، حرام خوری اور خدائی احکامات سے بغاوت کے تیزی سے پھیلتے ہوئے رجحانات بھی ہیں۔ اس سلسلے میں ہم دونوں کی تشویش واضطراب کی نوعیت یکساں تھی لیکن جب میں نے ان سے دریافت کیا کہ اس صورت حال کا آپ کے پاس کیا حل ہے تو انہوں نے کسی تکلف اور ذہنی تحفظ کے بغیر بے ساختہ کہہ دیا کہ ہمارے پاس اس کا کوئی حل نہیں ہے اور ہم تو اس کے لیے آپ کی طرف دیکھ رہے ہیں۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ مغربی معاشرہ میں اسلام کی دعوت و تعلیم اور عالم اسلام کی مشکلات و مسائل، دونوں حوالوں سے بات کہنے اور باضمیر لوگوں کو توجہ دلانے کی گنجائش موجود ہے اور بات سننے والوں کی کمی نہیں ہے، البتہ اس کے لیے یہاں کی زبان، اسلوب، نفسیات اور عوامی مزاج کو سمجھنے اور اس کے مطابق بات کرنے کی ضرورت ہے جس کا ہمارے ہاں سرے سے فقدان ہے اور اسی وجہ سے مغربی ممالک میں دعوتی اور تعلیمی سرگرمیوں کے ہر طرف پھیلنے کے باوجود غیر مسلم معاشرہ میں اس کے خاطر خواہ اثرات نظر نہیں آرہے۔

(روزنامہ اسلام، ۱۳؍اکتوبر ۲۰۰۲ء)

دور جدید کے فکری تقاضے اور علماء کرام

لندن میں بنگلہ دیش سے تعلق رکھنے والے چند نوجوان علماء کرام نے ''موطا ٹرسٹ'' کے نام سے ایک سوسائٹی قائم کر رکھی ہے جو موجودہ عالمی حالات کے تناظر میں دینی و علمی خدمات سرانجام دینے کا جذبہ رکھتے ہیں اور دعوت و تعلیم کے حوالے سے ایک قابل عمل پروگرام کی تشکیل کی کوشش کر رہے ہیں۔ چند ماہ قبل ندوۃ العلماء لکھنو سے حضرت مولانا سید سلمان ندوی لندن تشریف لائے تو موطا ٹرسٹ کی فرمائش پر انہوں نے نوجوان علماء کرام کی ایک جماعت کو آج کے تقاضوں اور دینی دعوت و تعلیم سے تعلق رکھنے والے چند اہم عنوانات پر مسلسل پانچ روز تک لیکچر دیے۔ میری لندن حاضری کے موقع پر انہوں نے ورلڈ اسلامک فورم کے چیئرمین مولانا محمد عیسیٰ منصوری کی وساطت سے مجھ سے بھی فرمائش کی کہ اس سلسلے میں کچھ گزارشات ان کی خدمت میں پیش کروں، چنانچہ ۲۳ اکتوبر سے ۲۶ اکتوبر تک مسلسل چار روز عشاء کے بعد مجھے ان سے گفتگو کا موقع ملا۔ گفتگو میں شریک بعض دوستوں کی خواہش تھی کہ ان معروضات کو قلم بند کر کے تحریری صورت میں سامنے لایا جائے۔ میں نے ان سے گزارش کی کہ یہ ابتدائی موقع تھا، اس لیے گفتگو اس انداز سے مرتب طور پر نہیں کی گئی کہ اسے مقالہ کی صورت میں تحریر کیا جا سکے۔ پھر کبھی موقع ملا تو ان شاء اللہ تعالیٰ اس ضرورت کو ملحوظ رکھا جائے گا۔ البتہ اس دوران پیش کی جانے والی چند اہم گزارشات کا خلاصہ قارئین کے سامنے رکھا جا رہا ہے:

آج کے دور میں دینی کام کے لیے سب سے پہلے آج کی دنیا کے مجموعی تناظر کو سمجھنے کی ضرورت ہے اور یہ دیکھنے کی ضرورت ہے کہ ہم کہاں کھڑے ہیں، اقوام عالم میں ہماری حیثیت کیا ہے اور ہمارے دائیں بائیں اور آگے پیچھے دنیا میں کیا ہو رہا ہے؟ اس لیے علماء کرام اور بالخصوص نوجوان علماء کرام کو چاہیے کہ وہ دنیا کے حالات سے باخبر رہیں، معاصر اقوام و مذاہب سے واقفیت حاصل کریں اور اس عالمی تہذیبی کشمکش کا شعور حاصل کریں جو اس وقت اسلام اور مغرب کے درمیان تیزی سے آگے بڑھ رہی ہے۔ اس کے بغیر کوئی نوجوان عالم دین دینی و علمی خدمات سرانجام دینا چاہتا ہے تو وہ اپنے

مخصوص اور محدود ماحول کے دائرے میں تھوڑا بہت کام ضرور کر لے گا لیکن اسلام کی دعوت اور ملت اسلامیہ کے مسائل و مشکلات کے حوالے سے کچھ نہیں کر پائے گا۔

اسلام اور مغرب کی کشمکش کے پس منظر میں اس بات کو سمجھنا بہت ضروری ہے کہ مغرب کا موقف کیا ہے اور اس موقف کا پس منظر کیا ہے؟ ہم مغرب کے موقف کو اصولی طور پر دو حوالوں سے زیادہ بہتر طور پر سمجھ سکتے ہیں:

ایک تو یہ تاریخی پس منظر ہمارے پیش نظر رہنا چاہیے کہ مغرب نے قرون وسطیٰ یا قرون مظلمہ میں مذہب کے جس کردار کا مشاہدہ کیا ہے بلکہ مذہب کے جس کردار کو بھگتا ہے، اس کو سامنے رکھتے ہوئے مغرب کی مذہب دشمنی کو سمجھنا کچھ زیادہ مشکل نہیں رہتا۔ مغرب نے صدیوں تک اس صورت حال میں وقت گزارا ہے کہ عام آبادی بادشاہت اور جاگیردارانہ نظام کے مظالم کی چکی میں پستی رہی ہے۔ عام آدمی اس دور میں غلام سے بدتر حیثیت اختیار کر چکا تھا اور انسانوں کے ساتھ جانوروں کا سا سلوک روا رکھا جاتا تھا۔ مذہب نے اس دوران عام آدمی کا ساتھ دینے کے بجائے بادشاہ اور جاگیردار کا ساتھ دیا اور اپنا پورا وزن مظلوم کے بجائے ظالم کے پلڑے میں ڈال دیا حتیٰ کہ بادشاہت اور جاگیرداری کے خلاف عوامی بغاوت کے موقع پر بھی مذہب کا پرچم تھامے ہوئے اس دور کے اہل مذہب نے غریب عوام کے بجائے بادشاہت اور جاگیرداری کی حمایت و تعاون کو ترجیح دی جس کے نتیجے میں شدید ردعمل کی طوفانی لہروں نے بادشاہت اور جاگیرداری کے ساتھ مذہب کا بیڑا بھی گہرے سمندر میں غرق کر دیا۔ اس لیے آج جب مغرب والوں کے سامنے مذہب کا نام آتا ہے تو ان کی نظروں کے سامنے قرون وسطیٰ کا منظر گھوم جاتا ہے اور ان کے لیے یہ تسلیم کرنا مشکل ہو جاتا ہے کہ مذہب اور اہل مذہب کا اس کے سوا بھی کوئی کردار ہو سکتا ہے لہٰذا ہمیں مغرب کے سامنے مذہب کی بات کرتے ہوئے مذہب سے اس کی شدید نفرت کے اس بڑے سبب کا لحاظ کرنا ہو گا اور دلیل، منطق اور کردار کے ساتھ واضح کرنا ہو گا کہ اسلام اور قرون وسطیٰ کی مسیحیت کے معاشرتی کردار میں کیا فرق ہے اور عام اہل مغرب کو باور کرانا ہو گا کہ اسلام بادشاہت کا نہیں بلکہ عوام کا ساتھی ہے اور جاگیردار کا نہیں بلکہ مظلوم کا حمایتی ہے۔

مذہب سے اہل مغرب کی شدید نفرت کا دوسرا سبب یہ ہے کہ مذہب نے سائنس اور ٹیکنالوجی

میں اہل مغرب کی پیش رفت اور ترقی کی حوصلہ افزائی کرنے اور اس کا ساتھ دینے کے بجائے اس کی مخالفت کی ہے۔ مذہب نے کائنات کے مطالعہ اور زمین وآسمان کے نظام کی سائنسی تعبیرات کو کفر و الحاد قرار دے کر سائنس دانوں پر فتوے عائد کیے ہیں اور مذہبی عدالتوں نے انہیں خوف ناک سزائیں دی ہیں۔ یہ ایک مستقل باب ہے جس کے مطالعہ کی ضرورت ہے اور اس سے بھی مذہب کے ساتھ اہل مغرب کی نفرت کی شدت اور نوعیت کو بخوبی سمجھا جا سکتا ہے۔

اس کے ساتھ آج کی عالمی کشمکش کے تناظر میں ایک اور بات کو سمجھنا بھی ضروری ہے کہ مغرب کا کہنا ہے کہ دوسری عالمی جنگ کے بعد اقوام متحدہ کے نام سے ایک بین الاقوامی ادارہ تشکیل پایا تھا اور اس نے ممالک اقوام کے نظام کو چلانے کے لیے انسانی حقوق کے چارٹر کے نام سے راہ نما اصول وضع کیے تھے جس پر دنیا بھر کے تمام ممالک کے نمائندوں نے دستخط کر کے اس چارٹر کو اپنی حکومتوں اور نظاموں کے لیے راہ نما اصول کے طور پر تسلیم کر رکھا ہے۔ اس چارٹر کی دفعات کی تشریح وتعبیر کا بھی ایک نظام ہے جس میں تمام ممالک شریک ہیں اور اقوام متحدہ کے مختلف ادارے بوقت ضرورت اس چارٹر کی دفعات کی تشریح وتعبیر کرتے ہیں۔ اس لیے جن ممالک نے اس چارٹر پر دستخط کر رکھے ہیں اور جو ممالک اقوام متحدہ کے نظام میں باقاعدہ شریک ہیں، انہیں اس معاہدہ کی پابندی کرنی چاہیے اور اپنی شرکت اور دستخطوں کی پاسداری کرتے ہوئے اپنے قانونی نظاموں اور حکومتی ڈھانچوں کو اقوام متحدہ کے منشور اور قراردادوں کے دائرے میں لانا چاہیے۔

ہم مسلمانوں کی اس سلسلے میں دو بڑی الجھنیں ہیں۔ ایک یہ کہ اقوام متحدہ کے منشور کو من وعن قبول کرنے کی صورت میں ہمیں قرآن وسنت کے بہت سے صریح احکام سے دست بردار ہونا پڑتا ہے اور خاندانی نظام یعنی نکاح وطلاق اور وراثت کے علاوہ حدود وتعزیرات کے باب میں بھی قرآن کریم اور سنت نبوی کے متعدّد صریح قوانین واحکام پر عمل کرنا ہمارے لیے ممکن نہیں رہتا۔ اور دوسری الجھن یہ ہے کہ اقوام متحدہ کے نظام پر مغرب کی اجارہ داری ہے اور خود اقوام متحدہ کے فیصلوں اور قراردادوں پر عمل درآمد میں بھی مغرب کی ترجیحات کا غلبہ رہتا ہے لیکن ان دو الجھنوں اور رکاوٹوں کے باوجود مغرب کے اس موقف کو اصولی طور پر نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کہ جن ممالک نے اقوام متحدہ کے چارٹر پر دستخط کر رکھے ہیں اور جن ممالک کے نمائندے اقوام متحدہ کے نظام میں شریک

ہیں، ان کو اقوام متحدہ کے منشور اور فیصلوں کی پابندی کرنی چاہیے۔

اس کے علاوہ آج کے نوجوان علماء کرام کے لیے اس بات کو سمجھنا بھی انتہائی ضروری ہے کہ اقوام متحدہ کے منشور اور اس کے مختلف اداروں کے فیصلوں اور قراردادوں کا اسلامی احکام و قوانین کے ساتھ کہاں کہاں ٹکراؤ ہے اور اقوام متحدہ یا دوسرے لفظوں میں آج کے بین الاقوامی قوانین کا کون سا حصہ اور کون سا قانون قرآن و سنت کے کون سے قانون اور ضابطے سے متصادم ہے؟ اس کا ادراک حاصل کیے بغیر ہم آج کی عالمی تہذیبی کشمکش اور مسلمانوں کے ساتھ اہل مغرب کی کشیدگی کو پوری طرح نہیں سمجھ سکتے۔

اس کشمکش سے ہٹ کر مثبت انداز میں اہل مغرب کے سامنے اسلام کی دعوت کو پیش کرنے اور مغربی ماحول میں اسلامی تعلیمات کے فروغ کے لیے بھی ہمیں اپنے روایتی طرز عمل پر نظر ثانی کرنا ہوگی۔ کسی بھی شخص، گروہ یا سوسائٹی کے سامنے اسلام کی دعوت رکھنے سے قبل یہ ضروری ہے کہ بات اس کی زبان میں ہو اور صرف زبان کافی نہیں بلکہ اسلوب اور انداز بھی اس سوسائٹی کے لیے متعارف ہو ورنہ صرف اچھی انگریزی بول کر اپنے روایتی مشرقی اسلوب میں اسلام کی دعوت و تعلیم کا فریضہ مغرب میں سرانجام دینے کا نتیجہ بھی مختلف نہیں ہوگا جبکہ زبان و اسلوب کے ساتھ تیسرے نمبر پر اس قوم اور سوسائٹی کی نفسیات اور ذہنی سطح کا ادراک حاصل کرنا بھی دعوت و تعلیم کا ناگزیر تقاضا ہے۔

میں عام طور پر اس سلسلے میں ایک روایت پیش کیا کرتا ہوں جو سیرت نبوی کی بیشتر کتابوں میں موجود ہے کہ جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ایک بار قریش کے چند سردار آئے اور پوچھا کہ آخر آپ چاہتے کیا ہیں؟ تو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ میں تمہارے سامنے ایک کلمہ پیش کر رہا ہوں جسے اگر تم قبول کر لو تو عرب پر تمہاری بادشاہت قائم ہو جائے گی اور عجم بھی تمہارے تابع ہوگا۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد گرامی ان سرداروں کی نفسیات کے پس منظر میں تھا کہ یہ سردار لوگ ہیں اور چودھراہٹ ہی کی زبان سمجھتے ہیں اس لیے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایمان اور کلمہ طیبہ کے بے شمار فوائد میں سے پہلے مرحلہ میں وہی فائدہ ان کے سامنے رکھا جو فوری طور پر ان کی سمجھ میں آ سکتا تھا۔ ہمیں اس سنت نبوی سے راہ نمائی حاصل کرنی چاہیے اور لوگوں کی ذہنی سطح اور نفسیات کو سمجھتے ہوئے اس کے مطابق ان کے سامنے اسلام کی دعوت و تعلیم کو رکھنا چاہیے۔

علماء کرام بالخصوص نوجوان علماء کو تاریخ کے مطالعہ کی طرف خصوصی توجہ دینی چاہیے۔ عالمی تاریخ، مختلف اقوام و ممالک کی تاریخ اور بالخصوص عالم اسلام کی تاریخ کے اہم مراحل سے ان کا واقف ہونا ضروری ہے۔ پھر ان تحریکات سے بھی انہیں باخبر ہونا چاہیے جو مختلف ادوار میں اہل حق اور علماء دین نے ملت کی آزادی اور دین کے تحفظ کے لیے بپا کی ہیں۔ جنوبی ایشیا میں ہمارے اکابر حضرت مجدد الف ثانی، حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی اور ان کے خانوادہ کی خدمات، علماء دیوبند کی جدوجہد اور برطانوی استعمار سے آزادی کی تحریکات سے آگاہی کے بغیر تو ہم اپنے مشن اور اہداف کو سمجھ ہی نہیں سکتے۔ ہمارے بزرگوں نے حالات اور موقع محل کی مناسبت سے جدوجہد کے مختلف طریقے اپنائے ہیں:

- حضرت مجدد الف ثانی نے اکبر بادشاہ کے ریاستی الحاد اور خود ساختہ دین الٰہی کے خلاف جدوجہد میں ارباب اختیار کی ذہن سازی، بریفنگ اور لابنگ کا طریقہ آزمایا ہے اور اس میں کامیابی حاصل کی ہے۔
- حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ نے دہلی کی طرف جنوبی ہندوستان کے جنونی مرہٹوں کی تیزی سے بڑھتی ہوئی یلغار کو روکنے کے لیے مقامی مزاحمتی قوتوں کو کمزور سمجھتے ہوئے افغانستان کے فرماں روا احمد شاہ ابدالیؒ سے مدد مانگی اور اسے حملہ کی دعوت دی۔ ان کی یہ تکنیک بھی کامیاب رہی۔
- برطانوی استعمار کے خلاف شہدائے بالاکوٹ اور ۱۸۵۷ء کے حریت پسند علماء اور ان سے قبل سراج الدولہؒ اور ٹیپو سلطانؒ نے عسکری مزاحمت کا راستہ اختیار کیا جس میں اگرچہ وقتی طور پر ناکامی ہوئی لیکن اس سے مستقبل میں حریت پسندوں کو راہ نمائی اور حوصلہ ملا اور انہی کا مقدس خون تحریک آزادی کے لیے سنگ میل ثابت ہوا۔
- شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن دیوبندیؒ نے آزادی کی جدوجہد کے لیے عالمی سطح پر انگریز مخالف قوتوں سے رابطے قائم کیے اور جرمنی، جاپان اور خلافت عثمانیہ کے ساتھ گٹھ جوڑ کر کے تحریک آزادی کو ایک نیا رنگ دینے کی کوشش کی مگر خلافت عثمانیہ کے خلاف شریف مکہ کی بغاوت کی وجہ سے یہ تحریک ناکام ہوگئی البتہ حریت پسندوں کو جدوجہد کا ایک نیا راستہ

اور اسلوب ملا۔

- کانگریس، جمعیۃ علماء ہند، مجلس احرار اسلام اور مسلم لیگ کے پلیٹ فارم پر مسلمانوں نے آزادی کے لیے دستوری اور سیاسی جدوجہد کا طریق کار اختیار کیا۔ ان میں جمعیۃ علماء ہند اور مجلس احرار اسلام دینی جماعتیں تھیں۔ جمعیۃ علماء ہند کی قیادت مسلکی حوالے سے خالص دیوبندی قیادت تھی جبکہ مجلس احرار اسلام میں دیوبندی، بریلوی، اہل حدیث اور شیعہ مکاتب فکر کے سرکردہ علماء کرام پر مشتمل قیادت نے ٹیم ورک کی صورت میں مشترکہ دینی قیادت کا عملی نمونہ پیش کیا۔

یہ سب اہداف نہیں بلکہ طریقہ ہائے کار تھے۔ ان میں سے کوئی بھی حتمی اور قطعی نہیں تھا بلکہ یہ بات حالات پر منحصر تھی کہ کس وقت کون سا طریق کار دینی جدوجہد کو آگے بڑھانے میں مفید ثابت ہو سکتا ہے۔

نوجوان علماء کو اس بات سے بھی باخبر ہونا چاہیے کہ جب یونان، ایران اور ہندوستان کے فلسفوں نے مسلمانوں کے عقائد و اعمال میں دراندازی شروع کی، ان کے اثرات ہمارے ہاں پھیلنے لگے اور ان فلسفوں نے ہمارے عقائد کو متاثر کرنا چاہا تو اس وقت کے باشعور علماء اسلام نے ان فلسفوں سے آگاہی حاصل کی، ان پر عبور حاصل کیا اور ان فلسفوں کی زبان اور اصطلاحات استعمال کر کے انہی کے دلائل سے اسلام کی حقانیت کو دنیا کے سامنے پیش کیا جبکہ آج دنیا پر مغرب کے سیکولر فلسفے کی حکمرانی ہے جس کی بنیاد مذہب سے لاتعلقی پر ہے، جس کی زبان انسانی حقوق کی زبان ہے اور جس کی نفسیات میں آزادی اور اباحت مطلقہ رچ بس گئی ہے۔ آج کی اصطلاحات الگ ہیں، اسلوب مختلف ہے اور دلیل و منطق کے ہتھیار جداگانہ ہیں۔ ہمیں اس فلسفہ سے، اس کی اصطلاحات سے، اس کے اسلوب سے اور اس کے دلائل سے اسی طرح مکمل واقفیت حاصل کرنا ہوگی جس طرح امام ابوالحسن اشعریؒ، امام ابو منصور ماتریدیؒ، امام ابن تیمیہؒ، امام غزالیؒ، امام ابن رشدؒ اور دوسرے اہل علم نے یونانی، ایرانی اور ہندی فلسفوں پر عبور حاصل کر کے انہی کی زبان اور دلائل سے ان کا رد کیا تھا۔

یہ آج کے دور کی چند اہم ضروریات اور چند ناگزیر تقاضے ہیں جن کی طرف مناسب توجہ نہ دینے کا ہمیں نقصان ہو رہا ہے اور ہم علمی، فکری اور تہذیبی محاذ پر کھلا میدان سامنے ہونے کے باوجود پیش

رفت نہیں کر پا رہے۔ ان کی طرف دینی مدارس کو توجہ دینی چاہیے، دینی مدارس کا نصاب و نظام تشکیل دینے والوں کو متوجہ ہونا چاہیے۔ یہ اصل ذمہ داری ان کی ہے لیکن اگر ان سے ہٹ کر بھی کچھ علمی ادارے اور فکری سوسائٹیاں ان ضروریات کو محسوس کرتے ہوئے انہیں پورا کرنے کی کوشش شروع کر دیں تو کچھ نہ کچھ پیش رفت ضرور ہوگی اور شاید انہی کی کوششوں سے جمود کی اس دیوار میں کوئی روشن دان نمودار ہو جائے۔

(الشریعہ، نومبر ۲۰۰۲ء)

اصلاح معاشرہ اور مسلمانوں کی ذمہ داری

ایک عرصہ سے دل میں یہ خواہش پرورش پاتی چلی آ رہی ہے کہ مغرب آسمانی تعلیمات اور مذہبی احکامات واقدار سے بغاوت کے جو تلخ نتائج بھگت رہا ہے اور اب ان میں ہم مشرق والوں کو بھی شریک کرنے کے درپے ہے، ان کے بارے میں سنجیدہ مسیحی مذہبی راہنماؤں سے گفتگو کی جائے اور اگر مذہب گریز رجحانات کو روکنے کے لیے کسی درجے میں مشترکہ کوششوں کی کوئی راہ نکل سکتی ہو تو اس کے لیے پیش رفت کی جائے۔ پاکستان کے مسیحی راہ نماؤں میں آنجہانی جسٹس اے آر کارنیلیس اور آنجہانی جوشوا فضل دین کے بعد کوئی ایسا مسیحی راہ نما نظر نہیں آیا جس کے ساتھ اس موضوع پر سنجیدگی سے بات کی جا سکے، کیونکہ پاکستانی مسیحیوں کی روایتی لیڈر شپ ایک عرصہ سے اپنی کمیونٹی کے مذہبی رجحانات اور مذہبی تعلیمات کے بجائے مغرب کی سیکولر لابیوں کی نمائندگی کو ترجیح دیے ہوئے ہے اور بیشتر مسیحی راہنماؤں کی سرگرمیاں آسمانی تعلیمات واحکام کی پیش رفت میں رکاوٹ ڈالنے اور مذہب سے گریز اور فرار کی حوصلہ افزائی کے لیے وقف ہو کر رہ گئی ہیں، اس لیے بیرون ملک مسیحیت کے سنجیدہ مذہبی راہنماؤں کی تلاش میں رہا۔

غالباً ۱۹۹۰ء کی بات ہے کہ امریکہ کی ریاست جارجیا کے شہر اگستا میں عیسائیوں کے بپٹسٹ فرقہ کے ایک مذہبی پیشوا سے ملاقات ہوئی تھی جن کا نام اس وقت میرے ذہن میں نہیں ہے، البتہ ملاقات کا نقشہ اور گفتگو کی بہت سے تفصیلات یاد ہیں۔ اگستا میں میرے بچپن کے ایک دوست اور کلاس فیلو افتخار رانا قیام پذیر ہیں۔ ان سے میں نے گزارش کی کہ مسیحی مذہبی راہ نما سے ملنا چاہتا ہوں۔ انہوں نے بپٹسٹ فرقہ کے چرچ سے رابطہ قائم کیا اور اس کے سربراہ سے ملاقات کے لیے وقت لے لیا۔ اس ملاقات میں ترجمانی کے فرائض بھی افتخار رانا نے سرانجام دیے، کیونکہ میں انگریزی زبان سے نابلد ہوں۔ اس موقع پر مغربی معاشرہ کی مذہب سے دوری، معاشرہ پر اس کے منفی اثرات، شراب اور زنا کی کثرت، بے پردگی اور خاندانی زندگی کی شکست وریخت سمیت بہت سے امور پر گفتگو ہوئی اور سیکولر سوچ اور فلسفہ کے خلاف مشترکہ محنت کے امکانات کا جائزہ لیا گیا اور یہ طے پایا کہ اگلے سال

اس بارے میں مزید سوچ بچار کریں گے، مگر اس کے بعد امریکہ بہادر مجھے ویزا دینے سے مسلسل انکار کر رہا ہے، اس لیے وہ گفتگو ادھوری رہ گئی۔

ماہ رواں کے آغاز کی بات ہے کہ برطانیہ کے شہر نوٹنگھم میں گوجرانوالہ سے تعلق رکھنے والے ایک نوجوان عالم دین مولانا اورنگ زیب خان کے سامنے میں نے اس خواہش کا اظہار کیا کہ کسی سنجیدہ مسیحی عالم سے ملنا چاہتا ہوں۔ مولانا اورنگ زیب خان جامعہ الہدیٰ نوٹنگھم میں اسلامک ہوم اسٹڈی کورس کے ڈائریکٹر ہیں اور انگلش کے اچھے خطیب ہیں۔ انہوں نے بتایا کہ نوٹنگھم سٹی کے ایک چرچ کے سربراہ ان کے دوست ہیں۔ ان سے انہوں نے ملاقات کا وقت لے لیا اور ان سے ان کے چرچ میں کم و بیش ڈیڑھ گھنٹہ تفصیلی گفتگو ہوئی۔ ملاقات میں ورلڈ اسلامک فورم کے چیئرمین مولانا محمد عیسیٰ منصوری اور مولانا اورنگ زیب خان کے علاوہ ایک نومسلم آئرش بزرگ حاجی عبدالرحمن بھی شریک تھے۔ گفتگو کا ایجنڈا وہی تھا جس کا ذکر سطور بالا میں امریکہ کے مسیحی پیشوا کے ساتھ ملاقات کے حوالے سے ہو چکا ہے۔

آسمانی تعلیمات اور مذہبی احکام و اقدار سے بغاوت کے معاشرے پر اثرات کے بارے میں سوال کے جواب میں جناب کینن نیل نے کہا کہ اس کے اثرات تباہ کن ہیں۔ سوسائٹی بکھر کر رہ گئی ہے؛ پڑوسی، دوست اور رشتہ دار کا کوئی تصور باقی نہیں رہا؛ نفسانفسی کا عالم ہے؛ خاندانی نظام تتربتر ہو گیا ہے؛ ماں باپ بوڑھے ہو جائیں تو کوئی پرسان حال نہیں ہوتا، حتیٰ کہ مکانات بنانے والی سوسائٹیاں اب جو مکانات بنا رہی ہیں، وہ کسی فیملی کے رہنے کی غرض سے نہیں بلکہ ایک دو افراد کے رہنے کے لیے چھوٹے چھوٹے فلیٹ بن رہے ہیں؛ بدکاری، شراب اور منشیات کا استعمال بڑھ رہا ہے اور زندگی کی ظاہری سہولتوں کی فراوانی کے باوجود ذہنی سکون غارت ہو گیا ہے اور اسمگلنگ، چوری اور ڈکیتی کی وارداتوں میں مسلسل اضافہ ہو گیا ہے۔

اس صورت حال کا بنیادی سبب فادر کینن نیل کے نزدیک مذہب سے انحراف اور روحانیت کا فقدان ہے۔ اس سلسلے میں چرچ کے کردار کے بارے میں انہوں نے کہا کہ چرچ سوسائٹی کے معاملات کے ساتھ اپنا تعلق باقی رکھنے کی کوشش کر رہا ہے۔ ہم معاشرتی مسائل پر بحث و مباحثہ کرتے ہیں، رپورٹیں مرتب کرتے ہیں، متعلقہ محکموں اور لوگوں تک رسائی حاصل کرتے ہیں۔ وہ خود ایک

رفاہی کمیٹی کے ممبر ہیں جو بدکاری کا پیشہ کرنے والی عورتوں اور نشہ کا استعمال کرنے والے لوگوں سے مل کر انہیں سمجھانے کی کوشش کرتی ہے اور انہیں اس فعل بد سے توبہ کی تلقین کرتی ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ ڈائس پر کھڑے ہو کر خطاب کرنے کی بجائے انہیں یہ طریقہ زیادہ مؤثر معلوم ہوتا ہے کہ برائی میں مبتلا لوگوں سے فرداً فرداً ملا جائے اور انہیں سمجھا بجھا کر برائی سے بچانے کی کوشش کی جائے۔

انہوں نے بتایا کہ چرچ حکومت کو بھی بہت سے معاملات میں مشورہ دیتا ہے اور قومی معاملات میں اپنی رائے کا اظہار کرتا ہے، بالخصوص اسقاط حمل کو قانونی جواز فراہم کرنے کے خلاف چرچ نے کھل کر بات کی ہے اور شہزادہ چارلس کی طرف سے لیڈی ڈیانا کو طلاق دینے کے بعد کمیلا پارکر کے ساتھ اس کے تعلقات کے بارے میں بھی چرچ نے اپنی ناراضگی کا کھلے بندوں اظہار کیا ہے اور چرچ کو اس پر بہت تشویش ہے۔ اس موقع پر فادر نیل نے کم و بیش تین سو صفحات پر مشتمل ایک رپورٹ ہمیں دکھائی جس میں بے روزگاری کے منفی اثرات پر بحث کی گئی ہے اور چرچ کی طرف سے اس سلسلے میں حکومت کو سفارشات اور تجاویز پیش کی گئی ہیں۔ انہوں نے بتایا کہ وہ خود بھی نوٹنگھم سٹی کونسل کے لارڈ میئر کے مذہبی مشیر ہیں اور انہیں مختلف معاملات میں مذہبی نقطہ نظر سے مشورہ دیتے ہیں۔

میں نے ان سے سوال کیا کہ اس سب کچھ کے باوجود حالات میں بگاڑ بڑھ رہا ہے اور مذہب سے انحراف کے اثرات سوسائٹی پر بدستور حاوی دکھائی دیتے ہیں۔ ان کے پاس مذہبی راہنما کے طور پر اس کا کیا حل ہے؟ انہوں نے جواب میں کہا کہ یہی سوال میں آپ سے کرنے والا تھا، کیونکہ ہمارے پاس اس کا کوئی حل نہیں ہے اور ہم مذہب سے بغاوت کو روکنے میں ناکام ہو گئے ہیں۔ اس کا حل روحانیت میں ہے جو ہمارے پاس نہیں رہی اور آپ لوگوں کے پاس نظر آتی ہے، اس لیے ہم تو حل کے لیے آپ کی طرف دیکھ رہے ہیں کہ آپ ہی ہماری رہنمائی کریں۔ انہوں نے کہا کہ اصل ضرورت اس امر کی ہے کہ خدا، مذہب اور آخرت پر یقین رکھنے والے دانش ور مل بیٹھیں اور مسلمانوں اور عیسائیوں کے مذہبی رہنما مل جل کر نسل انسانی کو اس دلدل سے نکالنے کی کوشش کریں۔ انہوں نے بتایا کہ گلف وار کے موقع پر یہاں مسلمانوں اور عیسائیوں نے باہم مل بیٹھنے کے لیے ایک فورم قائم کیا تھا جس کی کئی نشستیں ہوئیں، لیکن اس کے بعد یہ سلسلہ زیادہ دیر نہ چل سکا۔ میں نے عرض کیا کہ یہ کام اگر سیاست کاری سے ہٹ کر ہوتا تو شاید زیادہ مؤثر اور دیرپا ہوتا۔ اس سے انہوں نے اتفاق کیا اور

کہا کہ اب بھی اس سلسلے کو دوبارہ شروع کرنے کی ضرورت ہے۔

فادر کینن نیل نے کہا کہ آج کے دور میں ہم عجیب کشمکش میں مبتلا ہیں۔ ایک طرف مذہب پر مکمل عمل کو بنیاد پرستی کے طعنوں کا سامنا ہے اور دوسری طرف عملی مسائل سے لاتعلق کر کے مذہب کو کھوکھلا کر دیا گیا ہے۔ ہمیں اس میں کوئی متوازن راہ نکالنی چاہیے اور اسلام اور مسیحیت کے سنجیدہ مذہبی رہنماؤں کو مل بیٹھ کر اس سلسلے میں گفتگو کرنی چاہیے کیونکہ وہی اس مشکل کا حل تلاش کر سکتے ہیں۔

یہ ایک مسیحی رہنما کے خیالات ہیں جو ہمارے لیے سبق بھی ہیں اور اور دعوت بھی کہ مغرب کو روحانیت کا بھولا ہوا سبق یاد دلانے کے لیے آگے بڑھیں، لیکن اس کے لیے شرط ہے کہ یہ سبق خود ہمیں بھی اچھی طرح یاد ہو، ورنہ ایک بھولا ہوا دوسرے بھولے ہوئے کو کیا راہ دکھائے گا؟

(روزنامہ پاکستان، ۱۵ اگست ۱۹۹۷ء)

مسلمانوں کے باہمی اختلافات
ایک نومسلم کے تاثرات

برطانیہ کے حالیہ سفر کے دوران مجھے دو روز اسکاٹ لینڈ کے دارالحکومت ایڈنبرا کے قریب ایک بستی ''ڈنز'' میں اپنے بھانجے ڈاکٹر سہیل رضوان کے ہاں گزارنے کا موقع ملا۔ رضوان کو اللہ تعالیٰ نے گزشتہ دنوں تیسری بچی دی ہے اور ۸/ اپریل کو اس کی بڑی بچی کی سالگرہ تھی۔ رضوان نے ڈرتے ڈرتے مجھ سے پوچھا کہ اس کی اہلیہ کہہ رہی ہے کہ اگر ہم بچی کی سالگرہ پر کیک کاٹ لیں تو ماموں ناراض تو نہیں ہوں گے؟ میں نے کہا کہ نہیں بیٹا، ناراضگی کی کون سی بات ہے۔ اصل میں اس کا یہ خیال تھا کہ ایک غیر شرعی رسم ہونے کی وجہ سے میں اس پر غصے کا اظہار کروں گا جبکہ ایسے معاملات میں میرا موقف اور طرز عمل یہ ہے کہ اس قسم کی علاقائی اور ثقافتی رسمیں اگر دین کا حصہ نہ سمجھی جائیں اور انہیں ثواب کے ارادے سے انجام دینے کے بجائے محض خوشی کی علاقائی اور ثقافتی رسم کے طور پر کیا جائے تو اس پر شریعت کے منافی ہونے کا فتویٰ لگا دینا اور غیظ و غضب کا اظہار کرنا مناسب بات نہیں ہے۔ میری طالب علمانہ رائے میں کسی چیز کا غیر شرعی (یعنی شریعت سے ثابت نہ) ہونا اور بات ہے اور شریعت کے منافی ہونا اس سے مختلف امر ہے اور ہمیں ان دونوں کے درمیان فرق کو ملحوظ رکھنا چاہیے۔

رضوان فیملی کی خوشی میں شامل ہونے کے ساتھ ایک فائدہ اور بھی ہوا کہ شام کو ایک نومسلم مورس سے ملاقات ہو گئی۔ مورس نے اپنے قبول اسلام کا واقعہ اور اس کے بعد پیش آنے والے حالات و واقعات کے ساتھ ساتھ اپنے جذبات و احساسات کا بھی پورے جوش و خروش کے ساتھ اظہار کیا جس کا خلاصہ قارئین کی خدمت میں پیش کر رہا ہوں۔

مورس نے اسلام اور قرآن مجید کے ساتھ اپنے تعارف کے پس منظر کا تفصیلی ذکر کرنے کے بعد کہا کہ ایک دن میں نیو کاسل میں اپنے گھر میں تھا کہ صبح بیدار ہوتے ہی مجھے احساس ہوا کہ میں مسلمان

ہو گیا ہوں۔ میں نے اپنی اہلیہ سے کہا کہ تھوڑی دیر کے لیے میں گھر سے باہر جارہا ہوں اور قریب ہی ایک مسجد میں چلا گیا۔ اس سے قبل میں یہاں کسی مسلمان سے نہیں ملا تھا۔ میں نے ان کو بتایا تو انہوں نے مجھے کلمہ شہادت پڑھایا اور میرا نام تبدیل کر کے مورس بڑن کی بجائے مورس مجید رکھ دیا۔ اس کے بعد تبلیغی جماعت والوں نے مجھ سے رابطہ کیا اور اپنے ساتھ لے گئے۔ انہوں نے مجھے دوبارہ کلمہ پڑھایا اور نام مورس عبدالمجید رکھ دیا۔ پھر میرا کچھ عرصہ ان سے تعلق رہا۔ ان کے ساتھ مختلف مقامات پر جاتا رہا اور نیو کاسل میں کتابوں کی ایک دکان ''بیت الحکمۃ'' کے نام سے میں نے کھول لی۔ میں نے اپنے ساتھیوں سے کہا کہ ''بیت الحکمۃ'' کا نام یہاں کے لوگوں کی سمجھ میں نہیں آئے گا، اس لیے اس کا نام ''House of Wisdom'' رکھا جائے مگر انہوں نے میری بات نہیں مانی اور میں ''بیت الحکمۃ'' کے نام سے کچھ عرصہ دکان کرتا رہا۔ پھر میں نے یہ سوچ کر نیو کاسل کو چھوڑ دیا کہ یہاں مسلمان کم ہیں اور مسلمانوں والا ماحول نہیں ہے۔ میں بیوی بچوں سمیت بلیک برن چلا گیا، اس لیے کہ وہاں مسلمانوں کی آبادی بہت ہے، مسجدیں اور مدرسے بہت ہیں اور اسلامی ماحول موجود ہے، اس سے بچوں کی تعلیم بھی اچھی ہوگی، مگر یہ تجربہ بہت تلخ ثابت ہوا۔ میرا خیال تھا کہ دینی معلومات میں اضافہ ہوگا، ماحول اور تربیت کا فائدہ ہوگا، مگر لوگوں نے مجھے چھوٹے چھوٹے مسائل میں الجھا دیا۔ مختلف گروہ تھے، ہر ایک مجھے اپنی طرف کھینچنے لگا۔ کوئی کہتا نماز میں پاؤں یوں رکھو، دوسرا کہتا یوں نہیں بلکہ اس طرح رکھو۔ کوئی کہتا ہاتھ اس جگہ باندھو، دوسرا کہتا کہ یہاں نہیں بلکہ یہاں باندھو۔ کوئی کہتا کہ شہادت کی انگلی ایک بار اٹھاؤ، دوسرا کہتا کہ نہیں بار بار اٹھاتے رہو۔ ہر ایک کی کوشش ہوتی کہ میں اسی کے کہنے پر چلوں، کسی دوسرے کی بات مانتا تو وہ ناراض ہو جاتا۔ میرے مزاج میں تجسس تھا اور سوالات بہت کرتا تھا۔ ہر شخص اپنی بات کی دلیل میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی کوئی نہ کوئی حدیث سنا دیتا۔ حدیثوں میں اس قدر تضاد دیکھ کر مجھے ان سے نفرت ہونے لگی۔ میں لوگوں سے کہتا کہ مجھے قرآن سے سمجھاؤ۔ وہ کہتے کہ قرآن کریم اس وقت تک تم نہیں سمجھ سکتے جب تک حدیث نہ پڑھو اور حدیث پڑھنے کے لیے ضروری ہے کہ عربی سیکھو اور کئی سال مدرسے میں رہ کر دینی تعلیم حاصل کرو۔ مجھے سخت پریشانی ہونے لگی۔ میرے سوالات کی کثرت دیکھ کر وہ لوگ مجھے گمراہ اور کافر کہنے لگے۔ ہر گروہ مجھے اپنی کتابیں دیتا اور حدیثیں سناتا۔ مجھے ان میں واضح تضاد دکھائی دیتا، چنانچہ سخت پریشانی کی حالت

میں بلیک برن کو چھوڑنے کا فیصلہ کیا اور میں نے طے کر لیا کہ اب ایسی جگہ جا کر رہوں گا جہاں مسلمانوں کی آبادی نہ ہو اور پھر اسکاٹ لینڈ کے اس علاقے میں آکر آباد ہو گیا۔

مورس نے ایک سوال کے جواب میں کہا کہ وہ کسی مسلمان کی دعوت پر مسلمان نہیں ہوا اور نہ ہی کسی مسلمان کو دیکھ کر اور اس سے متاثر ہو کر مسلمان ہوا ہے، بلکہ وہ صرف اور صرف قرآن کریم کے مطالعہ سے مسلمان ہوا ہے بلکہ وہ دوسرے جن نومسلموں کو جانتا ہے، ان میں سے کوئی بھی کسی مسلمان کی دعوت پر یا اس سے متاثر ہو کر مسلمان نہیں ہوا بلکہ سب کے سب قرآن کریم پڑھ کر مسلمان ہوئے ہیں، البتہ مسلمان ہونے کے بعد مسلمانوں نے ان نومسلموں کو الجھایا ضرور ہے۔ وہ انہیں پکا مسلمان بنانے اور اسلام کی بنیادی باتوں کی تعلیم دینے کے بجائے پہلے حنفی، شافعی، دیوبندی، بریلوی، تبلیغی اور شیعہ بنانے کی کوشش کرتے ہیں جس سے وہ سخت پریشان ہو جاتا ہے۔ میں نے یہ محسوس کیا ہے کہ کسی شخص کے مسلمان ہونے پر کوئی مسلمان اس سے یہ تو نہیں پوچھتا کہ تمھیں مسلمان ہونے کے بعد کیا پریشانی لاحق ہوئی ہے؟ اپنے خاندان کے ساتھ تمہارے تعلقات کا کیا حال ہے؟ تمہیں کوئی مالی پریشانی تو نہیں ہے؟ کسی معاشرتی الجھن سے تو تم دوچار نہیں ہوئے ہو؟ اور تمھیں کسی قسم کی مدد کی ضرورت تو نہیں ہے؟ کسی نومسلم سے یہ بات کوئی نہیں پوچھتا، البتہ ہر شخص کی یہ کوشش ہوتی ہے کہ وہ اس کے فرقے میں شامل ہو جائے، کسی دوسرے فرقے کی بات نہ سنے اور کسی اور کی مسجد میں نہ جائے۔ مجھے خود اس کا تلخ تجربہ ہوا ہے، اس لیے میں نے سب کو چھوڑ دیا ہے۔

اس نے کہا کہ مجھے ایک بات سے اور پریشانی ہے کہ مسلمانوں میں عام طور پر یہ تصور پایا جاتا ہے کہ ان کے سارے مسئلے خدا نے ہی حل کرنے ہیں، اس لیے وہ ہاتھ پر ہاتھ دھرے قدرت کے کسی معجزے کا انتظار کرتے رہتے ہیں اور پچھلے واقعات سنا سنا کر خوش ہوتے رہتے ہیں کہ فلاں فلاں موقع پر خدا نے اس طرح ان کی مدد کی تھی۔ اسی طرح بہت سے مسلمان اس انتظار میں ہیں کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام دوبارہ آئیں گے اور دجال ظاہر ہو گا تو اس وقت سب کچھ ہو گا۔ مسلمانوں کو یہ سمجھانے کی ضرورت ہے کہ انہیں اپنی حالت بہتر بنانے کے لیے خود کچھ نہ کچھ کرنا ہو گا۔ اس طرح انتظار میں بیٹھے رہنے سے کچھ نہیں ہو گا۔ انہیں اپنے حالات درست کرنے کے لیے محنت کرنی چاہیے اور خود بھی کچھ کرنا چاہیے۔

مورس نے کہا کہ ایک اور بات پریشانی کی وجہ بنتی ہے کہ نومسلم کو اسلامی احکام و فرائض کے ساتھ ساتھ بعض لوگ اپنے اپنے علاقائی کلچر کا بھی پابند بنانے کی کوشش کرتے ہیں۔ ان کی خواہش ہوتی ہے کہ وہ لباس بھی ان جیسا پہنے اور وضع قطع بھی انھی کی اختیار کرے۔ اس پر اس قدر سختی کی جاتی ہے کہ وہ پریشان ہو جاتا ہے۔ جو باتیں اسلام میں ضروری نہیں ہیں، ان کے بارے میں نومسلموں پر اس قدر سختی نہ کی جائے اور انہیں سادہ طریقہ سے اسلام کی بنیادی تعلیمات سے آگاہ کیا جائے۔ مورس نے بتایا کہ وہ ایک موقع پر مسلمانوں کی اس عمومی حالت سے پریشان ہو کر یونیورسٹی کی مسجد میں گیا کہ وہاں قدرے پڑھا لکھا ماحول ہوگا، مگر وہاں بھی صورت حال اسی طرح تھی۔ شیعہ حضرات اپنی نماز کے لیے مٹی کی ٹھیکریاں سجدے کی جگہ رکھنے کے لیے الگ نظر آتے اور دوسرے فرقوں کے لوگ اپنی اپنی علامتوں کے ساتھ الگ دکھائی دیتے تھے۔ اس نے تبلیغی جماعت کے ساتھ کئی بار وقت لگایا جس سے اس کا مقصد یہ تھا کہ اسے دین کی معلومات حاصل ہوں گی اور علم میں اضافہ ہوگا، مگر وہاں بھی اسے تبلیغی نصاب اور کچن کی صفائی کے کاموں کے سوا کچھ نہیں ملا۔ اس نے قرآن کریم کا سالہا سال تک مطالعہ کیا تھا۔ اس کے حوالے سے جب وہ کوئی سوال کرتا تو اسے جواب ملتا کہ تم قرآن کریم کو کیا جانتے ہو؟ تمہارے پاس کیا علم ہے؟ اس سے اس کی مایوسی میں اضافہ ہوا۔ مجھے ایک بار ایک دوست ایک مجلس میں لے گیا۔ غریب لوگوں کا علاقہ تھا، مگر ایک بڑی گاڑی میں سبز چغہ پہنے ایک شیخ صاحب آئے تو ان کے گرد گلی میں بہت سے لوگ گھیرا ڈال کر بلند آواز سے اللہ ہو کا ورد کرنے لگے۔ اردگرد کے مقامی آبادی کے لوگ کھڑکیوں سے یہ منظر دیکھ کر تعجب کر رہے تھے کہ یہ کیا ہو رہا ہے؟ میں بھی یہ منظر دیکھ کر وہاں سے چلا آیا۔ ایک مسجد میں رمضان المبارک کے دوران دیکھا کہ کھانے پینے کا سامان بہت ضائع ہو رہا ہے اور کھانے کا انداز بھی مجھے اچھا نہ لگا۔ اس قسم کے مناظر دیکھ کر مجھے یوں محسوس ہوا کہ جس اسلام کی میں تلاش میں تھا، یہ وہ اسلام نہیں ہے، اس لیے میں اب مسلمانوں کی آبادی سے الگ تھلگ یہاں زندگی بسر کر رہا ہوں۔

میں نے مورس سے سوال کیا کہ اسلام کی دعوت دینے والوں کو نومسلموں کے ساتھ کیا طرز عمل اختیار کرنا چاہیے؟ اس پر مورس عبداللہ نے کہا کہ:

- انہیں مسائل اور اختلافات میں نہ الجھائیں اور دین کی بنیادی باتوں کی سادہ انداز میں تعلیم

دیں۔

- انسانیت کے حوالے سے لوگوں کے دکھ درد میں شریک ہونے کی تلقین کریں۔
- اسلام قبول کرنے کے بعد ان کے ساتھ پیش آنے والے مسائل اور مشکلات معلوم کریں اور انہیں حل کرنے کے لیے ان سے تعاون کریں۔
- انہیں قرآن کریم کے حوالے سے بات سمجھانے کی کوشش کریں اور احادیث کے اختلافات سے انہیں دور رکھیں۔ اس سے ان کے ذہنوں میں کنفیوژن پیدا ہوتا ہے۔
- دین کے مسائل سمجھانے کے لیے ”کامن سینس“ کا زیادہ استعمال کریں۔ مثلاً یہ بات سمجھانے کے لیے کہ مونچھیں تراشنی چاہئیں، انہیں فرض اور واجب کہہ کر بات نہ کریں بلکہ انہیں اس کے فائدے بتائیں کہ مونچھیں تراشنے سے انہیں یہ فائدہ ہوگا، وغیر ذالک۔
- انسانی ہمدردی کی بنیاد پر عام لوگوں کی خدمت کا ایسا نظام بنائیں جس سے سب لوگ مذہب کی کسی تفریق کے بغیر فائدہ اٹھا سکیں تاکہ نومسلموں کو ضرورت پڑنے پر الگ سے چیریٹی کی ضرورت نہ پڑے اور نہ یہ محسوس ہو کہ ان کی الگ سے اس حوالے سے مدد کی جا رہی ہے۔
- اسلام کے بارے میں ان کے مطالعہ اور اسٹڈی کا احترام کریں اور انہیں اس بات کا بار بار طعنہ نہ دیں کہ تم کیا جانتے ہو؟ تمھیں کیا آتا ہے؟ اور تمھارے پاس کیا علم ہے؟
- انہیں قرآن کریم کے بتائے ہوئے اچھے کاموں کو بجالانے کی تلقین کریں، دیانت وامانت کی اہمیت سے آگاہ کریں اور خیر کے کاموں کی طرف رغبت دلائیں۔

مورس عبداللہ کی گفتگو جاری تھی اور اس کے لہجے کا جوش وخروش بڑھ رہا تھا۔ وہ کبھی کبھی خاموشی سے آسمان کی طرف سر اٹھا کر گہری سوچ میں چلا جاتا۔ اس کا جی اور بھی بہت سی باتیں کرنے کو چاہ رہا تھا، مگر رات کا وقت تھا، دیر ہو رہی تھی، مجھے صبح سفر کرنا تھا اور اس سے قبل یہ رپورٹ بھی لکھنا تھی، اس لیے بادل نخواستہ گفتگو کا سلسلہ روک کر معذرت کرتے ہوئے شکریہ کے ساتھ ہم وہاں سے رات گیارہ بجے کے لگ بھگ رخصت ہوئے۔

(ماہنامہ الشریعہ، جون ۲۰۰۸ء)

غیر مسلم ممالک کے مسلمان باشندوں کے لیے
شہری حقوق و فرائض کی نوعیت

"اسلام اور شہری حقوق و فرائض" غیر مسلم معاشرے کے تناظر میں

(برطانیہ کے ایک تحقیقاتی فورم کی طرف سے موصولہ سوال نامہ کے جوابات)

جمہوریت اور انصاف

(۱) سماجی زندگی پر اثر انداز ہونے کے لیے فیصلہ سازی اور انتخابی عمل میں فعال حصہ لینے، ایک شہری کی حیثیت سے متحرک کردار ادا کرنے اور جمہوریت کے بارے میں اسلامی نقطہ نظر کیا ہے؟

جواب: اسلام ایک مسلمان کو اور کسی اسلامی مملکت کے ایک شہری کو سوسائٹی کے اجتماعی معاملات میں حصہ لینے اور سوسائٹی کی بہتری کے لیے کردار ادا کرنے کا نہ صرف حق دیتا ہے بلکہ اس کی حوصلہ افزائی کرتا ہے۔ قرآن کریم میں "تعاونوا علی البر والتقوی ولا تعاونوا علی الاثم والعدوان" (المائدہ) کے تحت جو ہدایت دی گئی ہے، وہ اس کی واضح علامت ہے، اس لیے کہ بر و تقویٰ اور اثم وعدوان کا اطلاق صرف ذاتی نیکی اور بدی پر نہیں ہوتا بلکہ سوسائٹی کا اجتماعی خیر و شر اور نفع و ضرر بھی اس کے دائرے میں شامل ہے۔

دنیا کے مختلف ممالک سے جو مسلمان نقل مکانی کر کے مغربی ممالک میں گئے ہیں اور انہوں نے ان ممالک کو اپنا وطن بنالیا ہے تو جہاں وہ ان ممالک کے وسائل اور سہولتوں سے استفادہ کر رہے ہیں، وہاں اس سوسائٹی کا بھی ان پر حق ہے کہ وہ اسے کچھ دیں۔ اس ملک اور سوسائٹی نے مسلمانوں کو بہت کچھ دیا ہے اور وہ اسے بھرپور طریقے سے وصول کر رہے ہیں، لیکن صرف لینا اور لیتے ہی چلے جانا انصاف کی بات نہیں ہے اور اس سوسائٹی کو کچھ دینا بھی ان کی ذمہ داری ہے۔

اس سلسلے میں احساس کمتری میں مبتلا ہونے کی ضرورت نہیں کہ ہمارے پاس انہیں دینے کے

لیے کچھ نہیں ہے۔ ہمارے پاس بہت کچھ ہے اور ہم انہیں بہت کچھ دے سکتے ہیں۔ اس سوسائٹی کے پاس دنیا کے وسائل اور سہولتوں کی فراوانی ہے جو ہمارے پاس نہیں ہے اور یہ ہمیں ان سے بہرہ ور کر رہے ہیں، لیکن ان کے پاس روح کا سکون اور آخرت کی نجات کا سامان نہیں جو بحمد اللہ تعالیٰ تمام تر خرابیوں کے باوجود ہمارے پاس موجود ہے، وہ ہم انہیں دے سکتے ہیں اور یہ ہماری دینی ذمہ داری بھی ہے کہ ہم وہ انہیں مہیا کریں۔ میں نے چند سال قبل نوٹنگھم برطانیہ میں ایک بڑے پادری صاحب سے اس سلسلے میں بات کی اور ان سے پوچھا کہ مغربی سوسائٹی میں خاندانی سسٹم کی بربادی اور روحانی سکون کے فقدان کے حوالے سے جو صورت حال ہے، کیا وہ اس سے مطمئن ہیں؟ انہوں نے نفی میں سر ہلایا اور کہا کہ یہ صورت حال ہمارے لیے بڑی پریشان کن ہے۔ میں نے دریافت کیا کہ آپ کے نزدیک اس کا حل کیا ہے؟ تو انہوں نے بڑے صاف انداز میں یہ بات کہہ دی کہ "ہمارے پاس اس کا کوئی حل نہیں ہے، ہم تو آپ کی طرف دیکھ رہے ہیں"۔

جمہوریت کے بارے میں اسلام کا نقطہ نظر یہ ہے کہ:

- حکومت کی تشکیل عوام کی رائے اور مشورہ سے ہوگی، جیسا کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنا جانشین نامزد کرنے کی بجائے اس کا انتخاب لوگوں کی اجتماعی صواب دید پر چھوڑ دیا تھا۔
- حکومت خاندانی نہیں ہوگی، جیسا کہ صحابہ کرامؓ کے دور میں بننے والے خلفاء حضرت ابوبکر، حضرت عمر، حضرت عثمان، حضرت علی اور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہم میں سے کوئی بھی ایک دوسرے کا نسبی وارث نہیں تھا۔
- حکومت عوام کے سامنے جواب دہ ہوگی، جیسا کہ حضرت ابوبکرؓ نے اپنے پہلے خطبے میں عام لوگوں کا یہ حق تسلیم کیا کہ "میں سیدھا چلوں تو میرا ساتھ دو اور اگر ٹیڑھا چلوں تو مجھے سیدھا کر دو۔" یا جیسا کہ صحابہ کرامؓ کے دور میں اور بعد میں بھی عام لوگ خلفاء کے طرز عمل پر کھلے بندوں انہیں ٹوک دیا کرتے تھے اور خلفاء کو بعض اوقات اپنے فیصلے واپس بھی لینا پڑتے تھے۔
- حکمران اپنے معاملات عوام کے مشورہ سے چلائیں گے۔ عوامی معاملات عام لوگوں کے مشورہ سے اور علمی و فنی معاملات عوام کے مشورہ سے چلانے کے بارے میں خلفائے

راشدینؓ کے طرزِ عمل کا ذکر تاریخ کی بہت سی روایات میں موجود ہے، بلکہ خود نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم بھی ایسے امور میں جن میں وحی نازل نہیں ہوتی تھی، عام لوگوں یا متعلقہ لوگوں سے مشاورت کیا کرتے تھے، حتیٰ کہ اپنی رائے کے خلاف عمومی مشاورت کی رائے بھی نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے قبول فرمائی ہے، جیسا کہ غزوۂ احد کے موقع پر ہوا جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی رائے یہ تھی کہ مدینہ میں رہ کر حملہ آور لشکر کا مقابلہ کیا جائے، لیکن نوجوان صحابہ کے اصرار پر آپ نے مدینے سے باہر نکل کر جنگ کرنے کا فیصلہ فرمایا۔

- البتہ ایک اسلامی ریاست میں قرآن و سنت کی بالادستی کو تسلیم کرنا اور ان کے واضح احکامات کی پابندی کرنا حکمرانوں اور رعیت، دونوں کے لیے ضروری ہے اور ان میں سے کوئی بھی قرآن و سنت کے صریح احکام سے انحراف کا مجاز نہیں ہے، نیز قرآن و سنت کے صریح احکام کو بطور قانون نافذ کرنا مسلمان حکمران کی منصبی ذمہ داری ہے، جیسا کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حجۃ الوداع کے خطبے میں فرمایا تھا کہ ''اپنے حکمران کی اطاعت کرو، اگرچہ وہ حبشی غلام ہی کیوں نہ ہو، جب تک کہ وہ تم میں کتاب اللہ کے احکام کو نافذ کرے''، اور خلیفہ اول سیدنا ابوبکرؓ نے اپنے پہلے خطبے میں اعلان کیا تھا کہ ''میری اطاعت تم پر واجب ہے، جب تک میں قرآن و سنت کی پابندی کروں اور اگر اس سے انحراف کروں تو میری اطاعت تم پر واجب نہیں ہے۔''

(۲) اسلام اس بات کی کیسے حوصلہ افزائی کرتا ہے کہ (سیاسی دائرے میں) مختلف صورت حال میں جائز اور ناجائز کے مابین امتیاز جائے، تاکہ نوجوان درست فیصلہ کر سکیں؟

جواب: اسلام ہر شخص کا یہ حق تسلیم کرتا ہے کہ وہ جس بات کو قانون کے حوالے سے غلط اور باہمی حقوق کے حوالے سے زیادتی سمجھتا ہو، اس کے خلاف آواز اٹھائے بلکہ سوسائٹی کے اجتماعی نقصان کی صورت میں یہ آواز اٹھانا اور معروف ذرائع سے اس کے سدباب کی عملی کوشش کرنا اس کے مذہبی فرائض میں شامل ہو جاتا ہے۔ اسی طرح سوسائٹی میں خیر کے فروغ اور شر کے سدباب کے لیے محنت کرنا بھی ہر شخص کا حق بلکہ اس کی ذمہ داری ہے۔

ایک اسلامی ریاست میں قرآن و سنت کی خلاف ورزی اور غیر مسلم ریاست میں مسلمہ دستور و معاہدات کی خلاف ورزی پر اسے ٹوکا جا سکتا ہے اور جہاں حق تلفی ہو رہی ہو، اس کی نشان دہی کی جا سکتی ہے اور اس روک ٹوک، نشان دہی اور احتجاج کے لیے وہ سب ذرائع اختیار کیے جا سکتے ہیں جو اس دور اور علاقے میں معروف اور تسلیم شدہ ہوں۔ حضرت معاویہؓ رومیوں کے ساتھ جنگ بندی کے معاہدے کی مدت ختم ہونے سے پہلے اپنا لشکر لے کر روم کی سرحد کی طرف جا رہے تھے اور ان کا ارادہ تھا کہ وہ مدت ختم ہونے تک سرحد تک پہنچ جائیں گے اور مدت ختم ہوتے ہی حملہ کر دیں گے، لیکن حضرت عمرو بن عبسہؓ نے انہیں روک دیا اور کہا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد گرامی کی رو سے اگر کسی قوم کے ساتھ جنگ بندی کا معاہدہ ہو تو جنگ بندی کی میعاد ختم ہونے سے پہلے اس کے خلاف فوجوں کو حرمت میں لانا درست نہیں۔ حضرت معاویہؓ یہ سن کر راستے سے ہی واپس آ گئے اور فوج کو چھاؤنی میں بھیج دیا۔ اس طرح کے درجنوں واقعات خلفائے اسلام کے مختلف ادوار میں ملتے ہیں۔

(۳) ایک جمہوری ڈھانچے میں انصاف کے حوالے سے اسلام کا تصور کیا ہے؟ (کیا عمومی عدالتی نظام قابل قبول نہیں اور مسلمانوں کی علیحدہ عدالتیں قائم کرنا ضروری ہے؟)

جواب: جمہوری ڈھانچے میں انصاف کے حوالے سے اسلام کا تصور حالات اور زمینی حقائق کی روشنی میں مختلف دائروں میں تقسیم ہے:

- جہاں مسلم اکثریت یا مسلم اقتدار ہے، وہاں اسلامی عدالتوں کا قیام ضروری ہے جو قرآن و سنت کے مطابق لوگوں کو انصاف فراہم کریں، مگر غیر مسلم اقلیتیں اپنے خاندانی معاملات اور مذہبی معاملات میں ان عدالتوں کی پابند نہیں ہوں گی اور ان کے فیصلے ان دو حوالوں سے ان کے مذہب و روایات کے مطابق کیے جائیں گے جس کے لیے عدالتی نظام بھی ان کے اطمینان کے مطابق فراہم کیا جائے گا۔
- جن ممالک میں مسلمان اکثریت یا اقتدار میں نہیں ہیں، وہاں چونکہ وہ ایک سماجی معاہدے کے تحت رہ رہے ہیں، اس لیے اس سماجی معاہدہ (نیشنیلٹی کے قوانین) کی پابندی ان کے لیے ضروری ہے جو وہاں کی ریاستی عدالتوں کے ذریعے ہی ہوگا، البتہ مذہبی معاملات اور خاندانی احکام و قوانین میں ان کے مذہب کے مطابق عدالتی نظام کا

فراہم کیا جانا ان کا حق ہے۔ اس حق کے لیے وہ کوشش کرتے رہیں گے اور اس کے لیے ہر ممکن ذریعہ اختیار کریں گے۔ نیز اس ملک کے عمومی قوانین میں اگر کوئی بات قرآن و سنت کے صریح احکام اور مسلمانوں کے کسی اجماعی عقیدہ سے ٹکراتی ہے تو وہ اس کے خلاف احتجاج کریں گے، اسے تبدیل کرانے کی کوشش کریں گے اور حکمرانوں کو اس کی طرف توجہ دلائیں گے اور اگر اس کے باوجود وہ تبدیل نہیں ہوتے تو مسلمانوں کے لیے دو ہی راستے ہیں کہ یا وہ ملک چھوڑ دیں اور یا مجبوری کے درجے میں وہاں رہتے ہوئے اپنا احتجاج مسلسل ریکارڈ کراتے رہیں، مگر قانون کو ہاتھ میں لینے یا مروجہ سسٹم سے بغاوت کرنے کا ان کو اس سماجی معاہدہ کی رو سے حق نہیں ہوگا۔

(۴) سماج میں امن قائم رکھنے کے لیے قانون کی اہمیت کے بارے میں اسلام کا نقطہ نظر کیا ہے؟ (سیاسی فیصلوں سے اختلاف کرتے ہوئے قانون کی پابندی کرنے کی کیا اہمیت ہے؟)

جواب: اسلام سوسائٹی میں امن کو برقرار رکھنے اور اس کا احترام کرنے کا حکم دیتا ہے اور رائج الوقت قانون کی پابندی کا حکم دیتا ہے، چنانچہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے کہ ”حاکم وقت اگر تمھاری حق تلفی بھی کر رہا ہو تو اس کی اطاعت کرو“۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ظلم کے خلاف آواز اٹھانے اور احتجاج کرنے کا حکم بھی دیا ہے۔ ان دونوں ارشادات کو سامنے رکھتے ہوئے یہ اصول اخذ ہوتا ہے کہ ظلم و زیادتی کے خلاف احتجاج کرنا، اپیل کرنا اور آواز اٹھانا تو مظلوم کا حق ہے، لیکن قانون سے انحراف اور فیصلوں سے بغاوت کا اسے حق نہیں ہے۔ البتہ مسلم اقتدار کی صورت میں مسلمان حکمران کی طرف سے صریح کفر (کفر بواح) کے ارتکاب پر جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم عام مسلمانوں کو بغاوت کی اجازت دیتے ہیں جس کے لیے فقہائے کرام نے شرط لگائی ہے کہ اگر ”کفر بواح“ یعنی صریح کفر کے مرتکب مسلم حکمران کو عوامی بغاوت کے ذریعے تبدیل کر دینے کا غالب امکان نظر آ رہا ہو تو ایسا کرنا ضروری ہے، ورنہ خواہ مخواہ عام لوگوں کو بدامنی کا شکار بنانا اور ان کی جان و مال کو خطرے میں ڈال دینا شرعاً جائز نہیں ہے۔ لیکن یہ حکم اسلامی ریاست کے لیے ہے۔ غیر مسلم ریاست کے لیے ہم پہلے عرض کر چکے ہیں کہ ایسی صورت میں مسلمان یا ملک چھوڑ دیں اور یا اپنا احتجاج ریکارڈ کراتے ہوئے وہاں رہیں، لیکن قانون کی پابندی ان کے لیے ضروری

ہوگی۔

اس وقت عالمی تناظر میں عراق، فلسطین، کشمیر اور افغانستان وغیرہ کے حوالے سے مغربی حکومتوں کا جو طرزِ عمل ہے، اس کے بارے میں صرف مسلمانوں کا ہی نہیں، بلکہ عالمی رائے عامہ اور غیر جانب دار مبصرین کا کہنا بھی یہی ہے کہ مسلمانوں کے ساتھ زیادتی ہو رہی ہے، اس لیے مسلمانوں بالخصوص گرم خون رکھنے والے نوجوانوں کے ذہنوں میں اس کا ردعمل پیدا ہونا فطری بات ہے۔ اس لیے آج کے ورلڈ میڈیا کی کھلی فضا میں دنیا کے مختلف حصوں میں مسلمانوں کے ساتھ ہونے والی زیادتیوں کے خلاف مسلمان نوجوانوں کے دل و دماغ میں ردعمل کے پیدا ہونے کو تو کسی صورت میں نہیں روکا جا سکتا اور نہ ہی اس کے اظہار پر کوئی قدغن لگائی جا سکتی ہے، البتہ اس ردعمل کے اظہار کو مناسب حدوں کا پابند ضرور کیا جا سکتا ہے۔ مثلاً برطانیہ میں رہنے والے مسلمان نوجوانوں کو ہم یہ تو نہیں کہہ سکتے کہ وہ عراق، فلسطین، کشمیر، افغانستان یا کسی اور جگہ کے مسلمانوں کی مظلومیت پر ردعمل کا شکار نہ ہوں یا اپنے ردعمل کا اظہار نہ کریں، کیونکہ ان سے یہ کہنا صریحاً زیادتی اور ناانصافی کی بات ہوگی، البتہ ہم ان سے یہ ضرور کہہ سکتے ہیں اور ہمیشہ کہتے رہے ہیں کہ وہ اپنے جذبات اور ردعمل کے اظہار میں اپنے ملک کے احوال و ظروف، دستور و قوانین اور اپنے دیگر ہم وطنوں کے جذبات و احساسات کی ضرور پاس داری کریں اور اپنی حکومت، مسلمان بھائیوں اور دیگر برادران وطن کے لیے مشکلات پیدا نہ کریں۔

جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عمرو بن عبسہؓ کو قبول اسلام کے بعد اپنے قبیلے میں جا کر خاموشی کے ساتھ وقت گزارنے اور غلبہ اسلام کی صورت میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آ جانے کی ہدایت کی تھی۔ (صحیح مسلم) آپ نے حضرت ابوذر غفاریؓ کو بھی قبول اسلام کے بعد اسی قسم کی ہدایت کی تھی۔ (صحیح بخاری) جنگ بدر کے موقع پر حضرت حذیفہ بن الیمانؓ اور ان کے والد محترم دونوں جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آ رہے تھے کہ راستے میں کافروں نے پکڑ لیا اور اس شرط پر چھوڑا کہ آپ دونوں ہمارے خلاف جنگ میں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ شریک نہیں ہوں گے۔ کفار کی قید سے رہا ہو کر دونوں جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور سارا قصہ بیان کر دیا۔ اس پر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں یہ کہہ کر جنگ میں شرکت

سے روک دیا کہ چونکہ آپ دونوں نے کفار کی یہ شرط منظور کر لی تھی، اس لیے آپ ہمارے ساتھ جنگ میں شریک نہیں ہوں گے۔ چنانچہ دونوں باپ بیٹا موجود ہوتے ہوئے بھی غزوۂ بدر میں شامل نہ ہو سکے۔ ان واقعات سے اس سلسلے میں اصولی راہ نمائی حاصل کی جا سکتی ہے۔

میری رائے میں حالیہ عالمی کشمکش میں ہمیں مغربی ممالک و اقوام کو اقوام و ممالک کی حیثیت سے اپنا حریف نہیں سمجھنا چاہیے بلکہ جس طرح مسلم ممالک میں حکومتوں کے اہداف عوام کے اہداف و مقاصد سے مختلف ہیں، اسی طرح مغربی ممالک میں بھی حکومتوں اور بالادست قوتوں کے اہداف و عزائم کا عوام کے اہداف و مقاصد سے ہم آہنگ ہونا ضروری نہیں ہے۔ اگر ان دونوں میں فرق کو محسوس کرتے ہوئے مغرب کی رائے عامہ سے اس کی نفسیات اور ذہنی سطح کے مطابق براہ راست مخاطب ہو کر اس کے سامنے اپنا مقدمہ صحیح طور پر پیش کیا جا سکے تو مسلمان اپنے اختلاف اور احتجاج کو زیادہ مؤثر طریقے سے ریکارڈ کرا سکتے ہیں۔

مغربی ممالک میں مقیم مسلمانوں کو میرا مشورہ یہ ہے کہ وہ جس ملک میں رہتے ہیں، وہاں کے دستور و قانون کی پوری طرح پابندی کریں اور اس کے دائرے میں رہتے ہوئے اپنے دین اور ملت کے لیے جو بھی کر سکتے ہوں، اس سے گریز نہ کریں۔ میں ایسی سرگرمیوں کے حق میں نہیں ہوں جن سے ملک کے دستور و قانون کی پابندی کا عہد متاثر ہوتا ہو اور عام مسلمانوں کی پریشانیوں میں اضافہ ہوتا ہو اور ایسی خاموشی کو بھی جائز نہیں سمجھتا جس میں اسلام اور مسلمانوں کے جائز حقوق اور ان کے حصول و تحفظ کے قانونی استحقاق سے بھی دست برداری اختیار کر لی جائے۔ یہ دونوں باتیں غلط ہیں۔ مسلمانوں کو ان کے درمیان اعتدال اور توازن کا راستہ اختیار کرنا چاہیے اور پوری ہوشیاری اور بیداری کے ساتھ اپنے ملی اور معاشرتی حقوق و مفادات کا تحفظ کرنا چاہیے۔

(۵) رواداری اور احترام کے بارے میں اسلام کا نقطہ نظر کیا ہے، بالخصوص ان لوگوں کے حوالے سے جو مختلف اعتقادات اور پس منظر کے حامل اور مختلف روایتوں سے وابستہ ہیں؟

جواب: اسلام عقیدہ و مذہب کے اختلاف کے باوجود ایک دوسرے کے احترام کا حکم دیتا ہے، ایک دوسرے کے معبودوں اور مسلمہ بڑوں کے خلاف بد زبانی سے روکتا ہے، اپنے اپنے دائرے میں مذہبی احکام و روایات پر عمل کا حق دیتا ہے اور مذہبی آزادی کو تسلیم کرتا ہے، لیکن ایک اسلامی ریاست

میں اسلامی روایات واقدار کو کھلے بندوں چیلنج کرنے کا حق نہیں دیتا اور یہ بالکل اسی طرح ہے جیسے کوئی بھی ریاست اپنے تمام شہریوں کو اپنے اپنے دائرے میں اپنے عقائد، کلچر اور روایات کے مطابق زندگی گزارنے کا حق دیتی ہے، لیکن ریاست کے عمومی دستور و قانون اور ریاست کی تہذیبی بنیادوں کو چیلنج کرنے کا کسی کو بھی حق حاصل نہیں ہوتا۔

جہاں تک معاشرتی اور سماجی تعلقات کا تعلق ہے تو اسلام ابراہیمی مذاہب کے پیرو کاروں کے ساتھ رواداری اور احترام کے رویے کی خصوصی تلقین کرتا ہے۔ سیرت نبوی میں اس کی جھلک حسب ذیل چند واقعات میں دیکھی جا سکتی ہے:

- مکی عہد نبوت میں جب روم کے مسیحیوں اور فارس کے مجوسیوں کے مابین جنگ میں رومیوں کو شکست ہوئی تو مسلمان بہت غمگین ہوئے۔ رومیوں کے ساتھ اس ہمدردی کو قرآن مجید نے بنظرِ استحسان دیکھا اور مسلمانوں کی تسلی کے لیے یہ وعدہ فرمایا کہ عنقریب رومیوں کو ایرانیوں پر غلبہ حاصل ہوگا اور اس دن مسلمانوں کو خوشی حاصل ہوگی۔
- ہجرت کے بعد ایک مخصوص عرصے تک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یہود کی تالیف قلب کے لیے ان کے قبلہ یعنی بیت المقدس کی طرف رخ کر کے نماز ادا کرتے رہے۔
- فرعون کی غلامی سے بنی اسرائیل کے نجات پانے کی خوشی میں مدینہ منورہ کے یہود محرم کی دس تاریخ کو روزہ رکھا کرتے تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی موافقت میں عاشورا کا روزہ رکھنا شروع کر دیا اور مسلمانوں کو بھی اس کا حکم دیا اور فرمایا کہ ''ہم موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ تم سے زیادہ تعلق رکھتے ہیں۔''
- ایک انصاری نے یہ جملہ زبان سے ادا کرنے پر ایک یہودی کو تھپڑ مار دیا کہ: ''اس اللہ کی قسم جس نے موسیٰ علیہ السلام کو تمام انسانوں پر فضیلت عطا کی ہے'' اور کہا کہ تم موسیٰ علیہ السلام کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی افضل قرار دیتے ہو؟ یہودی شکایت لے کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا۔ آپ اس کی شکایت سن کر انصاری سے شدید ناراض ہوئے اور یہود کے مذہبی جذبات کی رعایت سے صحابہ کو اس بات سے منع فرما دیا کہ وہ ان کے سامنے انبیاء میں سے بعض کو بعض سے افضل قرار دیں۔

- ۹ ہجری میں نجران کے عیسائیوں کا ایک وفد مدینہ منورہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا تو آپ نے انہیں مسجد نبوی میں ٹھہرایا۔ جب عصر کی نماز کا وقت آیا اور انہوں نے نماز پڑھنی چاہی تو صحابہ نے ان کو روک دیا، لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ انہیں نماز پڑھنے دو۔ چنانچہ انہوں نے مسجد نبوی ہی میں مشرق کی سمت میں اپنے قبلے کی طرف رخ کر کے نماز ادا کی۔
- ایک شخص کا جنازہ گزرا تو آپ اس کے احترام میں کھڑے ہو گئے۔ کہا گیا کہ یہ تو ایک یہودی کا جنازہ ہے، تو فرمایا: "کیا وہ انسان نہیں ہے؟"
- رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہ نے ان کے ساتھ معاشرتی اور قانونی معاملات میں ہر موقع پر عدل و انصاف کا رویہ اختیار فرمایا جس کی شہادت ایک موقع پر خود یہود نے یوں دی کہ: "یہی وہ حق اور انصاف ہے جس کے سہارے زمین اور آسمان قائم ہیں۔"
- جن معاملات میں آپ کو کوئی واضح ہدایت نہیں ملی ہوتی تھی، ان میں آپ اہل کتاب کے قوانین اور طریقوں کے مطابق فیصلہ فرمایا کرتے تھے۔
- لباس اور وضع قطع سے متعلق امور میں بھی آپ مشرکین کے مقابلے میں اہل کتاب کے طریقے کی موافقت کو پسند فرماتے تھے۔

(٦) دوسرے مسلم گروہ، جو کسی مختلف مکتب فکر سے متعلق ہیں، ان کے ساتھ طرز عمل کے بارے میں اسلام کی کیا تعلیم ہے؟

جواب: اسلام کے دائرے میں شمار کیے جانے والے تمام مسلمان گروہوں کو جنھیں اسلامی اصطلاح میں اہل قبلہ کہا جاتا ہے، ایک اسلامی ریاست میں برابر کے حقوق حاصل ہیں اور تمام گروہوں کے معتقدات و جذبات کے احترام کا حکم دیا گیا ہے، جبکہ فقہی اور اعتقادی اختلافات کی صورت میں ملک کا عمومی قانون اکثریت کے رجحانات کے مطابق ہوگا اور اقلیتی گروہوں کو اپنے مذہبی اور خاندانی معاملات اپنی اپنی فقہ کے مطابق طے کرنے کا حق حاصل ہوگا۔ البتہ اہل قبلہ کے تعین میں یہ فرق ملحوظ رکھنا ہوگا کہ اسلام کے کسی بنیادی عقیدہ مثلاً ختم نبوت سے منحرف گروہوں (قادیانیوں اور

بہائیوں وغیرہ) کو اسلام کے دعوے کے باوجود اس دائرے میں شامل نہیں کیا جائے گا اور اس سلسلے میں مسلمانوں کے اجماعی فیصلے اور جذبات کا احترام ضروری ہوگا۔

جہاں تک مسلمانوں کے باہمی اعتقادی مسائل اور فقہی اختلافات کا تعلق ہے تو ان اختلافات کی درجہ بندی اور ترجیحات مسلمانوں کے سامنے واضح ہونی چاہیے اور انہیں اس بات کا علم ہونا چاہیے کہ کون سی بات کفر و اسلام کی ہے اور کون سی بات اولیٰ اور غیر اولیٰ کی ہے، کس اختلاف پر سخت رویہ اختیار کرنا ضروری ہے اور کون سے اختلاف کو کسی مصلحت کی خاطر نظر انداز بھی کیا جا سکتا ہے۔ اگر نظری، فقہی اور فروعی مباحث میں ایک دوسرے کے نقطہ نظر کے احترام اور برداشت کا رویہ باقی نہ رہے تو خالصتاً فروعی حتیٰ کہ اولیٰ وغیر اولیٰ کے جزوی اختلافات بھی بحث و مباحثہ میں اس قدر شدت اختیار کر لیتے ہیں کہ کفر و اسلام میں معرکہ آرائی کا تاثر ابھرنے لگتا ہے اور بیشتر اوقات اس سے خود اسلام کے تعارف میں مشکلات پیدا ہو جاتی ہیں۔ مثال کے طور پر برطانوی معاشرہ اسلام کی تبلیغ و دعوت کا ایک وسیع اور ہموار میدان ہے، لیکن اسلام کی دعوت و تبلیغ کی راہ میں یہاں سب سے بڑی رکاوٹ مسلمانوں کے فرقہ وارانہ اختلافات، بالخصوص دیوبندی بریلوی کشیدگی ہے جس کے دل خراش اور سنگ دلانہ مظاہروں نے یہاں کی مقامی آبادی کے سامنے اسلام اور مسلم معاشرہ کا ایک ایسا نقشہ پیش کیا ہے جسے کشش، پسندیدگی یا قبولیت کا باعث کسی طرح بھی قرار نہیں دیا جا سکتا۔ اس کشیدگی کا اہتمام کرنے والے عناصر خواہ کوئی ہوں، انہوں نے اس کے ذریعے اپنے فرقہ وارانہ جذبات کی وقتی تسکین کا سامان شاید فراہم کر لیا ہو مگر اسلام کی قطعاً کوئی خدمت نہیں کی بلکہ اسلام کی دعوت و تبلیغ کی راہ میں رکاوٹ کھڑی کر دی ہے۔

(۷) عقیدہ اور طرز حیات کے تنوع اور ان کے مابین انتخاب کی آزادی کے بارے میں اسلام کیا کہتا ہے؟

جواب: عقیدہ اور طرز حیات کے تنوع کو اسلام تسلیم کرتا ہے اور اسے سوسائٹی کا ناگزیر حصہ تصور کرتا ہے، لیکن چونکہ اسلام کے نزدیک آسمانی تعلیمات کی پابندی اور وحی الٰہی کو قبول کرنا ہی انسان کے لیے صحیح راستہ ہے اور اسلامی نقطہ نظر سے آسمانی تعلیمات اور وحی الٰہی کی محفوظ اور فائنل صورت قرآن کریم اور جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت و سنت ہے، اس لیے وہ اس سے انحراف کی اجازت نہیں دیتا، بالکل اسی طرح جیسے آج کی مغربی قیادت ویسٹرن کلچر کو انسانی کلچر کی صحیح ترین اور

فائنل شکل قرار دیتے ہوئے دنیا میں کسی قوم یا طبقہ کو بھی اس سے انحراف کی اجازت نہیں دے رہی اور جہاں بھی ویسٹرن کلچر سے ہٹ کر کسی دوسرے کلچر کے سوسائٹی میں اسٹیبلش ہونے کا امکان نظر آتا ہے، وہاں مغربی ممالک طاقت کے اندھا دھند استعمال کے ذریعے اس کا راستہ روکنے کی کوشش کرتے ہیں۔

اس معاملے میں اسلام اور مغرب کے نقطہ نظر میں اصولی طور پر اتفاق پایا جاتا ہے اور صرف اتنا فرق ہے کہ اسلام آسمانی تعلیمات اور وحی الٰہی کو اس کی فائنل صورت (قرآن و سنت) میں انسانی سوسائٹی کی صحیح ترین اور حتمی شکل قرار دیتا ہے اور اس سے انحراف کو برداشت نہیں کرتا، جبکہ مغرب اپنے موجودہ کلچر کو حتمی اور فائنل سمجھتا ہے اور دنیا میں کسی کو اس سے ہٹ کر کوئی اور کلچر اختیار کرنے کا حق دینے کے لیے تیار نہیں ہے۔

(۸) حکومت اور معاشرہ کے حوالے سے ایک شہری کے کردار اور ذمہ داریوں کے بارے میں اسلام کیا کہتا ہے؟

جواب: اسلام ایک عام شہری کو ملکی معاملات میں شریک ہونے، ملک کے مشاورتی نظام کا حصہ بننے، خیر کے کاموں میں تعاون کے راستے تلاش کرنے اور شر کی راہ میں رکاوٹ بننے کا نہ صرف حق دیتا ہے، بلکہ اس کی تلقین کرتا ہے اور اسے مذہبی فرائض میں شمار کرتا ہے۔

(۹) اسلام میں ارباب حل و عقد کو ان کے اعمال کے لیے جواب دہ ٹھہرانے کا طریقہ کیا ہے؟ (حکومت کے فیصلوں سے اختلاف اور ان پر تنقید کا درست طریقہ کیا ہے؟)

جواب: خلیفہ اول حضرت ابوبکرؓ کا پہلا خطبہ اس سلسلے میں اسلامی مزاج کی صحیح عکاسی کرتا ہے کہ اگر میں قرآن و سنت (یعنی قانون) کے مطابق چلوں تو میرا ساتھ دیتے رہو، اور اگر ٹیڑھا چلنے لگوں تو مجھے سیدھا کر دو۔" اس کا مطلب یہ ہے کہ اسلام حاکم وقت کو عوام کے سامنے جواب دہ بناتا ہے اور عوام کو یہ حق دیتا ہے کہ وہ حاکم وقت کو قانون کے خلاف چلنے کی صورت میں نہ صرف یہ کہ ٹوک دیں بلکہ اسے سیدھا کر دینے کے جو ذرائع میسر ہوں، وہ بھی اختیار کریں۔ حکام کو روک ٹوک کرنے اور انہیں سیدھا کر دینے کا کوئی متعیّن طریقہ اسلام نے نہیں طے کیا، بلکہ اسے حالات اور مواقع کی مناسبت سے کھلا چھوڑ دیا ہے اور اس کے لیے حالات زمانہ کے حوالے سے کوئی بھی مناسب طریقہ

اختیار کیا جاسکتا ہے۔ مثلاً آج کے دور میں ووٹ، سیاسی عمل، احتجاج اور میڈیا و لابنگ اس کی مروجہ اور معروف صورتیں ہیں۔

حقوق اور فرائض

(۱) حقوق اور فرائض کی ان مختلف قسموں کے بارے میں اسلام کا نقطہ نظر کیا ہے جن کا اثر فرد اور سماجی گروہوں، دونوں پر پڑتا ہے؟ (دوسروں کے حقوق کا کیسے خیال رکھا جائے، حقوق میں ٹکراؤ کی صورت میں کیا کرنا چاہیے اور اختلاف کے حدود اور آداب کیا ہیں؟)

(۲) اسلام کی نظر کی اس بات کو یقینی بنانے کے حوالے سے حکومت کی ذمہ داری کیا ہے کہ مختلف تنظیموں اور افراد کے حقوق کے مابین توازن قائم رہے اور ان حقوق کو تحفظ فراہم کیا جائے؟

(۳) ایسے مسائل کو اسلام کیسے ڈیل کرتا ہے جہاں حقوق کے مابین تصادم کی کیفیت پیدا ہو جائے؟ تصادم کے حل کے لیے اس کا تجویز کردہ طریقہ کیا ہے؟

جواب: مختلف افراد، طبقات یا گروہوں کے درمیان حقوق کے باہمی تصادم اور ٹکراؤ کی صورت میں اسلام انصاف، عدل اور قانون کے تقاضوں کو ملحوظ رکھنے کا حکم دیتا ہے اور کسی فریق کی ناجائز طرف داری سے روکتا ہے۔ اسی طرح وہ متصادم گروہوں کے درمیان مفاہمت اور مصالحت کا ماحول قائم کرنے پر زور دیتا ہے اور ثالثی، محاکمہ اور گفت و شنید کے ذریعے ایک دوسرے کو قریب لانا اسلامی تعلیمات کا ایک مستقل باب ہے۔

عدل و انصاف کو قائم رکھنے اور افراد اور طبقات کو ایک دوسرے کی زیادتی سے بچانے کے حوالے سے سب سے زیادہ ذمہ داری حکمرانوں پر عائد ہوتی ہے۔ اس ضمن میں خلفائے اسلام کے بہت سے واقعات بطور مثال پیش کیے جاسکتے ہیں۔ حافظ ابن کثیر نے ''البدایہ والنہایہ'' میں نقل کیا ہے کہ فتح بیت المقدس کے موقع پر حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ شہر کا دورہ کرتے ہوئے مسیحیوں کی ایک عبادت گاہ میں گئے اور وہاں نماز کا وقت آگیا تو وہ نماز کی ادائیگی کے لیے باہر آگئے اور الگ جگہ نماز ادا فرمائی۔ اس پر بعض ساتھیوں نے دریافت کیا کہ امیر المومنین! وہ بھی تو عبادت گاہ

تھی۔ اس جگہ نماز ادا کرنے میں کیا حرج تھا؟ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ اگر میں اس جگہ نماز ادا کر لیتا تو بعد میں تم نے وہاں مستقل قبضہ کر لینا تھا کہ یہاں ہمارے امیر المومنین نے نماز ادا کی ہے، اس لیے ہم اس جگہ مسجد بنائیں گے۔ میں اس بات کو پسند نہیں کرتا کہ دوسرے مذاہب کی عبادت گاہوں پر اس طرح قبضہ کیا جائے۔

حضرت عمر بن عبد العزیزؒ نے خلافت کا منصب قبول کیا اور ذمہ داریاں سنبھال کر گزشتہ حکومتوں کے مظالم کی تلافی کا سلسلہ شروع کیا تو ان کے عدل و انصاف کے واقعات سن کر سمرقند کے غیر مسلم باشندوں کا ایک وفد ان کی خدمت میں حاضر ہوا اور شکایت کی کہ اب سے پندرہ سال قبل جب مسلم کمانڈر قتیبہ بن مسلم نے سمرقند فتح کیا تو اس شہر پر حملے سے قبل اسلامی احکام کے مطابق نہ تو انہیں اسلام کی دعوت دی اور نہ ہی دوسری شرائط پیش کیں بلکہ اچانک حملہ کر کے فتح کر لیا، اس لیے وہ سمجھتے ہیں کہ ان کے ساتھ ناانصافی ہوئی ہے اور اس کی تلافی ہونی چاہیے۔ سمرقند کی فتح حضرت عمر بن عبد العزیزؒ کے خلیفہ بننے سے پندرہ برس قبل ہوئی تھی، لیکن انہوں نے اسے ماضی کے حوالے سے ٹالنے کی بجائے غیر مسلموں کی شکایت کی تلافی ضروری سمجھی اور جمیع بن حاضر الباجی کو اس شکایت کی انکوائری اور تصفیے کے لیے خصوصی قاضی مقرر کر دیا۔ انہوں نے تحقیقات کے بعد شکایت کو درست پایا تو اس پر فیصلہ صادر کر دیا کہ شہر پر قبضہ چونکہ اسلامی احکام کے مطابق نہیں ہوا، اس لیے مسلم افواج سمرقند شہر خالی کر دیں، چنانچہ قاضی کا فیصلہ نافذ ہو گیا اور اسلامی افواج اس عدالتی فیصلے کا احترام کرتے ہوئے پندرہ سال قبل فتح کیا ہوا شہر خالی کر کے باہر کھلے میدان میں نکل آئیں۔

تشخص اور تنوع

(۱) کیا "مسلم تشخص" نام کی کوئی چیز موجود ہے؟ ایک غیر مسلم ریاست میں رہتے ہوئے مسلمان اپنے مذہبی تشخص اور اعتقادات کے ساتھ کس طرح وابستہ رہ سکتے ہیں؟ اس ریاست سے متعلق ان کی ذمہ داریاں کیا ہیں؟

جواب: "مسلم تشخص" یہی ہے کہ دنیا بھر کے مسلمان ایک عقیدہ پر قائم ہیں، قرآن و سنت کے ساتھ واضح کمٹمنٹ رکھتے ہیں، اپنی تہذیبی شناخت کو باقی رکھنے پر مصر ہیں، خاندانی نظام میں مذہبی احکام سے ہٹ کر کسی مداخلت کو قبول کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں، ان کی مساجد و مکاتب اور دینی

تعلیم کا بنیادی نظام یکساں ہے اور وہ دینی روایات کے ساتھ وابستہ ہیں۔ ان تمام معاملات میں دنیا بھر کے مسلمانوں میں پائی جانے والی یکسانیت واضح طور پر نظر آنے والی معروضی حقیقت ہے اور سب سے بڑھ کر اپنے مرکز بیت اللہ شریف اور مدینہ منورہ میں بلاامتیاز حاضری دے کر ایک ہی طریقے سے اپنی کمٹمنٹ کا مسلسل اظہار کرتے رہتے ہیں۔

ایک مسلمان کے کسی غیر مسلم ملک (مثلاً برطانیہ) کا شہری ہونے کا مطلب اسلامی تعلیمات کی رو سے یہ ہے کہ وہ:

- خود کو برطانیہ کا شہری تصور کرے۔
- جس معاہدے کے تحت وہ شہری بنا ہے، اس کی پابندی کرے۔
- قانون و دستور اور سسٹم کو چیلنج نہ کرے۔
- اپنے مذہب اور کلچر پر برقرار رہنے کے مسلمہ حق سے دست بردار نہ ہو۔
- ملکی قانون کے دائرے میں رہتے ہوئے اپنے مذہبی احکام پر عمل کرے اور اپنے دیگر مسلمان برادران وطن بلکہ ملک سے باہر کے مسلمانوں کے ساتھ بھی بھائی چارے اور باہمی تعاون و حمایت کا قانونی حق استعمال کرے، البتہ قانون اور سسٹم کو چیلنج نہ کرے اور اس حوالے سے میرے نزدیک دنیا کے کسی ملک میں رہنے والے مسلمانوں کو وہ تمام حقوق حاصل ہیں جن حقوق کو یہودی اس ملک کے قانون کی پابندی اور عالمی سطح پر یہودیوں کے مفادات و حقوق کے لیے استعمال کر رہے ہیں۔
- ملک کے سیاسی نظام میں شریک ہوں اور مسلمانوں کے حقوق و مفادات کے ساتھ ساتھ ملک کی عمومی آبادی اور عام شہریوں کے حقوق و مفادات کے تحفظ اور ملک و قوم کے اجتماعی مفاد کے لیے کردار ادا کرے۔
- اگر ملک کے دستور و قانون میں کوئی بات اپنے عقیدہ اور مسلمہ حق کے خلاف سمجھتا ہے تو اس کے لیے معروف طریقوں سے آواز اٹھائے، لابنگ کرے اور پالیسی سازوں کو اپنے موقف پر قائل کرنے کی ہر ممکنہ صورت اختیار کرے۔

(۲) کیا وقت کے ساتھ ساتھ 'تشخص' کے بدلنے کے حوالے سے

کوئی اسلامی نقطہ نظر موجود ہے جس میں اس امر کی گنجائش مانی جاتی ہو کہ ''کسی ملک (مثلاً برطانیہ) کا شہری ہونے کا کیا مطلب ہے؟'' کے سوال کا جواب مختلف طریقوں سے دیا جا سکتا ہے؟

جواب: اسلام ایک مسلمان کے بنیادی تشخص (مثلاً اسلام پر قائم رہنے اور قرآن و سنت کے ساتھ اپنی کمٹمنٹ برقرار رکھنے) میں تغیر کو قبول نہیں کرتا اور ہر حال میں ایک مسلمان کو اس کی پابندی کا حکم دیتا ہے، البتہ وقت کے ساتھ ساتھ تشخص و تنوع میں جزوی تغیر کو اسلام تسلیم کرتا ہے اور یہ فطری بات ہے۔ آج کے عالمی ماحول کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہ گلوبلائزیشن کا دور ہے اور تہذیبوں کے اختلاط کا دور ہے کیونکہ فاصلے اس قدر سمٹ گئے ہیں کہ تہذیبوں اور ثقافتوں کے درمیان صدیوں سے قائم سرحدیں پامال ہوتی چلی جا رہی ہیں۔ آج کے دور میں جبکہ تہذیبوں اور ثقافتوں کے درمیان حدود اور فاصلوں کو برقرار رکھنا ممکن نہیں رہا، منطقی طور پر یہ مسئلہ کھڑا ہو گیا ہے کہ مختلف تہذیبوں کے اختلاط کے دور میں اسلام کیا راہ نمائی کرتا ہے؟ جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات وارشادات میں اس بارے میں واضح راہ نمائی موجود ہے اور احادیث کے ذخیرے میں بہت سی روایات پائی جاتی ہیں۔

مثال کے طور پر بخاری شریف کی ایک روایت کا حوالہ دینا چاہوں گا جو امام بخاریؒ نے کتاب النکاح، باب عظة الرجل بنتہ اور بعض دیگر ابواب میں بیان کی ہے اور اس تفصیلی روایت کا خلاصہ یہ ہے کہ قریش کے بہت سے خاندان مکہ مکرمہ سے ہجرت کر کے مدینہ منورہ آئے تو مہاجرین اور انصار کی خاندانی روایات میں واضح فرق موجود تھا۔ مہاجرین کے ہاں کسی عورت کا خاوند کو کسی بات پر ٹوکنا یا اس کی کسی بات کو رد کرنا سرے سے متصور نہیں تھا جبکہ انصار کے خاندانوں میں عورتوں کو یہ آزادی حاصل تھی کہ وہ خاوند کو کسی بات پر ٹوک سکتی ہیں، کسی بات کا جواب دے سکتی ہیں اور کسی بات سے انکار بھی کر سکتی ہیں۔ حضرت عمرؓ اپنا واقعہ بیان کرتے ہیں کہ انہیں ایک روز ان کی بیوی نے کسی بات پر ٹوک دیا تو انہیں بہت غصہ آیا اور انہوں نے بیوی کو ڈانٹا۔ بیوی نے جواب دیا کہ مجھے ڈانٹنے کی ضرورت نہیں، یہ تو جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے گھر میں بھی ہوتا ہے کہ ان کی ازواج مطہرات کسی بات پر ٹوک دیتی ہیں اور کسی بات کا جواب بھی دے دیتی ہیں۔ حضرت عمرؓ نے اسے اس بات سے تعبیر کیا

کہ انصار کی عورتوں کی عادات ہماری عورتوں پر اثرانداز ہوتی جا رہی ہیں چنانچہ حضرت عمرؓ اسی غصے کی حالت میں سیدھے ام المومنین حضرت حفصہؓ کے گھر پہنچے جو ان کی بیٹی تھیں اور انہیں سمجھایا بجھایا کہ ایسا مت کیا کرو۔ وہ تو بیٹی تھیں، خاموش رہیں مگر یہی بات جب حضرت عمرؓ نے ام المومنین حضرت ام سلمہؓ سے کہنا چاہی تو انہوں نے آگے سے یہ کہہ کر ٹوک دیا کہ ''آپ نے میاں بیوی کے معاملات میں بھی مداخلت شروع کر دی ہے؟'' حضرت عمرؓ نے یہ واقعہ جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں تفصیل کے ساتھ ذکر کیا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے جواب میں ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ صرف یہ فرمایا کہ ''آخر ام سلمہ ہے''۔

یہ دو علاقائی ثقافتوں اور معاشرتی روایات کے اختلاط اور ٹکراؤ کا قصہ ہے اور میری طالب علمانہ رائے ہے کہ تہذیبوں کے اختلاط اور مختلف ثقافتوں کے باہمی میل جول کے مسائل میں یہ روایت اصولی اور بنیادی حیثیت رکھتی ہے جس سے ہمیں راہ نمائی حاصل کرنی چاہیے اور دور نبوی کے اس طرز کے واقعات اور روایات و احادیث کی روشنی میں آج کے عالمی حالات کے تناظر میں اصول و ضوابط وضع کرنے چاہئیں کہ مختلف تہذیبوں اور ثقافتوں کے تال میل میں کہاں ایڈجسٹ منٹ کی گنجائش ہے، کہاں صاف انکار کی ضرورت ہے اور کہاں کوئی درمیان کا راستہ نکالا جا سکتا ہے۔ اس ضمن میں یہ واضح رہنا چاہیے کہ دین اور ثقافت میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ ان کے درمیان حدِ فاصل قائم رہنی چاہیے اور دونوں کو گڈمڈ نہیں کرنا چاہیے۔ دین کی بنیاد آسمانی تعلیمات پر ہے اور اس کا سرچشمہ وحی الٰہی ہے جبکہ ثقافت کی بنیاد ایک علاقہ میں رہنے والے لوگوں کے درمیان خود بخود تشکیل پا جانے والی معاشرتی اقدار و روایات پر ہوتی ہے اور اس کا سرچشمہ سوسائٹی اور اس کا ماحول ہوتا ہے۔ اگر علاقائی ثقافتوں پر دین و شریعت کا لیبل لگا کر انہیں ساری دنیا سے ہر حال میں منوانے کی جائے گی تو اس سے طرح طرح کے مسائل پیدا ہوں گے۔

(۳) عالمی سطح پر (مثلاً برطانیہ، یورپ کے باقی ممالک اور وسیع تر دنیا کے مابین) باہمی تعلقات کے بارے میں اسلام کا نقطہ نظر کیا ہے؟ کیا دنیا کے ایک عالمی کمیونٹی ہونے کے حوالے سے اسلام کوئی منفرد نقطہ نظر رکھتا ہے؟

جواب: اسلام خود گلوبل سوسائٹی کا علم بردار ہے، کیونکہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے دین کی

دعوت کے لیے پوری نسل انسانی کو خطاب کیا ہے اور حجۃ الوداع کے خطبے میں (دنیا کی تاریخ میں پہلی بار) گلوبل انسانی سوسائٹی کے خدوخال واضح کیے ہیں اور اس کے بنیادی اصول بیان فرمائے ہیں، البتہ اسلام گلوبل سوسائٹی کی نظریاتی بنیاد آسمانی تعلیمات کو سمجھتا ہے اور قرآن و سنت کو اس کی محفوظ اور فائنل شکل قرار دیتا ہے جیسا کہ مغرب ویسٹرن کلچر کو گلوبل سوسائٹی کی بنیاد قرار دیتا ہے اور اسے دنیا بھر سے منوانے کے لیے ہر جائز و ناجائز حربہ استعمال کر رہا ہے۔

(۴) کیا ایک یکجان اور آپس میں جڑی ہوئی کمیونٹی وجود میں لانے کے بارے میں کوئی اسلامی نقطہ نظر پایا جاتا ہے؟

جواب: آسمانی تعلیمات کے معاشرتی کردار کی نفی اور وحی الٰہی سے انحراف کی بنیاد پر کمیونٹی کے باہمی اتحاد کو اسلام قبول نہیں کرتا۔

(۵) اسلام میں رضا کارانہ خدمت اور (غریبوں کی) مالی امداد اتنی اہم کیوں ہے؟

جواب: وحی الٰہی اور آسمانی تعلیمات نے ہر دور میں انسان کو راستی کی تعلیم دی ہے، امن کا راستہ دکھایا ہے، باہمی محبت اور رواداری کا سبق دیا ہے، ایک دوسرے کے حقوق ادا کرنے کی تلقین کی ہے، نادار اور بے سہارا افراد کی خدمت پر آمادہ کیا ہے، سچائی اور دیانت و امانت کو انسانی سوسائٹی کی اساسی اقدار قرار دیا ہے اور حیا و پاک دامنی کو انسان کا زیور بتایا ہے۔ بائبل اور قرآن کریم کے سینکڑوں اوراق وحی الٰہی کی ان تعلیمات پر گواہ ہیں اور حضرات انبیاء کرام علیہم الصلوات والتسلیمات کے متعدّد ارشادات مقدس کتابوں میں اس حوالہ سے موجود و محفوظ ہیں۔ ہم اس حوالے سے جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ میں سے دو حوالے دینا مناسب سمجھیں گے:

ایک یہ کہ بخاری شریف کی روایت کے مطابق جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پہلی وحی کے نزول کے بعد غار حرا سے اتر کر گھر آئے اور اس اچانک واقعہ پر کچھ گھبراہٹ کا اظہار کیا تو ام المومنین حضرت خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ عنہا نے آپ کو یہ کہہ کر تسلی دی کہ گھبرائیں نہیں، اس لیے کہ آپ

"۱۔ صلہ رحمی کرتے ہیں، ۲۔ ناداروں اور بے سہارا لوگوں کا سہارا بنتے ہیں، ۳۔ مہمانوں اور مسافروں کی خدمت کرتے ہیں، ۴۔ ناگہانی آفتوں میں لوگوں کی مدد کرتے ہیں، ۵۔ محتاجوں کو کما کر کھلاتے ہیں۔"

دوسرا حوالہ اس موقع کا ہے جب بخاری شریف ہی کی روایت کے مطابق سلطنت روما کے فرمانروا شاہ ہرقل کے نام جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا مکتوب گرامی پہنچا اور شاہ ہرقل نے عرب دنیا میں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے اس وقت کے سب سے بڑے حریف جناب ابوسفیانؓ کو دربار میں بلا کر ان سے حضرت محمد کے بارے میں معلومات حاصل کیں تو جناب ابوسفیان نے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات اور پیغام کا تعارف قیصر روم کے دربار میں ان الفاظ میں کرایا کہ:

۱. وہ ہمیں اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کا عقیدہ رکھنے کی تلقین کرتے ہیں،
۲. اللہ تعالیٰ کی بندگی اور نماز کا حکم دیتے ہیں،
۳. سچائی کی تلقین کرتے ہیں،
۴. صلہ رحمی کو ضروری قرار دیتے ہیں،
۵. اور پاک دامن رہنے کا سبق دیتے ہیں۔

سوسائٹی اور تمدن کا قیام چونکہ انسانی فطرت کا تقاضا ہے اور سوسائٹی اور تمدن کی بنیاد باہمی تعاون پر ہے، اس لیے باہمی تعاون کی رضاکارانہ صورتوں کو اسلام نہ صرف ضروری قرار دیتا ہے، بلکہ انہیں مذہبی فرائض میں شمار کرتا ہے اور ان سے انحراف کو گناہ اور جرم تصور کرتا ہے، جیسا کہ ایک حدیث نبوی میں ہے کہ:

> ”جو شخص خود پیٹ بھر کر رات کو سویا رہا اور اس کے پڑوسی نے بھوک کی حالت میں رات گزار دی، جبکہ اسے اس کے بارے میں معلوم بھی ہے تو ایسے شخص کو مومن کہلانے کا حق حاصل نہیں ہے۔“

اسی طرح اور بھی بہت سی احادیث ہیں جن میں سماجی ضروریات اور خدمات سے غفلت برتنے کو مذہبی طور پر گناہ اور جرم قرار دیا گیا ہے۔ ہم سمجھتے ہیں کہ حضرات انبیائے کرام علیہم السلام کی تعلیمات کا یہی خلاصہ ہے۔ نسل انسانی نے جس دور میں بھی ان تعلیمات کو اپنایا ہے، اسے سکون واطمینان کی وافر دولت ملی ہے اور انسانوں نے باہمی محبت و اعتماد کی زندگی بسر کی ہے اور جب بھی ان آسمانی تعلیمات کے بارے میں افراط وتفریط سے کام لیا گیا ہے، انسانی سوسائٹی میں امن اور سکون کا توازن بگڑ گیا ہے۔

(۶) صنفی مساوات کے حوالے سے اسلام کا نقطہ نظر کیا ہے؟

جواب: اسلام مرد اور عورت کو سوسائٹی اور تمدن کی دو ناگزیر بنیادیں تصور کرتا ہے اور باہمی برتری اور فضیلت کے لیے بر و تقویٰ کو بنیاد قرار دیتا ہے، لیکن معاشرتی معاملات میں دونوں کے درمیان مکمل فطری مساوات کا قائل نہیں ہے اور اس کے نزدیک یہ غیر فطری اور مصنوعی بات ہے، اس لیے کہ مرد اور عورت کی جسمانی تخلیق، نفسیات اور ان کے فطری فرائض میں ایسا تنوع موجود ہے جس سے نہ تو انکار کیا جا سکتا ہے اور نہ ہی اسے تبدیل کرنے کی کوئی صورت ممکن ہے۔ مرد اور عورت کے درمیان جسمانی تخلیق، نفسیاتی رجحانات اور فطری ذمہ داریوں میں جو واضح فرق موجود ہے، اسلام ان کے باہمی حقوق و فرائض کے تعین و تقسیم میں اسی کو بنیاد قرار دیتا ہے اور اس کے مطابق دونوں کے لیے احکام و قوانین میں اس نے فرق و امتیاز قائم رکھا ہے۔

اسلام نے عورت کے معاشی حقوق اور تحفظات کا متوازن نظام پیش کیا ہے۔ یہ شعبہ ایسا ہے جہاں بڑے بڑے نظام افراط و تفریط کا شکار ہو گئے ہیں، لیکن اسلام نے اعتدال اور توازن کا اصول یہاں بھی پوری طرح قائم رکھا ہے۔ اسلام نے فرائض کی ایک فطری تقسیم کر دی ہے کہ گھر کے اندر کی ذمہ داری عورت کی ہے اور باہر کی ذمہ داری مرد پر ہے اور مرد و عورت کی خلقت میں فطرت نے جو طبعی فرق رکھا ہے، اس کو برقرار رکھتے ہوئے اس کے سوا کوئی تقسیم ممکن ہی نہیں ہے۔ چونکہ گھر کے اندر کا نظام عورت کی سپرداری میں ہے، اس لیے باہر کی کوئی ڈیوٹی اس کے سپرد کرنا اس پر ظلم ہے۔ اسی لیے عورت کے تمام اخراجات مرد کے ذمہ لگا دیے گئے ہیں اور ان اخراجات کے سلسلہ میں عورت کو عدالتی تحفظات بھی فراہم کیے گئے ہیں تاکہ کوئی مرد اس معاملے میں عورت کے ساتھ ناانصافی نہ کر سکے۔ تاہم اس کا مطلب یہ نہیں کہ اسلام عورت کے ملازمت کرنے پر کلی پابندی لگاتا ہے۔ ہرگز نہیں! بلکہ اسلام عورت کو ایسی ہر ملازمت کی اجازت دیتا ہے جس سے اس پر اس کی طاقت و صلاحیت سے زیادہ بوجھ نہ پڑے۔

اسی طرح اسلام کے نزدیک ''خاندان'' سوسائٹی کی بنیادی اکائی ہے جس کا تحفظ ضروری ہے اور خاندان کا یونٹ اس کے سوا قائم نہیں رہ سکتا کہ رشتوں کا تقدس تسلیم کیا جائے، مرد و عورت کے کسی ایسے باہمی میل جول کی حوصلہ افزائی نہ کی جائے جس کے نتیجے میں آزادانہ جنسی ملاپ اور رشتوں کے

تقدس کی پامالی اور خاندان کے بکھر جانے کی صورت پیدا ہو جائے۔ نیز خاندان کے یونٹ کا ڈسپلن اور نظم برقرار رکھنے کے لیے ضروری ہے کہ گھر کے سسٹم میں فائنل اتھارٹی ایک ہو، اس لیے اسلام خاندان کے نظام میں مرد کی برتری کی تعلیم دیتا ہے، البتہ مرد کی سنیارٹی کو خاندان کے تحفظ کی ضمانت قرار دیتے ہوئے عورت کو وہ تمام حقوق فراہم کرتا ہے جو ایک شہری، ایک مسلمان اور سوسائٹی کے ایک فرد کے طور پر اس کے لیے ضروری ہیں۔ نسل انسانی کی نشوونما اور ترقی میں عورت کا بھی اتنا ہی عمل دخل ہے جتنا مرد کا ہے، اس لیے اسلام نے عورت کے وجود کو نہ صرف تقدس واحترام بخشا بلکہ ان کی اہمیت وافادیت کا بھرپور اعتراف کیا ہے اور اسے ان تمام حقوق اور تحفظات سے نوازا ہے جو مرد اور عورت کے فطری فرائض کی تکمیل کے لیے ضروری ہیں۔

مثال کے طور پر آزادی رائے کو انسانی حقوق میں بنیادی اہمیت حاصل ہے۔ تاریخ یہ منظر پیش کرتی ہے کہ مدینہ منورہ میں ایک بوڑھی خاتون خولہ بنت حکیمؓ امیر المومنین حضرت عمرؓ کو سرعام روک کر کھڑی ہے اور کہہ رہی ہے: ”عمر! وہ دن یاد رکھو جب تمہیں عکاظ کے بازار میں صرف عمر کے نام سے یاد کیا جاتا تھا اور آج تم امیر المومنین کہلاتے ہو، اس لیے خدا سے ڈرتے رہو اور انصاف کا دامن مضبوطی سے پکڑے رہو“۔ حضرت عمرؓ اس بڑھیا کے سامنے سر جھکائے کھڑے ہیں اور اپنے عمل کے ساتھ دنیا کو بتا رہے ہیں کہ انسانی معاشرہ میں مرد کی طرح عورت کو بھی یہ حق حاصل ہے کہ راہ چلتے امیر المومنین کا راستہ روک کر کھڑی ہو جائے اور انصاف کی طلب گار ہو۔

اسلام مرد کی طرح عورت کو بھی یہ حق دیتا ہے کہ وہ اپنے جائز حق کے لیے ڈٹ جائے اور اس کے خلاف کسی بڑے سے بڑے دباؤ کی پروانہ کرے۔ حضرت عائشہؓ کی باندی بریرہ کو آزاد ہونے کے بعد شرعی طور پر یہ حق حاصل ہو گیا تھا کہ وہ اپنے سابقہ خاوند مغیثؓ کے ساتھ نہ رہنا چاہے تو اس سے الگ ہو جائے۔ بریرہؓ نے اپنا یہ حق استعمال کیا تو مغیثؓ پریشان ہو گئے۔ وہ مدینہ کی گلیوں میں روتے پھرتے تھے اور کہتے تھے کہ کوئی ہے جو بریرہؓ کو دوبارہ میرے ساتھ رہنے پر آمادہ کرے؟ اس کی حالت دیکھ کر خود جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بریرہ سے بات کی اور اسے اپنے فیصلہ پر نظر ثانی کے لیے کہا۔ بریرہؓ نے صرف یہ پوچھا کہ یا رسول اللہ! یہ آپ کا حکم ہے یا مشورہ ہے؟ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ صرف مشورہ ہے، تو بریرہؓ نے دوٹوک کہہ دیا کہ میں یہ مشورہ قبول نہیں کر سکتی۔

چنانچہ بریرہؓ مغیثؓ سے الگ رہنے کے فیصلے پر قائم رہی اور اپنے عمل کے ساتھ اسلام کا یہ اصول دنیا کے سامنے پیش کیا کہ عورت اپنے جائز حق سے اَز خود دستبردار نہ ہونا چاہے تو اسے اس کے حق سے کسی صورت میں محروم نہیں کیا جاسکتا۔

خلافت راشدہ کے دور میں عورت اجتماعی معاملات میں بھی مشاورت کے دائرہ میں شامل رہی ہے، بالخصوص ازواج مطہرات رضوان اللہ علیہن کو تو اس دور میں امت مسلمہ کی اجتماعی راہ نمائی کا مقام حاصل تھا۔ اہم امور میں ان سے مشورہ کیا جاتا تھا اور ان سے اجتماعی معاملات میں راہ نمائی حاصل کی جاتی تھی، حتیٰ کہ ایک موقع پر مدینہ منورہ کے عامل امیر مروان بن حکمؓ نے یہاں تک کہہ دیا کہ ''جب تک ازواج مطہرات موجود ہیں، ہمیں دوسرے لوگوں سے مسائل دریافت کرنے کی ضرورت ہی کیا ہے!'' اور عورتوں سے متعلقہ امور میں تو مشورہ ہی عورتوں سے کیا جاتا تھا۔ مشہور تاریخی واقعہ ہے کہ حضرت عمر بن الخطابؓ نے ام المومنین حضرت حفصہؓ کے ذمہ لگایا کہ وہ سمجھدار عورتوں سے مشورہ کر کے بتائیں کہ ایک عورت خاوند کے بغیر کتنا عرصہ آسانی کے ساتھ گزار سکتی ہے۔ چنانچہ ان کی رائے پر حضرت عمرؓ نے حکم جاری کیا کہ ہر فوجی کو چھ ماہ کے بعد کچھ دنوں کے لیے ضرور گھر بھیجا جائے۔

خلافت راشدہ کے دور میں خواتین کو علم حاصل کرنے اور تعلیم دینے کے آزادانہ مواقع میسر تھے۔ حضرت عائشہؓ اور ان کے ساتھ بیسیوں خواتین کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات امت تک پہنچانے کا شرف حاصل ہے۔ ان کے شاگردوں میں مرد بھی تھے اور عورتیں بھی تھیں۔ وہ نہ صرف احادیث بیان کرتی تھیں، بلکہ فتویٰ بھی دیتی تھیں اور ان کے فتوے پر عمل کیا جاتا تھا۔ ام المومنین حضرت عائشہؓ سے جو فتاویٰ منقول ہیں، ان سے ایک بڑا مجموعہ مرتب ہو سکتا ہے۔ حضرت عائشہؓ سے بڑے بڑے علماء صحابہ مسائل میں رجوع کرتے تھے اور اپنے اشکالات کا تسلی بخش جواب پاتے تھے۔ اسی طرح حضرت ام سلمہؓ سے بھی علمی معاملات میں رجوع کیا جاتا تھا۔ الغرض علم اور افتاء کا میدان بھی خواتین کے لیے کھلا تھا اور اس میں ان کی اہمیت تسلیم کی جاتی تھی۔

الغرض اسلام عورت کو انسانی زندگی کی گاڑی کا برابر کا پہیہ تسلیم کرتا ہے اور اس کو وہ تمام حقوق دیتا ہے جو انسانی معاشرہ میں اپنا فطری کردار ادا کرنے کے لیے اسے درکار ہیں، البتہ فرائض کی تقسیم وہ مرد اور عورت کے طبعی تقاضوں اور فطری ضروریات کو سامنے رکھ کر کرتا ہے اور عورت کو ہر ایسے عمل

سے روکتا ہے جو اس کے نسوانی وقار، فطری ذمہ داریوں اور طبعی مناسبت کے منافی ہو اور اسلام کا یہ اصول حق تلفی نہیں بلکہ عین انصاف ہے جس کے بغیر انسانی معاشرت کو متوازن رکھنا ممکن ہی نہیں ہے۔

جستجو، تنقیدی غور و فکر اور اختلاف رائے

(۱) اسلام جستجو اور تنقیدی غور و فکر کو کیسے پروان چڑھاتا ہے تاکہ نوجوان نسل مختلف آرا اور آپشنز میں ذہنی دلچسپی لے اور ان پر غور کر سکے؟

(۲) کیا تحقیق اور جستجو کے حوالے سے کوئی اسلامی اپروچ پائی جاتی ہے؟

(۳) اسلام طالب علموں کو اپنا استدلال پیش کرنے اور اپنی رائے کو بیان اور واضح کرنے کے حوالے سے کیا مدد فراہم کر سکتا ہے؟

(۴) اسلام نوجوانوں کو دوسرے کے ایسے خیالات کو سمجھنے اور انہیں بیان کرنے کے حوالے سے کیا مدد دے سکتا ہے جن سے ضروری نہیں کہ وہ متفق ہوں؟

جواب: قرآن کریم غور و فکر کی دعوت دیتا ہے، تاریخ کے حوالے سے بھی، اقوام کے عروج و زوال کے حوالے سے بھی، اردگرد کے زمینی اور ماحولیاتی حقائق کے مشاہدہ کے حوالے سے بھی، آیات قرآنی پر تدبر کے حوالے سے بھی، کائنات کے مشاہدات اور سائنسی ارتقا کے حوالے سے بھی اور سوسائٹی کے مسائل پر بحث و مباحثہ کے حوالے سے بھی۔ اسلام سوسائٹی کے ہر فرد کا یہ حق تسلیم کرتا ہے کہ وہ اپنے حق کے لیے آواز اٹھائے، حکمرانوں اور مقتدر طبقات پر تنقید کرے اور سوسائٹی کے مفاد کے لیے ہر سطح پر مشورہ دے۔ اسلام جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کسی کا یہ مقام تسلیم نہیں کرتا کہ اس کی بات حرف آخر ہے۔ وہ خلفائے راشدین کو بھی مجتہد کے درجے میں تسلیم کرتا ہے جن کی ہر بات میں خطا اور صواب دونوں کا احتمال موجود ہے اور ان کے کسی بھی فیصلے اور رائے سے اختلاف کی نہ صرف گنجائش موجود ہے، بلکہ بے شمار لوگوں نے ان کی بہت سی آرا سے عملاً اختلاف کیا ہے اور علمی اختلاف سے اسلامی کتب بھری پڑی ہیں۔ اسلام بنیادی طور پر تحقیق و جستجو کا دین ہے اور ایسے معاملات میں اسلامی لٹریچر سے ہزاروں مثالیں پیش کی جا سکتی ہیں۔

اختلاف رائے انسانی فطرت کا اظہار اور عقل و دانش کا خوش ذائقہ ثمر ہے جو اپنی جائز حدود کے اندر اور جائز طریقہ سے ہو تو جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد کے مطابق امت کے لیے رحمت بن جاتا ہے اور اسے حضرت عمر بن عبد العزیز رحمہ اللہ تعالیٰ نے نہایت خوب صورت انداز میں یوں بیان فرمایا ہے کہ اگر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے درمیان مسائل میں اختلاف نہ ہوتا تو مجھے یہ بات بالکل اچھی نہ لگتی، کیونکہ اس طرح امت ہر مسئلہ میں ایک لگے بندھے راستے پر چلنے کی پابند ہو جاتی۔ اب اختلاف ہے، ایک ایک مسئلہ میں چار چار پانچ پانچ قول ہیں، تنوع ہے، چوائس ہے اور امت کے ارباب علم و دانش اپنے اپنے فہم، ذوق، ضرورت، حالات اور سہولت کے مطابق ان میں سے کسی ایک کے انتخاب کا حق رکھتے ہیں جس سے علم و دانش کی دنیا رنگا رنگ خوش نما پھولوں کے ایک چمنستان کا روپ اختیار کر گئی ہے۔

اسلام گفتگو اور مکالمہ میں انصاف کے تقاضوں کو ملحوظ رکھنے کی ہدایت بھی کرتا ہے اور دوسروں کے موقف کو صحیح طور پر دیانت داری کے ساتھ سمجھنا، بیان کرنا اور دلیل کے ساتھ اس کا جواب دینا "وجادلهم بالتی ہی احسن" (النحل) کا مصداق ہے جو اس سلسلے میں قرآن کریم کی ہدایت ہے۔ اسی طرح مقابل فریق کے طرز عمل کی خامیوں کی نشان دہی کرنے کے ساتھ ساتھ اس کی خوبیوں کا اعتراف کرنا بھی اسلامی اخلاقیات کا حصہ ہے۔

صحیح مسلم کی روایت ہے کہ حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کی مجلس میں ایک روز مستورد قرشی رضی اللہ عنہ بیٹھے تھے۔ انہوں نے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ ”قیامت سے پہلے رومی لوگوں کی تعداد سب سے زیادہ ہوگی۔“ روم اس دور میں مسیحی سلطنت کا پایہ تخت تھا اور رومیوں سے عام طور پر مغرب کے مسیحی حکمران ہوتے تھے۔ حضرت عمرو بن العاصؓ نے سنا تو چونکے اور پوچھا کہ ”دیکھو! کیا کہہ رہے ہو؟“ مستورد قرشیؓ نے کہا کہ میں وہی کہہ رہا ہوں جو میں نے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے۔ حضرت عمرو بن العاصؓ نے فرمایا کہ اگر ایسی بات ہے تو پھر ان رومیوں میں چار خصلتیں موجود ہوں گی (جن کی وجہ سے وہ انسانی سوسائٹی پر غالب آئیں گے):

۱۔ پہلی یہ کہ وہ فتنے اور آزمائش کے وقت دوسرے لوگوں سے زیادہ تحمل اور بردباری کا مظاہرہ کریں گے۔

۲۔ دوسری یہ کہ وہ مصیبت گزر جانے کے بعد سنبھلنے میں دوسرے لوگوں سے زیادہ تیز ہوں گے۔

۳۔ تیسری یہ کہ وہ شکست کے بعد دوبارہ جلدی حملہ آور ہونے والے ہوں گے۔

۴۔ چوتھی یہ کہ وہ اپنے یتیموں، مسکینوں اور کمزوروں کے لیے اچھے لوگ ثابت ہوں گے۔

اتنا کہہ کر حضرت عمرو بن العاصؓ نے فرمایا کہ ان میں ایک اور پانچویں خصلت بھی ہوگی جو اچھی اور خوب ہوگی کہ وہ لوگوں کو حکمرانوں کے مظالم سے روکنے میں پیش پیش ہوں گے۔ (مسلم، رقم ۷۲۷۹)

آج مغرب سے ہمیں شکوہ ہے کہ مغرب ہمارے خلاف صف آرا ہے اور ہمیں اپنا سب سے بڑا حریف سمجھ کر زیر کرنے کے لیے جو کچھ وہ کر سکتا ہے، کر رہا ہے۔ مغرب سے ہمیں یہ بھی شکایت ہے کہ وہ ہم پر اپنی ثقافت مسلط کرنے کی کوشش کر رہا ہے اور انسانی حقوق کے خود ساختہ فلسفے کے ہتھیار سے ہماری اخلاقی، دینی اور معاشرتی اقدار کو ملیا میٹ کرنے کے درپے ہے۔ یہ سب شکایات بجا ہیں، لیکن ہمیں حضرت عمرو بن العاصؓ کے مذکورہ ارشاد کے حوالے سے مغرب کے ساتھ اپنا تقابل بھی کر لینا چاہیے کہ

۱۔ مصیبت اور مشکل کے وقت مغربی اقوام اور ہمارے طرزِ عمل میں کیا فرق ہوتا ہے؟

۲۔ مصیبت کے گزر جانے کے بعد سنبھلنے میں ہم کتنا وقت لیتے ہیں؟

۳۔ شکست کے بعد اس کی تلافی کرنے یا ماتم کرتے رہنے میں سے ہم کون سا راستہ اختیار کرتے ہیں؟

۴۔ معاشرہ کے نادار اور بے سہارا لوگوں کی کفالت کے لیے ہمارے پاس کون سا نظام موجود ہے؟

۵۔ عام لوگوں کو حکام کے مظالم اور ریاستی جبر سے بچانے کے لیے ہمارا ”معاشرتی شعور“ کس مرحلے میں ہے۔

انسانی حقوق کے حوالے سے مغرب کا گزشتہ نصف صدی کا ریکارڈ سامنے رکھا جائے تو یہ شکایت ضرور سامنے آتی ہے کہ مسلم ممالک کے بارے میں مغرب دوہرا معیار رکھتا ہے اور جن

ممالک کی حکومتیں مغرب کے مفادات کی نگہبانی کر رہی ہیں، وہاں کے عوام کے انسانی اور سیاسی حقوق کے معاملے میں مغرب نے مجرمانہ غفلت اور خاموشی اختیار کر رکھی ہے، لیکن اس سے ہٹ کر عمومی تناظر میں دیکھا جائے تو اس بات کا بھی اعتراف کرنا چاہیے کہ آج مغربی ممالک دنیا بھر کے مختلف خطوں کی حکومتوں کے ستائے ہوئے مظلوموں کی سب سے بڑی پناہ گاہ بھی ہیں اور معاشرے کے نادار اور معذور افراد کے لیے اگر زندگی کی سب سے زیادہ سہولتیں میسر ہیں تو وہ بھی انہی مغربی ممالک میں ہیں۔

درست معلومات پر مبنی اور ذمہ دارانہ عملی اقدام

(۱) معاصر دنیا میں درست معلومات پر مبنی اور ذمہ دارانہ اقدام کرنے کے بارے میں اسلام نوجوان مسلمانوں کی کیسے مدد کر سکتا ہے؟

(۲) معاصر ذرائع ابلاغ سے نبرد آزما ہونے اور سچ کو جھوٹ سے الگ کرنے کے حوالے سے اسلام نوجوان مسلمانوں کی کیسے راہنمائی کر سکتا ہے؟

جواب: قرآن کریم نے مسلمانوں کو تلقین کی ہے کہ وہ محض سنی سنائی خبروں پر کوئی فیصلہ نہ کریں جب تک کہ ان کی تحقیق نہ کر لیں، تاکہ ایسا نہ ہو کہ وہ نادانی میں کسی گروہ کو نقصان پہنچا بیٹھیں اور پھر انہیں شرمندگی کا سامنا کرنا پڑے۔ (سورۃ الحجرات) اسی طرح قرآن کریم کی ہدایت ہے کہ جو لوگ امن یا خوف کی ہر خبر کو پھیلا دیتے ہیں، ان کا رویہ غیر ذمہ دارانہ ہے اور اگر وہ خبر کی تحقیق اور اس سے صحیح نتیجہ اخذ کرنے کی صلاحیت رکھنے والوں تک خبر پہنچائیں تو یہ زیادہ بہتر ہے۔ (النساء)

(الشریعہ، جولائی ۲۰۰۸ء)

سانحہ گیارہ ستمبر اور مسلمانوں کے لیے لائحہ عمل

مسلم ممالک میں سب سے پہلے ترکی نے سیکولر فلسفہ کو دستوری طور پر قبول کیا تھا اور وہی سب سے زیادہ شدت کے ساتھ اس پر ابھی تک قائم بھی ہے، حتیٰ کہ دستور میں صراحت کے ساتھ قرآن و سنت کی راہنمائی کو مسترد کرتا ہے، لیکن ترکی کے عام مسلمان نے آج تک اس لا مذہبی فلسفہ کو قبول نہیں کیا اور عام ترکی مسلمانوں کو جب بھی موقع ملتا ہے، وہ قرآن و سنت کے ساتھ اپنی کمٹمنٹ کا کھلم کھلا اظہار کر دیتے ہیں۔ یہ بات مغرب کے حکمرانوں کے لیے پریشانی کا باعث بنی ہوئی ہے اور وہ مسلم ممالک کے دینی حلقوں کو مذہب کے ساتھ عام مسلمانوں کی اس بے لچک وابستگی کا بڑا سبب سمجھتے ہوئے انہیں بنیاد پرست اور دہشت گرد قرار دے کر ان سے نمٹنے کا فیصلہ کر چکے ہیں، اس لیے یہ جنگ ایک مذہب کی دوسرے مذہب کے خلاف نہیں بلکہ لا مذہبیت کی جنگ مذہب کے خلاف ہے۔ ہمیں اس فرق کو سمجھنا چاہیے اور اس کے مطابق اپنی حکمت عملی اور ترجیحات کا تعین کرنا چاہیے۔ یہ بات اس لیے بھی ضروری ہے کہ انسانی معاشرہ کے لیے مذہب کے اجتماعی احکام و قوانین کے حوالے سے یہودیت، عیسائیت اور اسلام کی تعلیمات میں کوئی بڑا فرق نہیں ہے اور تورات، انجیل اور قرآن کریم کی تعلیمات میں اس حد تک یکسانیت آج بھی موجود ہے کہ انہیں یکجا کیا جائے تو احکام و قوانین کا مشترکہ ڈھانچہ تشکیل دیا جا سکتا ہے۔

اسی طرح یہ بات بھی قابل توجہ ہے کہ خود مسیحی دنیا کے بعض مذہبی رہنما یہی بات کہہ رہے ہیں۔ چنانچہ ورلڈ ٹریڈ سنٹر اور پینٹاگون کے سانحات کے بعد امریکہ کے معروف مذہبی راہنما فادر جیری فال ویل نے کرسچین ٹی وی پر اپنی نشری تقریر میں جو کچھ کہا ہے، وہ میری ان گزارشات کی تائید کے لیے کافی ہے۔ انہوں نے امریکی قوم سے خطاب کرتے ہوئے کہا ہے کہ ۱۱ ستمبر کے واقعات عذاب الٰہی ہیں۔ یہ اللہ تعالیٰ کے عذاب کا آغاز ہے جس کے ذریعے ہم خوف کی ڈیوڑھی میں داخل ہوئے ہیں اور ہم اس عذاب کے مستحق تھے۔ جیری فال ویل کا کہنا ہے کہ اس عذاب کا باعث وہ عناصر ہیں جنھوں نے سیکولرازم کی راہ ہموار کی ہے، حقوق نسواں کے نام پر معاشرہ میں بدکاری پھیلائی ہے، ہم جنسی کی

حمایت کر کے اللہ تعالیٰ کے غضب کو دعوت دی ہے اور اسقاط حمل کو فروغ دے کر خدا کے غصے کو بھڑکایا ہے۔

میں سمجھتا ہوں کہ ہمیں بھی جیری فال ویل کے اس تبصرہ کا سنجیدگی کے ساتھ جائزہ لینا چاہیے کیونکہ یہ عذاب صرف امریکیوں پر نازل نہیں ہوا بلکہ اس کے ساتھ ہی پورا عالم اسلام بھی عذاب کے ایک نئے دور میں داخل ہو گیا ہے۔ ہمارے ہاں عذاب الٰہی کے اسباب اسی نوعیت کے ہیں اور ہم پر نازل ہونے والے یہ مصائب خود ہماری بداعمالیوں کا نتیجہ ہیں۔ ہماری بداعمالیاں اور قرآن و سنت کی اجتماعی تعلیمات سے انحراف باطنی اور روحانی طور پر ہماری موجودہ تکالیف اور مصائب کا سبب ہیں اور ظاہری اسباب کے حوالے سے دیکھا جائے تو بھی اس وقت ملت اسلامیہ کو جو مسائل و مشکلات درپیش ہیں، ان کے پیچھے خود ہماری کوتاہیاں اور بداعمالیاں تجزیہ و تحلیل کی اسکرین پر صاف طور پر جھلکتی دکھائی دے رہی ہیں، اس لیے برطانیہ اور دیگر مغربی ممالک میں رہنے والے مسلمان علماء اور دانش وروں سے میری گزارش ہے کہ وہ موجودہ کشمکش کی اصل نوعیت کا ادراک کرتے ہوئے یہودی اور مسیحی امتوں کے ان عناصر کو تلاش کریں اور ان سے روابط استوار کریں جو فادر جیری فال ویل جیسے خیالات رکھتے ہیں۔ یہ لوگ ہمارے فطری حلیف ہیں اور یقیناً ہر جگہ موجود ہیں، لیکن ہمارا ان سے رابطہ نہیں ہے۔ اگر ہم تھوڑی سی محنت کریں، عقل و دانش سے کام لیں اور حوصلہ و تدبر کا ثبوت دیں تو علمی و فکری طور پر ایک مضبوط محاذ تشکیل دیا جا سکتا ہے۔

دوسری گزارش یہ ہے کہ مصائب و تکالیف اور آزمائش کے دور میں بھی جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت مبارکہ اور اسوۂ حسنہ سے رہنمائی حاصل کرنی ہے اور یہ دیکھنا ہے کہ ایسے حالات میں رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت میں ہمارے لیے کیا سبق ہے؟ اس سلسلے میں سیرت نبوی کے دو واقعات پیش کرنا چاہوں گا جو اس قسم کے حالات میں ہمارے لیے سبق اور اسوہ کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ایک واقعہ ہجرت کا ہے جب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم مکہ مکرمہ سے ہجرت کر کے مدینہ منورہ جا رہے تھے۔ حضرت ابوبکر صدیق ساتھ تھے۔ ظاہری کیفیت یہ تھی کہ مکہ مکرمہ سے رات کو چھپ کر نکلے ہیں، تلاش میں گھومنے والے گروہوں سے بچنے کے لیے تین دن تک غارِ ثور میں چھپے رہے ہیں، عام راستہ چھوڑ کر سمندر کے کنارے انجان اور غیر معروف راستے سے سفر کر رہے ہیں، راستے

میں کوئی ملتا ہے تو حضرت ابوبکر پورا تعارف کرانے کی بجائے گول مول بات کہہ رہے ہیں اور اس وقت سب سے بڑا مسئلہ اور ہدف یہی رہ گیا ہے کہ کسی طرح تلاش میں پھرنے والے کافر گروہوں اور ٹولیوں سے بچ بچا کر یثرب پہنچ جائیں، لیکن اسی کیفیت میں جب سراقہ بن مالک ملے ہیں، انہوں نے جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابوبکر صدیق کو پکڑنا چاہا ہے تو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ان سے فرما رہے ہیں کہ اے سراقہ، میں تمھارے ہاتھوں میں کسریٰ بادشاہ کے کنگن دیکھ رہا ہوں۔

ظاہری کیفیت دیکھیے کہ اپنی جان کی حفاظت مسئلہ بنا ہوا ہے، لیکن نظر کہاں پر ہے؟ اس وقت کی ایک سپر پاور فارس کے بادشاہ کے سونے کے کنگنوں پر کہ اس بادشاہ کو مسلمانوں کے ہاتھوں شکست ہوگی اور اس کے خزانوں کے ساتھ اس کے ہاتھ کے کنگن بھی مسلمانوں کے قبضے میں آئیں گے۔ یہ جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا معجزہ ہے جو پورا ہوا اور امیر المومنین حضرت عمر کے دور خلافت میں فارس فتح ہونے پر وہ کنگن مال غنیمت میں آئے جو اس پیشین گوئی کو پورا کرنے کے لیے سراقہ بن مالک کو تھوڑی دیر کے لیے پہنائے گئے، لیکن معجزہ ہونے کے ساتھ ساتھ یہ ہمارے لیے سبق بھی ہے اور جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا اسوہ وسنت ہے کہ مشکل سے مشکل وقت میں بھی اپنا حوصلہ قائم رکھیں، مورال برقرار رہے اور اصل ٹارگٹ نظر سے اوجھل نہ ہو۔

دوسرا واقعہ غزوہ احزاب کا ہے جب تمام عرب قبائل نے قریش کی قیادت میں متحدہ محاذ بنا کر مدینہ منورہ پر چاروں طرف سے یلغار کر دی تھی اور مسلمانوں کو روایتی طریق جنگ ترک کر کے اپنے دفاع کے لیے مدینہ منورہ کے گرد خندق کھودنا پڑی تھی۔ قرآن کریم نے اس وقت مسلمانوں کی ظاہری کیفیت ان الفاظ میں بیان کی ہے کہ ”جب تم پر لشکر چڑھ دوڑے تھے، جب تمھاری آنکھیں خوف کے مارے پتھرا گئی تھیں، جب تمہارے دل خوف کی شدت سے سینوں سے اچھل کر حلق میں پھنس گئے تھے، جب تم اللہ تعالیٰ کی مدد کے بارے میں گمانوں کا شکار ہونے لگے تھے، جب مسلمان آزمائش میں ڈال دیے گئے تھے اور جب وہ شدید زلزلے کی کیفیت سے دوچار ہو گئے تھے۔“

یہ وہ منظر کشی ہے جو غزوۂ احزاب کے موقع پر مدینہ منورہ میں مسلمانوں پر طاری خوف کی کیفیت کے حوالے سے خود قرآن کریم نے سورۃ الاحزاب میں کی ہے جبکہ احادیث میں یہ واقعہ مذکور ہے کہ کفار کے لشکر کے پہنچنے سے پہلے پہلے خندق مکمل کر لینے کا ہدف ذہنوں پر اس حد تک غالب آ گیا تھا کہ

خندق کھودنے میں مصروفیت کے باعث صحابہ کرام اور خود جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی عصر کی نماز قضا ہوتے ہوتے بچی۔ اس کیفیت میں جب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک چٹان پر کدال کی ضرب لگائی تو چٹان کے ٹکڑے ٹکڑے ہونے کے ساتھ ایک روشنی چمکی اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مجھے اس چمک میں قیصر و کسریٰ کے محلات دکھائی دیے ہیں۔

قیصر اور کسریٰ اس وقت کی دونوں بڑی اور عالمی قوتوں کے حکمرانوں کے لقب ہیں اور جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے اس خوف و ہراس کی شدت کی کیفیت میں بھی صحابہ کرام کو قیصر و کسریٰ کے محلات کی خوش خبری دلوائی جا رہی ہے۔ یہ معجزہ بھی پورا ہوا اور اس کے ساتھ سبق بھی ہے کہ مشکل سے مشکل حالات میں بھی حوصلہ قائم رکھنا، مورال کو بلند رکھنا اور اپنے اصل ٹارگٹ کو نظر میں رکھنا سنت نبوی اور اسوۂ رسول ہے۔

اس لیے میں دنیا بھر کے مسلمانوں سے یہ عرض کرنا چاہوں گا کہ مصائب و آلام اور مشکلات و تکالیف کی انتہائی شدت اور سنگینی کے اس دور میں ہمارا سب سے پہلا کام یہ ہے کہ حوصلے قائم رکھیں، حالات کی ناہمواری کے سامنے سپر انداز نہ ہوں، مشکلات سے گھبرانے اور ان کے سامنے بے بسی کا اظہار کرنے کی بجائے ان کا سامنا کریں، اپنی کوتاہیوں اور بداعمالیوں کا ادراک کریں، توبہ و استغفار کا اہتمام کریں، قرآن و سنت کے ساتھ تعلق کو مضبوط کریں اور پورے حوصلہ و استقامت کے ساتھ حالات کی بہتری کی سمت سفر جاری رکھیں اور اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں عاجزی کے ساتھ دعاؤں کا اہتمام کریں کہ فیصلہ وہیں ہوتے ہیں اور ساری طاقتوں اور قوتوں کا سرچشمہ وہی ہے۔

تیسری گزارش ان حالات میں مسلمانوں کی ذمہ داریوں کے بارے میں ہے جن کا اصل تعلق تو مسلمان حکمرانوں سے ہے مگر موجودہ صورت حال میں ان سے کسی کردار کی کوئی توقع نہیں ہے۔ اسلامی تحریکات سے یہ گزارش کرنا ضروری ہے کہ وہ اس وقت جنگ کا سب سے بڑا ہدف ہیں اور مغرب کی یلغار کا سب سے بڑا ٹارگٹ ہیں، انہیں آپس میں رابطہ و مشاورت اور مفاہمت و مشارکت کا زیادہ سے زیادہ اہتمام کرنا چاہیے کیونکہ وہ مل کر ہی اس بحران سے نکل سکتے ہیں اور عالمی متحدہ طاقتوں کے حربوں کو ناکام بنا سکتے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی علماء کرام اور اصحاب فہم و دانش کی بھی ذمہ داری ہے کہ ملت اسلامیہ کی رہنمائی کے علمی و فکری تقاضوں کا ادراک کریں اور مسلمان عوام کی رہنمائی کریں۔

غیر ضروری مسائل میں اس وقت عوام کو الجھانا انتہائی غیر ذمہ داری کی بات ہوگی، اس لیے علماء اور دانش ور اپنی ترجیحات کا از سر نو جائزہ لیں اور علم و دانش کے محاذ پر پوری سنجیدگی، تدبر، جرات اور حوصلہ کے ساتھ امت مسلمہ کی رہنمائی کے لیے آگے بڑھیں۔

چوتھی گزارش ان مسلمانوں سے ہے جو برطانیہ میں اور مغرب کے دوسرے ملکوں میں رہتے ہیں۔ یہاں کے مسلمان اکثریہ دریافت کرتے ہیں کہ ایسے حالات میں جبکہ پورا عالم اسلام حالت جنگ میں ہے، ان کی شرعی ذمہ داری کیا ہے اور وہ ایک مسلمان کی حیثیت سے اپنے فریضے سے کس طرح عہدہ برآ ہو سکتے ہیں؟ یہ بہت حساس اور نازک مسئلہ ہے اور اس کے ہر پہلو پر غور و فکر کی ضرورت ہے۔ اس سلسلے میں ایک بات کی طرف آپ کی توجہ دلانا چاہوں گا کہ اسلامی تاریخ میں جنگ بدر سے زیادہ نازک معرکہ کبھی نہیں ہوا جس میں ایک طرف خود جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اپنے لشکر کی کمان کر رہے ہیں اور دوسری طرف آپ کا سب سے بڑا دشمن ابوجہل قریش کے لشکر کی قیادت کر رہا تھا۔ اسلامی لشکر کی حالت یہ تھی کہ چھوٹے بڑے سب ملا کر تین سو تیرہ بنتے تھے اور حالات کی نزاکت کا اندازہ اس سے کر لیجیے کہ جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم رات کو سجدے میں سر رکھ کر آنسو بہاتے ہوئے اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں ان الفاظ میں التجا فرما رہے ہیں کہ یا اللہ! یہ چند افراد میری زندگی بھر کی کمائی ہے، اگر یہ لٹ گئی تو قیامت تک اس زمین پر تیرا نام لینے والا کوئی نہیں ہوگا۔

اس وقت نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو ایک ایک شخص کی ضرورت تھی، لیکن صحابہ کرام میں سے چار بزرگ ایسے ہیں جو موجود اور تندرست ہوتے ہوئے بھی بدر کی لڑائی میں شریک نہیں ہوئے اور سب کے شریک نہ ہونے کی وجوہ مختلف تھیں۔ ان میں سے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو تو خود جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے جنگ میں شرکت سے روک دیا۔ ان کی اہلیہ اور جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بیٹی حضرت رقیہ بیمار تھیں اور گھر میں اکیلی تھیں۔ ان کی تیمارداری کرنے والا کوئی نہیں تھا اور وہ خود اپنے آپ کو سنبھالنے کی پوزیشن میں نہیں تھیں، اس لیے حضرت عثمان کی خواہش کے باوجود جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں غزوۂ بدر میں شرکت سے حکماً روک دیا اور وہ مدینہ منورہ میں موجود ہوتے ہوئے بھی بدر کے معرکے میں شریک نہ ہو سکے۔

حضرت حذیفہ بن الیمانؓ اور ان کے والد محترم دونوں جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آ

رہے تھے کہ راستے میں کافروں نے پکڑ لیا اور اس شرط پر چھوڑا کہ آپ دونوں ہمارے خلاف جنگ میں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ شریک نہیں ہوں گے۔ کفار کی قید سے رہا ہو کر دونوں جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور سارا قصہ بیان کر دیا۔ اس پر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں یہ کہہ کر جنگ میں شرکت سے روک دیا کہ چونکہ آپ دونوں نے کفار کی یہ شرط منظور کر لی تھی، اس لیے آپ ہمارے ساتھ جنگ میں شریک نہیں ہوں گے۔ چنانچہ دونوں باپ بیٹا موجود ہوتے ہوئے بھی غزوۂ بدر میں شامل نہ ہو سکے۔

حضرت سلمان فارسیؓ جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں اس وقت آئے تھے جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مکہ مکرمہ سے ہجرت کر کے ابھی قبا میں مقیم تھے اور مدینہ منورہ نہیں پہنچے تھے۔ اسی دور میں حضرت سلمان فارسی مسلمان ہوئے، لیکن مدینہ منورہ میں موجود ہوتے ہوئے بھی بدر واحد کے معرکوں میں شریک نہیں ہوئے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ ایک یہودی خاندان کے غلام تھے اور اپنے فیصلوں میں آزادی اور خود مختاری نہیں رکھتے تھے۔ اس کے بعد غزوۂ احزاب سے قبل وہ آزاد ہوئے تو اس غزوہ میں نہ صرف شریک ہوئے بلکہ خندق بھی انہی کے مشورے سے کھودی گئی۔

ان واقعات کے عرض کرنے کا مقصد یہ ہے کہ جہاد فرض ہے، لیکن اسلام نے لوگوں کی مجبوریوں، احوال وظروف اور ضروریات کے مختلف دائروں کا لحاظ رکھا ہے اور انہیں اپنے اپنے درجے میں تسلیم کیا ہے، اس لیے میں یہ گزارش کروں گا کہ غیر مسلم ممالک میں رہنے والے مسلمانوں کی جو مجبوریاں ہیں، ان کے جو معاملات ہیں اور جن شرائط وقیود کے ساتھ وہ ان ممالک میں رہ رہے ہیں، ان کو ملحوظ رکھنا بھی شریعت کا تقاضا ہے۔ اس بنیاد پر میری استدعا ہے کہ مغربی ممالک میں رہنے والے مسلمان اپنے اپنے ملک کے قانون اور دستور سے بغاوت کا راستہ اختیار نہ کریں اور قانون شکنی سے ہر صورت میں گریز کریں، البتہ قانون کے دائرے میں رہتے ہوئے اپنے مظلوم بھائیوں کی حمایت اور امداد کے لیے جو کچھ کر سکتے ہیں، اس سے گریز نہ کریں۔

میں سمجھتا ہوں کہ یہاں کا اصل محاذ میڈیا کا محاذ ہے اور مظلوم اور بے گھر لوگوں کی مالی معاونت کا محاذ ہے۔ اس محاذ پر یہاں کام کو منظم کرنے کی ضرورت ہے اور آپ لوگوں کے کرنے کا اصل کام یہ ہے۔ اسلام کے بارے میں، مسلمانوں کے بارے میں اور دینی تحریکات کے بارے میں یہاں کا میڈیا

جو کچھ کہہ رہا ہے، اس کا جواب دینا اور اسلام اور مسلمانوں کی پوزیشن کو واضح کرنا بہت بڑی دینی ضرورت ہے۔ بین الاقوامی ادارے اور لابیاں اسلام اور مسلمانوں کے خلاف جو کارروائیاں کر رہی ہیں، ان کی نشان دہی کرنا اور ان کا تعاقب کرنا دین کا بہت بڑا تقاضا ہے۔ دنیا میں جہاں جہاں مظلوم مسلمان اپنی آزادی اور دینی تشخص کے لیے جنگ لڑ رہے ہیں، ان کو سیاسی اور اخلاقی سپورٹ مہیا کرنا ہماری شرعی ذمہ داری ہے اور جنگوں میں بے گھر ہونے والے لاکھوں مسلمان خاندانوں کی مالی مدد کرنا اور انہیں ضروریات زندگی فراہم کرنا اسلام کا اہم حکم ہے۔ اس لیے میری آپ حضرات سے گزارش ہے کہ آپ لوگ ان شعبوں کی طرف متوجہ ہوں اور اپنی ذمہ داریوں کا ادراک کرتے ہوئے انہیں صحیح طور پر اور بروقت ادا کرنے کے لیے محنت کریں۔

اس سلسلے میں کسی مزید تفصیل میں جائے بغیر یہ بات عرض کرنا بھی ضروری سمجھتا ہوں کہ اپنے ذہن میں یہ بات ہر وقت رکھیں کہ امریکہ اور برطانیہ میں رہنے والے یہودی ان ملکوں کے قوانین کے دائرے میں رہتے ہوئے یہودیت اور اسرائیل کے لیے جو کچھ کر رہے ہیں اور جو کچھ کر سکتے ہیں، وہ سب کچھ آپ بھی یہاں رہتے ہوئے اور یہاں کے قوانین کی پابندی کرتے ہوئے اسلام اور مسلم ممالک کے لیے کر سکتے ہیں۔ اگر انہیں اس کا حق حاصل ہے تو آپ کو بھی اس کا حق حاصل ہے۔ بس اس معیار اور کسوٹی کو سامنے رکھیے اور اسلام، ملت اسلامیہ اور مسلم ممالک کے لیے اس دائرے میں رہتے ہوئے جو کچھ آپ کے بس میں ہو، ضرور کیجیے۔

دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہمیں اپنے فرائض کو پہچاننے اور انہیں صحیح طور پر ادا کرنے کی توفیق سے نوازیں، آمین یارب العالمین۔

(روزنامہ اوصاف، ۲۲ اکتوبر ۲۰۰۱ء)

مسلم ممالک کے ساتھ تعلقات کی نوعیت

مغربی ممالک کی پالیسیاں اور مسلمانوں کا ردعمل

میں اس وقت برطانیہ کے شہر نوٹنگھم میں ہوں۔ عید الاضحی کی تعطیلات سے فائدہ اٹھاتے ہوئے چند روز کے لیے برطانیہ آیا ہوں اور ۱۲ جنوری کے جمعۃ المبارک تک گوجرانوالہ واپس پہنچنے کا ارادہ رکھتا ہوں۔ نوٹنگھم میں راولپنڈی سے تعلق رکھنے والے ایک نوجوان صفدر مرزا مسلم کمیونٹی کے مسائل کے لیے خاص متحرک رہتے ہیں اور مساجد و علماء کے ماحول سے بھی ان کا تعلق ہے۔ مجھ سے انہیں ہمیشہ یہ شکایت رہتی ہے کہ جب آتا ہوں، اچانک آتا ہوں اور صرف ایک دو روز کی گنجائش میرے پاس ہوتی ہے، اس لیے وہ یہاں کے پڑھے لکھے اور فہم و دانش کے حامل حضرات سے میری ملاقات کا اہتمام نہیں کر پاتے جس کی وہ شدید خواہش رکھتے ہیں۔

گزشتہ روز جب انہیں معلوم ہوا کہ میں حسب معمول اچانک جامعۃ الہدیٰ نوٹنگھم میں صرف دو روز کے لیے موجود ہوں تو وہ ملاقات کے لیے آئے اور آتے ہی پہلی بات یہ کہی کہ میں آپ سے ناراض ہوں، کیونکہ آپ نے برطانیہ آنے سے پہلے مجھے مطلع نہیں کیا۔ ان کی شکایت بجا تھی، اس لیے معذرت کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا، مگر میں اپنی افتادِ طبع کے ہاتھوں مجبور ہوں کہ ساٹھ برس کی عمر میں اپنی پرانی عادتوں کو تبدیل کرنا میرے بس میں نہیں ہے۔

یہی شکایت مجھ سے ابراہیم کمیونٹی کالج وائٹ چیپل لندن کے احباب کو رہتی ہے کہ انہیں میری آمد کا اس وقت پتہ چلتا ہے جب میں کالج کے مین گیٹ پر بیل دے رہا ہوتا ہوں۔ اس بار بھی ایسا ہی ہوا، مگر اب یہ حضرات میری اس عادت سے کچھ مانوس ہوتے جا رہے ہیں، چنانچہ دونوں نے ہلکی پھلکی خفگی کا اظہار کرنے کے باوجود ہنگامی بنیادوں پر پروگراموں کا اہتمام کر ہی لیا۔

ابراہیم کمیونٹی کالج لندن نے میری پاکستان سے واپسی سے ایک روز قبل لندن کے علماء کرام اور طلبہ کے لیے ”حقوق نسواں اور اسلامی تعلیمات“ کے عنوان پر ایک فکری نشست کا منگل کی شب اہتمام کر رکھا ہے، جبکہ صفدر مرزا صاحب نے نوٹنگھم پولیس کے سٹی چیف مارکس بیل (Markas

Beal) کے ساتھ میری تفصیلی ملاقات کا پروگرام بنالیا۔ موصوف میری قیام گاہ جامعۃ الہدیٰ نوٹنگھم میں تشریف لائے اور مختلف مسائل پر ہمارے درمیان کم و بیش اڑھائی گھنٹے تک گفتگو ہوئی جس میں صفدر حسین اور جامعۃ الہدیٰ نوٹنگھم کے پرنسپل مولانا رضاء الحق سیاکھوی بھی شریک تھے۔ ساری گفتگو کا احاطہ تو اس کالم میں ممکن نہیں ہے، البتہ دو تین زیادہ اہم امور کا تذکرہ ضروری سمجھتا ہوں۔

برطانیہ کی انتظامیہ کا مسلمانوں کے حوالے سے سب سے بڑا مسئلہ یہاں کے مسلم نوجوانوں کے جذبات اور مبینہ طور پر ان کی انتہا پسندی کو کنٹرول میں رکھنا ہے تاکہ انتظامی مسائل پیدا نہ ہوں اور اس سلسلے میں مشکلات کم ہوں۔ آج جبکہ میں یہ سطور تحریر کر رہا ہوں، میرے سامنے لندن میں شائع ہونے والا اردو اخبار پڑا ہے جس کی اہم خبر یہ ہے کہ برطانوی حکومت لوکل اتھارٹیز کو پانچ ملین پونڈ اس مقصد کے لیے دے رہی ہے کہ وہ نوجوان مسلمانوں کو انتہا پسندی کی طرف جانے سے روکیں۔ یہ رقم انتہا پسند مسلمان گروہوں کی نشان دہی پر خرچ کی جائے گی، جبکہ لوکل گورنمنٹ کے عملے سے کہا جائے گا کہ وہ دہشت گردی کے خطرے کا مقابلہ کرنے کے لیے پولیس کو معلومات فراہم کریں۔ خبر کے مطابق کمیونٹیز کے معاملات وزیر روتھ کیلی نے کہا ہے کہ لوکل اتھارٹیز کو اس چیلنج کا مقابلہ کرنے کے لیے سامنے آنا ہوگا۔ انہوں نے کہا کہ لوکل کمیونٹیز کا ”دلوں اور دماغوں کی جنگ جیتنے“ میں اہم کردار ہے اور فنڈ سے ان کی مقامی سطح کی مہارت کو فروغ ملے گا۔

نوٹنگھم سٹی پولیس کے چیف کی گفتگو کا سب سے اہم نکتہ بھی یہی تھا کہ مسلمان نوجوانوں کو انتہا پسندی کی طرف جانے سے کیسے روکا جاسکتا ہے اور ہم اس سلسلے میں کیا کردار ادا کر سکتے ہیں؟ میں نے عرض کیا کہ جس چیز کو انتہا پسندی قرار دیا جارہا ہے اور یہ کہا جاتا ہے کہ یہ اشتعال کا سبب بنتی ہے اور اس سے معاملات میں بگاڑ پیدا ہوتا ہے، ہمیں اس کے اسباب کا جائزہ لینا ہوگا۔ یہ مبینہ انتہا پسندی دو وجوہ سے پیدا ہوتی ہے: ایک یہ کہ دنیا میں کسی جگہ بھی مغربی ممالک کی طرف سے مسلمانوں کے ساتھ زیادتی کا تاثر پیدا ہوتا ہے تو اس کا ردعمل ایک فطری عمل ہے جسے سبب دور کیے بغیر روکنا کسی طرح بھی ممکن نہیں ہے۔ اس وقت عالمی تناظر میں عراق، فلسطین، کشمیر اور افغانستان وغیرہ کے حوالے سے مغربی حکومتوں کا جو طرز عمل ہے، اس کے بارے میں صرف مسلمانوں کا ہی نہیں، بلکہ عالمی رائے عامہ اور غیر جانب دار مبصرین کا کہنا بھی یہی ہے کہ مسلمانوں کے ساتھ زیادتی ہو رہی ہے، اس لیے

مسلمانوں بالخصوص گرم خون رکھنے والے نوجوانوں کے ذہنوں میں اس کا ردعمل پیدا ہونا فطری بات ہے۔ دوسری وجہ آج کا میڈیا ہے کہ دنیا کے کسی حصے میں کوئی واقعہ رونما ہوتا ہے تو اس کی خبر آناً فاناً پوری دنیا میں پھیل جاتی ہے اور صرف خبر ہی نہیں، بلکہ اس پر مثبت اور منفی دونوں قسم کے تبصرے اور تجزیے بھی خبر کے ساتھ ہی ذہنوں میں منتقل ہو جاتے ہیں جس سے ردعمل میں بھی "فوری پن" آ جاتا ہے اور اس کے اظہار میں رکاوٹ پیدا کرنا کسی کے بس میں نہیں رہتا۔

اس پس منظر میں آج کے ورلڈ میڈیا کی کھلی فضا میں دنیا کے مختلف حصوں میں مسلمانوں کے ساتھ ہونے والی زیادتیوں کے خلاف مسلمان نوجوانوں کے دل و دماغ میں ردعمل کے پیدا ہونے کو تو کسی صورت میں نہیں روکا جا سکتا اور نہ ہی اس کے اظہار پر کوئی قدغن لگائی جا سکتی ہے، البتہ اس رد عمل کے اظہار کو مناسب حدوں کا پابند ضروری کیا جا سکتا ہے۔ مثلاً برطانیہ میں رہنے والے مسلمان نوجوانوں کو ہم یہ تو نہیں کہہ سکتے کہ وہ عراق، فلسطین، کشمیر، افغانستان یا کسی اور جگہ کے مسلمانوں کی مظلومیت پر ردعمل کا شکار نہ ہوں یا اپنے ردعمل کا اظہار نہ کریں، کیونکہ ان سے یہ کہنا صریحاً زیادتی اور ناانصافی کی بات ہوگی، البتہ ہم ان سے یہ ضرور کہہ سکتے ہیں اور ہمیشہ کہتے رہے ہیں کہ وہ اپنے جذبات اور ردعمل کے اظہار میں اپنے ملک کے احوال و ظروف، دستور و قوانین اور اپنے دیگر ہم وطنوں کے جذبات و احساسات کی ضرور پاس داری کریں اور اپنی حکومت اور مسلمان بھائیوں کے لیے مشکلات پیدا نہ کریں۔

نوٹنگھم کے پولیس چیف سے میں نے کہا کہ یہودی بھی ایسا ہی کرتے ہیں۔ اگر وہ فلسطین میں یہودیوں کے ساتھ ہونے والے کسی معاملے کو ناانصافی اور زیادتی تصور کرتے ہیں تو اس پر امریکہ اور برطانیہ سمیت مختلف ملکوں میں اپنے جذبات اور ردعمل کا اظہار کرتے ہیں، البتہ اپنے ملک کے قانون اور حالات کو بھی پیش نظر رکھتے ہیں۔ ہم اپنے مسلمان نوجوانوں سے یہی بات کہتے ہیں اور اسی کو درست سمجھتے ہیں۔

پولیس چیف نے اس بات کو تسلیم کیا کہ مسلمان نوجوانوں میں جذباتی ردعمل کی سب سے بڑی وجہ مغربی ممالک کی "فارن پالیسی" کو قرار دیا جاتا ہے اور یہ بات بھی درست ہے کہ اس کا ایک بڑا سبب میڈیا بھی ہے، اس لیے کہ میڈیا کو کمیونٹی یا حکومت کی مشکلات سے غرض نہیں ہوتی۔ اس کی ترجیحات

میں سب سے پہلا نمبر خبریت اور تجسس کو حاصل ہے، لیکن یہ دونوں باتیں ہمارے اختیار میں نہیں ہیں۔ ہمارا کام تو امن وامان قائم رکھنا اور سوسائٹی میں کسی قسم کی کشیدگی کو جنم لینے سے روکنا ہے۔ میں نے عرض کیا کہ اگر آپ زمینی حقائق کو سامنے رکھتے ہوئے مسلم کمیونٹی کے رہنماؤں اور مذہبی اداروں سے اس سلسلے میں تعاون چاہیں گے تو آپ کو مطلوبہ تعاون ضرور ملے گا اور ہم بھی آپ سے بھرپور تعاون کریں گے۔

مارکس بیل کا دوسرا اہم سوال منشیات کے بارے میں تھا کہ معاشرے میں ہیروئن اور دیگر منشیات کو کنٹرول کرنے کے لیے کیا صورت اختیار کی جائے؟ میں نے گزارش کی کہ ہمارے ہاں منشیات کا دائرہ زیادہ وسیع ہے کہ ہم شراب کو بھی اسی ممنوعہ نشے کا ذریعہ شمار کرتے ہیں جس کو روکنے کے لیے آپ لوگ ہیروئن وغیرہ کی روک تھام کی کوشش کرتے ہیں۔ ہمارے مذہب میں ہر نشہ آور چیز، خواہ وہ کسی بھی صورت میں ہو، حرام ہے۔ اس لیے ہمارے نزدیک یہ مسئلہ زیادہ اہم ہے اور ہم اس کے لیے مذہبی تعلیمات کو بنیاد بناتے ہیں۔ اس کے ساتھ عقیدے کی قوت اور خوف خدا بھی ضروری ہے، اس کے بغیر کسی کو قانون کا پوری طرح پابند نہیں بنایا جا سکتا۔

پولیس چیف نے بتایا کہ انہوں نے اس بات کا تجربہ کیا ہے، مذہبی رہنماؤں اور چرچوں کے تعاون سے نوجوانوں میں قانون شکنی اور نشہ آور اشیا کے استعمال کے خلاف مہم چلائی ہے جس کے بہت مفید نتائج سامنے آئے ہیں۔ میں نے مارکس بیل کو بتایا کہ چند سال قبل آپ ہی کے شہر نوٹنگھم میں مولانا رضاء الحق سیاکھوی، مولانا محمد عیسیٰ منصوری اور ایک آئرش نومسلم بزرگ حاجی عبد الرحمن کے ہمراہ میں نے اس شہر کے ایک بڑے پادری صاحب سے ملاقات کی تھی اور ان سے اس مسئلے پر بات کی تھی کہ سوسائٹی میں منشیات کے استعمال، بدکاری، ہم جنس پرستی اور بے حیائی کے خلاف ہم مشترکہ طور پر ان کے ساتھ مل کر محنت کرنے کے لیے تیار ہیں، کیونکہ ہمارے نزدیک ان مسائل کا حل آسمانی کتابوں اور مذہبی اخلاقیات کی طرف واپسی کے بغیر ممکن نہیں ہے۔ انہوں نے میری اس بات سے اتفاق کیا تھا کہ سوسائٹی میں بے حیائی، بدکاری، ہم جنس پرستی اور منشیات وغیرہ کی روک تھام کے لیے آسمانی تعلیمات کی طرف واپسی ضروری ہے اور ہم اس سلسلے میں مسیحیت کے مذہبی رہنماؤں کے ساتھ مل کر کام کرنے کے لیے تیار ہیں۔

نوٹنگھم کے پولیس چیف نے اس سے اتفاق کیا اور اس خواہش کا اظہار کیا کہ وہ مسیحی مذہبی راہنماؤں اور مسلمان مذہبی رہنماؤں کے درمیان اس مقصد کے لیے رابطے کا اہتمام کرنے میں دلچسپی رکھتے ہیں اور اسے بہت مفید تصور کرتے ہیں۔ میں نے گزارش کی کہ برطانیہ میں آئندہ حاضری کے دوران، میں بھی ان کوششوں میں شریک ہوں گا اور اس میں دلی خوشی محسوس کروں گا، ان شاء اللہ تعالیٰ۔

مولانا رضاء الحق سیاکھوی نے بھی اس ملاقات میں اپنے تاثرات کا اظہار کیا۔ انہوں نے بتایا کہ آج کی گلوبل دنیا میں یہ ممکن نہیں ہے کہ ہم نوٹنگھم کے مسائل کو صرف یہاں کے حالات کے دائرے میں رہتے ہوئے حل کر سکیں اور عالمی حالات کو نظر انداز کر دیں، کیونکہ عالمی حالات کا اثر، براہ راست مقامی حالات پر پڑتا ہے اور لوکل مسائل کو عالمی تناظر سے الگ نہیں کیا جا سکتا۔ اس کے لیے مذہبی رہنماؤں، کمیونٹی لیڈرز اور انتظامیہ کے ساتھ ساتھ عوامی نمائندوں اور سیاسی قیادت کو بھی شریک کرنا ضروری ہے تاکہ سب مل جل کر جذبات اور ردعمل کو قابو میں رکھنے اور انہیں درست رخ پر رکھنے کے لیے کردار ادا کر سکیں۔

انہوں نے کہا کہ اس سلسلے میں اظہار رائے پر پابندی لگانے اور جذبات کو دبانے کی پالیسی درست نہیں ہوگی جیسا کہ سننے میں آ رہا ہے کہ برطانوی حکومت اس قسم کی پابندیوں کے بارے میں سوچ رہی ہے، کیونکہ کسی مسئلے پر فطری طور پر پیدا ہونے والے جذبات اور ردعمل کو اگر بزور روکا جائے گا تو وہ غلط راستہ اختیار کریں گے اور اس سے مسائل پیدا ہوں گے، اس لیے افہام و تفہیم کے ساتھ ہی ان مسائل کے حل کا راستہ نکالا جا سکتا ہے۔

(روزنامہ پاکستان، ۱۰ جنوری ۲۰۰۷ء)

مسلم ممالک کی تعلیمی ورفاہی ضروریات

نارتھ لندن میں ''کیئر لنک'' کے نام سے ہمارے چند دوست ایک سماجی ادارہ چلا رہے ہیں۔ ان میں سے ایک رفعت لودھی صاحب اور فیض اللہ خان صاحب کا تعلق پاکستان سے جبکہ سلمان خان صاحب کا تعلق انڈیا سے ہے۔ ان کے ساتھ ملاقات اور دفتر میں حاضری کا پروگرام طے تھا۔ رفعت لودھی صاحب نے مجھے اور قاری محمد عمران جہانگیری کو مولانا سنبھلی کے گھر سے وصول کیا اور اس کے بعد دو تین گھنٹے ہم نے کیئر لنک کے دفتر میں گزارے۔ رفعت لودھی صاحب اور فیض اللہ خان صاحب کا تعلق ڈاکٹر میر معظم علی علوی رحمہ اللہ تعالیٰ کی تحریک خلافت سے بھی ہے۔ ڈاکٹر صاحب مرحوم کا تعلق تھانہ بھون کے علاقہ سے تھا، علی گڑھ کے تعلیم یافتہ تھے، تحریک پاکستان میں سرگرمی سے حصہ لیا اور اس کے بعد پاکستان میں خلافت اسلامیہ کے احیا و قیام کے لیے مسلسل آواز اٹھاتے رہے۔ راسخ العقیدہ اور باعمل مسلمان تھے، دل میں اسلامی نظام کے عملی نفاذ کی تڑپ رکھتے تھے اور اس کا مسلسل اظہار کرتے رہتے تھے۔ خلافت کے نظام اور اس کے نفاذ کی جدوجہد کے لیے اپنا ایک مستقل فلسفہ رکھتے تھے اور مختلف لیکچروں کی صورت میں اپنے ہم خیال حضرات کو اس کی تعلیم و تربیت دیتے تھے۔ میری ان سے متعدد ملاقاتیں ہوئی ہیں اور میں ان کے جذبہ عمل سے ہمیشہ متاثر ہوا۔ ان کے لیکچروں کو جب کتابی شکل میں مرتب کیا گیا تو انہوں نے مجھے ان پر نظر ثانی کے لیے کہا۔ میں نے نظر ثانی کے ساتھ ساتھ اس پر مختصر مقدمہ بھی لکھا۔ وہ ان لوگوں میں سے تھے جو نظر و فکر کی فضا میں محو پرواز رہتے ہیں، مگر آج کی بے رحم عملی دنیا کے پاس ان کی باتیں سننے کا وقت نہیں ہے۔ لاہور میں ان کی نمائندگی ہمارے محترم دوست مولانا خورشید احمد گنگوہی کرتے ہیں اور انہی کے لہجے میں خلافت کی صدا لگاتے ہیں۔

رفعت لودھی صاحب اور فیض اللہ خان صاحب ڈاکٹر صاحب مرحوم کے رفقاء میں سے ہیں۔ ان کے ساتھ جب بھی ملاقات ہوتی ہے، عالم اسلام میں خلافت کے احیا کے امکانات پر گفتگو ہوتی ہے اور میں اس جذبہ صادق میں ان کی ہاں میں ہاں ملاتا رہتا ہوں، مگر اس بار بات چیت کا موضوع

پاکستان میں عوام کو درپیش مسائل تھے اور عام آدمی کی زندگی گفتگو کا عنوان تھی۔ مغرب میں مقیم بہت سے مخلص پاکستانیوں کی طرح یہ دوست بھی اس بات پر سخت پریشان ہیں کہ پاکستان میں امارت بھی بڑھتی جارہی ہے مگر اس کے ساتھ ہی غربت میں بھی پیہم اضافہ ہورہا ہے۔ عام آدمی کو زندگی کی بنیادی سہولتیں میسر نہیں ہیں، پینے کا پانی میسر نہیں ہے، علاج کی سہولتیں غریب آدمی کے لیے ناپید ہیں، سڑکوں اور راستوں کا براحال ہے، مہنگائی آسمان سے باتیں کر رہی ہیں اور عام آدمی کی مشکلات بڑھتی جا رہی ہیں۔ ان حضرات کا کہنا تھا کہ اس صورت حال کو تبدیل کرنے کے لیے ہم کام کرنا چاہتے ہیں، ہمیں اس کے لیے مشورہ دیں۔

میں نے گزارش کی کہ مجموعی صورت حال کی تبدیلی کے لیے تو اجتماعی جدوجہد کی ضرورت ہے اور قومی سطح پر محنت درکار ہے، کیونکہ جب تک موجودہ نوآبادیاتی معاشی اور معاشرتی ڈھانچہ مسلط ہے، صورت حال میں اجتماعی اصلاح کی کوئی صورت ممکن نہیں ہے۔ اصلاح کی ہر کوشش کی راہ میں یہ ڈھانچہ رکاوٹ بن جاتا ہے۔ اس نظام میں ہمیشہ یہی ہوگا کہ قومی آمدنی میں اضافے اور قومی خزانے کے بھرے جانے کی خوش خبریاں روزانہ اخبارات کی زینت بنتی رہیں گی، لیکن عام آدمی تک اس کا کوئی اثر اور فائدہ نہیں پہنچے گا۔ وہ بدستور غربت اور مہنگائی کی چکی میں پستا رہے گا، قومی خزانہ اور قومی دولت صرف چند خاندانوں اور طبقات تک محدود رہے گی، اس کے اثرات بھی انھی تک رہیں گے اور ان میں سے جو زیادہ طاقت ور ہوگا، وہ دولت اور اس کے اثرات بھی زیادہ سمیٹے گا۔ غریب اور متوسط درجے کے افراد کا کام محنت کرنا اور بالادست طبقات کی خوش حالی میں مزید اضافے کے لیے صرف ٹیکس دینا ہی رہے گا، اس لیے مجموعی اصلاح اجتماعی محنت اور قومی جدوجہد کے بغیر کبھی نہیں ہو سکے گی، البتہ نچلی سطح پر کسی علاقہ کے لوگوں کے لیے بہتری کی جدوجہد کی جائے تو کچھ لوگوں کو فائدہ ہوگا اور ان کی مشکلات میں ضرور کمی ہوجائے گی۔ اس لیے اگر خوش حال ممالک میں رہنے والے پاکستانی اگر اپنے اپنے علاقوں میں منظم طور پر تھوڑا بہت رفاہی کام کرتے رہیں تو اس سے نہ صرف یہ کہ بہت سے لوگوں کو فائدہ ہوگا، بلکہ یہ جدوجہد ان ہزاروں این جی اوز کی سرگرمیوں کو بھی بیلنس کرے گی جو صحت و تعلیم اور دیگر عوامی ضروریات کے حوالے سے پورے ملک میں جال پھیلائے ہوئے ہیں، عام لوگوں کی تھوڑی بہت خدمت بھی کرتی ہیں، لیکن ان میں سے اکثر این جی اوز اس امداد کی آڑ میں اس

مخصوص ایجنڈے کی تکمیل کے لیے بھی سرگرم عمل رہتی ہیں جو اس معاشرہ میں اسلامی اور مشرقی اقدار کو کمزور کرنے اور مغرب کے فلسفہ وتہذیب کے اثرات کو پھیلانے کے لیے طے کیا گیا ہے اور بہت سی امدادی اور رفاہی این جی اوز کا اصل ایجنڈا وہی ہے۔

میں نے گزارش کی کہ پاکستان میں نچلی سطح پر رفاہی اور تعلیمی سرگرمیوں کی بہت زیادہ ضرورت ہے۔ اس سے عام آدمی کو فائدہ ہوگا اور بہت سے غریب افراد اور خاندانوں کے لیے سانس لینا آسان ہو جائے گا، لیکن اس کے ساتھ ہی رفاہی اور تعلیمی سرگرمیوں کی آڑ میں عام مسلمانوں کو ان کے عقیدہ وایمان اور تہذیب وثقافت سے محروم کر دینے کے مقاصد پر نظر رکھنا بھی انتہائی ضروری ہے، اس لیے اگر مغربی ممالک میں مقیم پاکستانی اس سلسلے میں کوئی کام کرنا چاہتے ہیں تو اس کی آسان صورت یہ ہے کہ وہ اپنے اپنے علاقوں میں رفاہی کام کریں اور خود اس کی نگرانی کریں تاکہ نہ تو ان کی رقم غلط جگہ صرف ہو اور نہ ہی ان کی محنت سے بے دینی پھیلانے کا ایجنڈا رکھنے والی این جی اوز فائدہ اٹھا سکیں۔

رفعت لودھی صاحب اور فیض اللہ خان صاحب نے میری باتوں سے اتفاق کیا بلکہ فیض اللہ خان نے، جو لندن کے ایک علاقہ کے منتخب کونسلر ہیں اور ان باتوں کا عملی تجربہ رکھتے ہیں، میرے موقف کی تائید کی۔ ان حضرات سے اس سلسلے میں بہت سے امور پر مشورہ ہوا اور طے پایا کہ وہ دو تین ماہ تک لاہور آئیں گے تو اس ایجنڈے کو آگے بڑھانے کے لیے مزید مشاورت ہوگی اور عملی پروگرام کے لیے پیش رفت کا طریق کار طے ہوگا۔

(روزنامہ اسلام، ۱۲ جون ۲۰۰۶ء)